مجلۂ طیلسانین

حیدرآباد دکن

مطبوعات جامعۂ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

سررشتہ تالیف و ترجمہ کے زیر اہتمام قدیم و جدید

علوم و فنون میں دو سو بہتّر (۲۷۲) اردو کتابیں بشکل

تالیف و تراجم شایع ہو چکی ہیں، ان کے سوا ابھی کتابیں تیار

ہو رہی ہیں۔ فہرست مطبوعات فرمایش پر ارسال ہوتی ہے۔

محمد الیاس برنی

ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ

حالیہ شایع شدہ کتابوں کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ (۱۴۲)
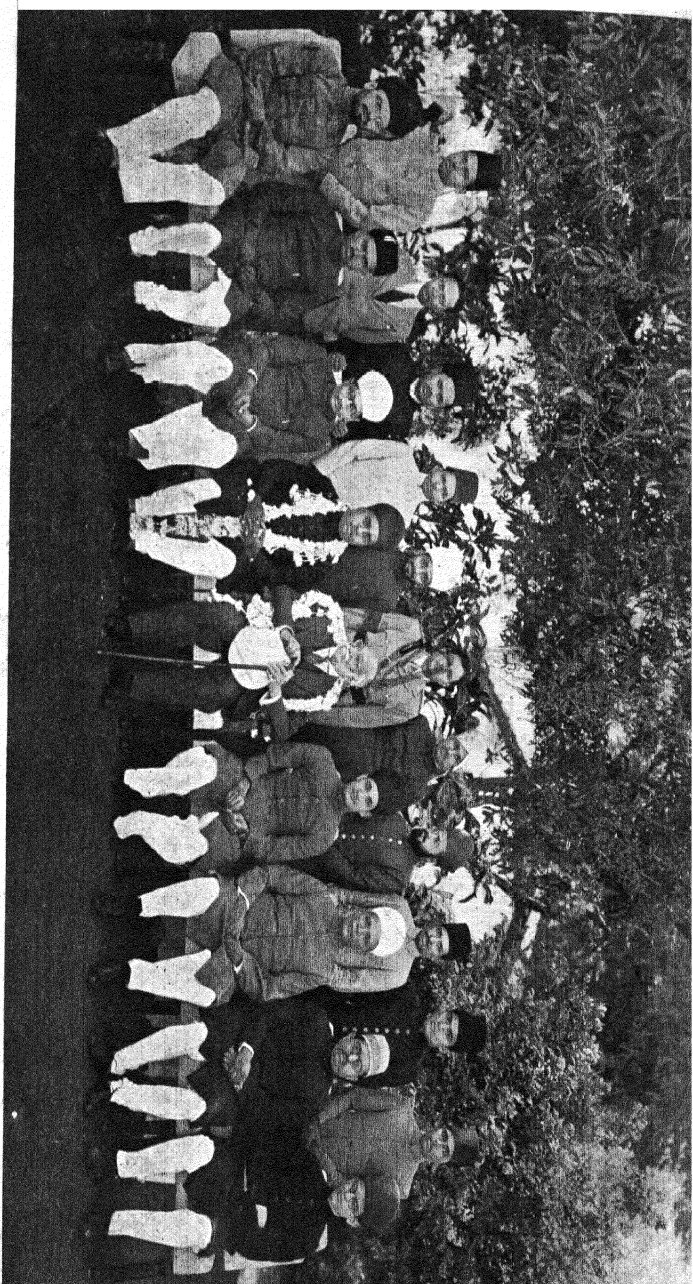
Group Photo Industrial Exhibition 1348 F. Economic Committee Hyderabad.

Sitting—Md. Farooq, Shankerjee, L. N. Gupta, Mir Mahmood Ali, Rt. Hon'able, Sir Akbar Hydari, Dr. Raziuddin Siddiqi, Mehirali Fazil, Premjee, Sharfuddin.
Standing—Md. Ali Khan, Vazir Ali Khan, Shahabuddin Yadullahi, Salameen Bin Omar, Gulam Dastagir Rasheed, Capt K. Syeed, Md. Adul Rahim K. Hameed Ahmed, Md. Ali, Abul Khair Siddiqi, Aleemullah Qadri.

جلد سوم
سنہ ۱۹۳۹ء

شمارۂ اول و دوم
سنہ ۱۳۴۸ ف

مجلۂ طیلسانین

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا علمی و ادبی

سہ ماہی رسالہ

مجلسِ ادارت

مقاصد

۱۔علمی و ادبی مضامین، معیاری نظمیں اور جامعہ عثمانیہ کے ایم اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلیے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات بالاقساط شایع کرنا۔

۲۔اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ شایع کرنا۔

۳۔انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روئداد کی اشاعت۔

۴۔مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقید یں کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

۱۔یہ رسالہ بہمن، اردی بہشت، امرداد، اور آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوگا۔

۲۔رسالے کی ضخامت کم سے کم ایک سو صفحے ہوگی۔

۳۔جواب طلب اُمور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا آنا ضروری ہے۔

۴۔خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

چندہ مجلہ طیلسانئین

خریداران حیدرآباد سے سالانہ عال، فی پرچہ ۸ر

خریداران بیرون حیدرآباد سے سالانہ عال فی پرچہ ۱۲ر ۱۲ر

مع محصول ڈاک

اراکین انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے سالانہ عہ، علاوہ محصول ڈاک

نرخ اشتہارات

مقدار		سال بھر	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عـہ	سے
	اندرونی	معہ	عال
آدھا صفحہ	سرورق	صہ	عصہ ۸ر
	اندرونی	سے ۱۲ر	عصہ ۲ر
پاؤ صفحہ		عال	۱۰ر
فی سطر		۸ر	۳ر

فہرست مضامین

۷۸۶

اداریہ

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو (غالب) عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

نام خدا، یہ مجلۂ طیلسانئین کی تیسری جلد کی پہلی اشاعت ہے۔ مالی مشکل اس کی بروقت اشاعت کے لیے ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوئی۔ آس یاس سے بدلنے لگی تھی کہ مرکزی انجمن طیلسانئین نے بروقت دستگیری کی۔ اسے اب مجلسِ علمیہ سے براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا ہے۔ کچھ مالی امداد کی اپیل کی جا رہی ہے۔ مختلف ذیلی کمیٹیوں مثلاً عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی وغیرہ نے بھی اب مجلۂ طیلسانئین کو اپنی زبان اور اپنا ترجمان خیال کیا ہے۔ کم و بیش حسب استطاعت اس کی امداد پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ جہاں اتحاد و تعاون کی یہ روش جاری رہی تو کیا عجب ہے کہ آپ کا یہ مجلہ شایانِ شان درجہ اور عزت حاصل کر لے۔

فرائضِ ادارت کی نگرانی اور اہتمام و انتظام کا نظام بھی بدل گیا ہے۔ یہ فالِ نیک ہے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب بی اے (عثمانیہ) جیسے فرض شناس رکن مجلہ کی اشاعت کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

اس مجلہ کو پروان چڑھانے کے لیے یہ کافی نہیں کہ اہتمام اور انتظام میں کچھ تبدیلی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ارکانِ انجمن پوری خوش دلی کے ساتھ اس کے خریدار ہوں، اس کے لیے مضامین لکھیں، اس کو اپنے ذہنی اور اجتماعی ارتقا کا مظہر جانیں۔

آجکل اجتماعی اداروں کی مسابقت اور ترقی میں "ترجمان" کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا احساس
چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم کو سب سے زیادہ ہوتا لیکن یہاں اس کی کمی ہے ہمارے طیلسانی بھائی جلد یہ سمجھ لیں کہ کامیابی کی
اولین شرط یہ ہے کہ ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

معاشی کمیٹی کو قایم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن وہ سکون اور سکوت کا شکار تھی پچھلے سال طیلسانی کانفرنس کے
موقعے پر یہ سکون اور سکوت جہد اور جہاد سے بدل گیا صنعتی نمائش کی کامیابی اور اس کے اثرات نمود و نمایش، کی،
منزل سے بہت آگے بڑھ گئے اس کی دلچسپ اور سبق آموز داستان عدم گنجایش کے باعث مختصر طور پر اس اشاعت میں
شامل کی گئی ہے اس کامیابی نے معاشی کمیٹی کے کارکنوں کے حوصلے بڑھا دیے اور ارادے بلند کر دیے۔ وہ اس وقت
"عمل پیہم" کی مختلف منزلوں سے گذر رہے ہیں پہلا کام نوٹ ڈائرکٹری کا درپیش ہے جہاں تک ہمیں علم ہوتا جاتا ہے
حسنِ صنعت اور عزم سبقت دونوں کی اس باب میں کارفرمائی جاری ہے کیا عجب ہے کہ برکت اور نصرت ہمکنار ہو۔
اپنے اور بیگانے سب مبارکباد کے بعد ان کے آیندہ رفتار قدم پر آنکھیں لگائے ہوئے ہیں اگلے سال کی نمایش کا
مرحلہ پھر درپیش ہے۔

اس سلسلے میں اولین فرض یہ ہے کہ مختلف کالجوں کے معاشیات کے طالب علم معاشی کمیٹی کے رکن بلا تاخیر بن جائیں۔
کارکن اس طرف توجہ کریں ملک کے دیگر تعلیم یافتہ حضرات اور معاشی فلاح و بہبود کے خواہاں جلد اس سے اپنا باقاعدہ
ربط قایم کریں، تاکہ یہ ملک کا بہترین معاشی ادارہ بن جائے۔ صرف باہر رہ کر طنز اور تعریض تن آسانی کی علامت ہے۔
یوں تو تجاویز کی بڑی لمبی چوڑی فہرست سپرد قلم کی جا سکتی ہے لیکن کام کی پہلی بات ادارہ کی وسعت اور اس کا استحکام ہے۔

ہمیں صاحب استطاعت اُمراء اور ارکانِ دولت سے بھی قومی امید ہے کہ وہ معاشی کمیٹی کے فرایض میں
پورے طور پر ہاتھ بٹائیں گے۔

پچھلے افکار اور گفتار کا غازی، شعر و ادب کا اقبال ہم سے رخصت ہوا یہ زخم ابھی ہرا ہی تھا کہ اپنے عہد کا
مجاہد اعظم، کردار کا غازی مصطفےٰ کمال بھی ہم سے جدا ہوا غازی مرحوم کی ذات دُنیا کی ہر مغلوب محکوم اور محروم قوم کے لیے
جوشِ عمل کا ایک سبق اور امید کی ایک شمع فروزاں تھی ایک بے سہارا بے محافظ یتیم لڑکا اپنی زخم خوردہ بیوہ ماں کی دُعا

اور اپنی انتھک دلیرانہ جد و جہد سے کس طرح ٹرکی کے مرد بیمار کا مسیحا اور محافظ بن گیا، یہ ایک حیرت انگیز اور عبرت خیز کردار ہے۔ سچ ہے کہ محبت اور عزت انسان کو کتنا قوی کرتی ہے۔ قوت اور نصرت ہم معنٰے ہیں ؎

بے جُراتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

انجمن طیلسانئین کا نیا اقدام جماعت ''اتحاد و ترقی'' ہے، یہ نام ٹرکی کی مشہور قومی جماعت کے نام پر ہے۔ دیکھئے کہ اس کے اس نام اور اس کے کام میں کس قدر مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے مشترکہ سیاسی اور تمدنی مقاصد کے لیے متحدہ سعی کی جائے۔ فرقہ پرستی کا کوئی مفروضہ اور مسلّمہ امر یہاں جگہ نہ پائے۔ فکر اور عمل کی صحت یہاں معیار بنے۔ یہ موجودہ پیچیدہ حالات میں جنم لے رہی ہے۔ تیزی سے تعمیر اور ترکیب کی ابتدائی منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ اگر اس وقت خرابی کی کوئی صورت مضمر رہ گئی تو آگے بڑی الجھنیں پڑیں گی۔ دیکھیں کہ نظر بلند اور دل ہوشیار کس طرح کام کرتے ہیں۔

وہ سارے احباب جنھوں نے مجلہ کی اشاعت میں درہم، قدم اور قلم سے مدد فرمائی ہے ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

''س''

پیامِ توحید

توحید کا پیغام ہر اک شان میں آیا
توریت میں، انجیل میں، قرآن میں آیا

غنچے کے تبسم میں کبھی رنگِ شفق میں
وہ نور کبھی گوہرِ عمّان میں آیا

دھرتی کے سپوتوں کی وہی کرتا ہے رکھشا
بن باسیوں کے دکھ بھرے رومان میں آیا

پورب ہو کہ پچھم وہی ان داتا ہے سب کا
ہر صاحبِ مذہب کے یہ ایمان میں آیا

شاید نظر آجائے تجھے دیدۂ باطن!
پرماتما ہر جان، ہر انسان میں آیا

گہہ نخل پہ، گہہ طور پہ گہہ عرشِ بریں پر
قدرت کا وہ نقاش عجب آن میں آیا

خورشید ہو، مہتاب ہو، یا قطرۂ نیساں
ہر ایک ذکی اس کی ضیا سے ہے درخشاں

محمد عبدالسلام ذکی

اقبال کی دعائیں

اقبال کے کلام کا بہت بڑا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں راست خدائے تعالیٰ سے خطاب ہے۔ ذاتِ باری سے مخاطب ہونے کا انھوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا ہے اور اس کو اس قدر مختلف پیرایوں میں باندھا ہے کہ اس کا جواب کسی دوسرے شاعر یا مصنف کے کلام میں نہیں ملتا، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعا کو انھوں نے ایک آرٹ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

اکثر موقعوں پر انسان بے اختیار خدا کو یاد کرتا ہے، اور اسی لیے ہر شخص چاہے وہ دُنیا دار ہو، یا دین دار، ہر وقت دعائیں کیا کرتا ہے۔ بعض لوگ اس دُنیا میں اپنی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے دعا مانگتے ہیں اور بعض آیندہ دُنیا میں اپنی نجات کے لیے سر بہ سجدہ ہوتے ہیں۔

اقبال پر عشقِ الٰہی کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ وہ جدھر جاتے ہیں اُدھر اسی کی نشانی دیکھتے ہیں اور انھیں ہر راستہ خدا کی طرف ہی لے جاتا ہے:-

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو بُرد

عشقِ الٰہی میں وہ اس قدر محو ہیں کہ ہر وقت اور ہر لمحہ اس کے ذکر میں منہمک رہتے ہیں چاہے وہ خدا کو حاضر سمجھ کر خطاب کریں یا غائبانہ اس کے ذکر میں مشغول رہیں۔ خدائے تعالیٰ سے اپنی بہبودی اور نجات کے لیے دعا مانگنا ایک فطری چیز ہے لیکن اقبال کی عظمت اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کثرت کے ساتھ خدا کو مخاطب کرنے کے انھوں نے کبھی نہ تو اس دُنیا میں اپنی بھلائی کے لیے دعا کی ہے اور نہ آخرت میں اپنی نجات کے لیے۔ وہ دعا کرتے ہیں تو اپنی قوم کی فلاح کے لیے، یا اس لیے کہ ان کے کلام میں ایسی تاثیر ہو کہ جس سے وہ اُمتِ مرحوم کو زندہ کر سکیں۔

چنانچہ "ارمغان حجاز" میں وہ حضورِ حق میں ایک رباعی عرض کرتے ہیں :۔

نخواہم ایں جہان و آں جہاں را　　مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش　　بوجد آرم زمین و آسماں را

وہ صرف حمد و ثنا پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک وضعدار عاشق کی طرح شوخیاں اور ناز و نیاز بھی کرتے ہیں، کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ نہ صرف انسان خدا کا عاشق ہے بلکہ خود خدا بھی انسان کا عاشق اور انسان کی تلاش میں ہے۔ خدا سے وہ کبھی سوال و جواب کرتے ہیں اور کبھی آدم یا ابلیس یا لینن وغیرہ کی زبانی شکر و شکایت سُناتے ہیں۔ وہ خدا کی درگاہ میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں لیکن اپنی ذات کا خیال یہاں بھی انھیں نہیں آتا۔

نماز ہو یا روزہ، حج ہو یا کسی اور قسم کی عبادت ان میں خدا کی طرف دھیان لگانے اور اس کو یاد کرنے کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ وہ عبادت ہی کیا جو محض ایک ضابطہ کی پابندی کے لیے کی جائے اور جس میں حضورِ قلب حاصل نہ ہو، چنانچہ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے :۔

نمازِ بے حضور از من نمی آید نمی آید　　دلے آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ می خواہی

اسی طرح لکھتے ہیں :۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام　　میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عبادت کے اسی فلسفے کو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں اپنے لکچروں میں بیان کیا ہے جو تشکیل الٰہیات اسلامیہ پر دیے تھے اور شاعرانہ انداز میں اس دعا میں کہا ہے جو مسجد قرطبہ میں لکھی گئی تھی :۔

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو　　میری نواؤں میں ہے خون جگر کا لہو
صحبتِ اہل صفا نور و حضور و سرور　　سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو
راہ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق　　ساتھ میرے رہ گئی ایک مری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر　　میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور　　تجھ سے میرے سینے میں آتشِ اللہ ھو
تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و داغ　　تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو
پاس اگر تو نہیں شہر ہیں ویراں تمام　　تو ہے تو آباد ہیں اُجڑے ہوئے کاخ و کو

پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں | ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشمِ کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر | جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ | اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا | حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

اس دعا کا آخری شعر قابلِ غور ہے۔ اس میں اقبال نے فلسفہ اور شعر دونوں کی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ وہ آرزوئیں اور تمنائیں جو روبرو بیان نہیں کی جاسکتیں فلسفہ اور شاعری کے پیرایہ میں بیان کی جاتی ہیں۔

بعض ظاہر پرست زاہدوں کو یہ شکایت تھی کہ اقبال پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھا کرتے لیکن انھوں نے نہیں دیکھا کہ اقبال کا دل ہر وقت خدا در سول کی یاد سے لبریز ہے اور اس کے سوا ان کے دل میں کوئی دوسرا خیال نہیں، چنانچہ مسجد قرطبہ میں کھڑے رہ کر وہ اعلان کرتے ہیں کہ:۔

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق | دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لَے میں ہے شوق مری نَے میں ہے | نغمۂ اللّٰہ ھو مرے رگ و پے میں ہے

غرض کہ اقبال کا پورا کلام کسی نہ کسی پیرایہ میں خدا کی ہستی کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن اس مضمون میں ہم صرف ان اشعار پر بحث کریں گے جن میں انھوں نے خدا سے راست خطاب کیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ہم ان اشعار کو لیتے ہیں جن میں عارفانہ انداز سے خدا کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جب جرمنی میں اقبال نے فلسفۂ عجم پر اپنا مقالہ لکھا تھا تو ان دنوں میں اور اس کے بعد بھی صوفیانہ شاعری کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا، اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کے کلام پر اس کا معتد بہ اثر ہوتا اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ صوفیانہ شاعری بھی اقبال کے پاس آکر ان کے اپنے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور اس کا رنگ قدیم صوفیا کے رنگ سے مختلف ہے۔ اس فرق کو ایک جملہ میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ اقبال کے صوفیانہ اشعار سے بھی بجائے موت کے حیات کے آثار نمودار ہیں۔

وہ خدا کی تلاش میں پھرتے ہیں تو اس مطلب کو یوں ادا کرتے ہیں:۔

تو بروے بے نوائے در آں جہاں کشادی | کہ ہنوز آرزویش نہ دمیدہ در ضمیرے
بہ نگاہ نارسایم چہ بہار جلوہ دادی | کہ بباغ و راغ نالم چو تدرو نو صفیرے

چہ شود اگر خرامی بسرائے کاروانے | کہ متاع نارِ دانش دلکے است پارہ پارہ

دل زندۂ کہ دادی بحجاب در نسازد　　نگہے بدہ بیند شررے بسنگ خارہ

وہ جب اس کو ایک نگاہ دیکھ لیتے ہیں تو تلاش میں نکل جاتے ہیں لیکن دنیا اور آخرت میں جہاں کہیں وہ ڈھونڈتے ہیں انھیں انسان ہی کا پتا ملتا ہے خدا کا نشان نہیں ملتا :۔

اے منِ از فیضِ تو پائندہ نشانِ تو کجاست　　ایں دو گیتی اثرِ ماست جہانِ تو کجاست

اس پر بھی جستجو کی لذت انھیں آوارہ رکھتی ہے بلکہ وہ تو زندگی کا مقصد بھی اسی جستجو کو سمجھتے ہیں :۔

سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوئے تو　　راہ چو مار می گزد گر نروم بسوئے تو

من بتلاشِ تو روم یا بتلاشِ خود روم　　عقل و دل و نظر ہمہ گمشدگانِ کوئے تو

اس تلاش و جستجو میں بھی خدا کا خیال ان کے دل سے جدا نہیں ہوتا اس کے باوجود جب وہ دیدار سے محروم رہتے ہیں تو شکایت کرتے ہیں کہ :۔

چند بروئے خود کشی پردۂ صبح و شام را　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

کبھی وہ خدا سے التجا کرتے ہیں اور اس کو اپنی حالت اور اپنے کارنامے سناتے ہیں :۔

اشک چکیدہ ام ببیں ہم بہ نگاہِ خود نگر　　ریز بہ نیستانِ من برق و شرار ایں چنیں

بادِ بہار را بگو پے بخیالِ من برد　　وادی و دشت را دہد نقش و نگار ایں چنیں

زادۂ باغ و راغ را از نفسم طراوتے　　در چمن تو زیستم با گل و خار ایں چنیں

عالمِ آب و خاک را بر محک دلم بسائے　　روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

دل بہ کسے نباختہ با دو جہاں نساختہ　　من بحضورِ تو رسم روزِ شمار ایں چنیں

جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کا جلوہ ان کی نگاہوں کے ذریعے ان کے دل میں داخل ہو گیا ہے تو پھر ان کو اپنے دل میں اجالا نظر آتا ہے :۔

شبِ من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی　　تو بہ طلعت آفتابی سزد ایں کہ بے حجابی

تو بدرومن رسیدی بضمیرم آرمیدی　　ز نگاہِ من رمیدی بچنیں گراں رکابی

تو عیار کم عیاراں، تو قرارِ بے قراراں　　تو دوائے دل نگاراں، مگر ایں کہ دیر یابی

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم　　بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

الملک للّٰہ کی تشریح کرتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کی ملکیت ہے :۔

مرغِ خوش لہجہ و شاہینِ شکاری از تست　　زندگی را روشِ نوری و ناری از تست

ہمہ افکارِ من از تست چہ در دل چہ بلب — گہر از بحر بر آری نہ بر آری از تست
من ہمان مشتِ غبارم کہ بجائے نرسد — لالہ از تست و نمِ ابرِ بہاری از تست
نقش پرداز توئی ما قلم افشانیم — حاضر آرائی و آئندہ نگاری از تست

ہمہ اوست کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مُراد پا گئے — عقلِ غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

ذیل کے اشعار میں انھوں نے ساقیِ ازل کو خطاب کیا ہے:۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی — ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی — شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے — علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات — ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

خدا کا نور جب اُن کے سینے میں جلوہ گر ہو جاتا ہے تو وہ اس کی روشنی میں ایک نئی زمین اور نیا آسمان بناتے ہیں:۔

اے خدائے مہر و مہ خاکِ پریشانے نگر — ذرۂ در خود فرو پیچد بیابانے نگر
حُسنِ بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گرفت — آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر
بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را — آتشِ خود را باغوشِ نیستانے نگر
شوید از دامانِ ہستی داغہائے کہنہ را — سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے — ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

عشقِ نبیؐ میں وہ اس قدر ڈوب گئے تھے کہ قیامت کے دن خواجۂ دو عالمؐ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب

لیا جانا بھی پسند نہیں کرتے کہ کہیں حضورؐ کے سامنے شرمندگی نہ ہو، اس لیے خدا سے التجا کرتے ہیں کہ محشر میں ان کا حساب نبی کریمؐ سے پوشیدہ طور پر لیا جائے:۔

به پایاں چوں رسد ایں عالم پیر | شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ ما را | حساب من ز چشم او نہاں گیر

حبِ نبیؐ کی انتہائی کیفیت "ارمغانِ حجاز" کی اس بے مثال رباعی میں بیان کرتے ہیں جس میں وہ حجاز کا روحانی سفر کرتے ہیں اور خدا سے کہتے ہیں کہ تو نہیں کعبے میں رہ کر اپنے خاص بندوں سے مل لیکن مجھے تو منزلِ دوست کی تمنا ہے اور اس لیے میں مدینہ جا رہا ہوں:۔

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست | سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز | کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

اقبال کا دل دردِ انسانیت سے معمور تھا، اور چونکہ وہ نسلِ انسانی کی نجات اسلام میں دیکھتے اور انسانی مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ مسلمانوں کو سمجھتے تھے اس لیے لازم تھا کہ وہ اپنی قوم کی حالت پر غور کریں چنانچہ متعدد مرتبہ انھوں نے بارگاہ ایزدی اور دربار نبوی میں قوم کا حال بیان کیا ہے مثال کے طور پر ہم یہاں مثنوی "مسافر" سے وہ مناجات درج کرتے ہیں جو انھوں نے شہر غزنی کے ویرانے میں کہی تھی اور جس میں دنیا اور بالخصوص مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شکایت کی ہے:۔

اے خدا، اے نقشبندِ جان و تن | با تو ایں شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا بینم دریں دیرِ کہن | فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
عالم از تقدیرِ تو آمد پدید | یا خدائے دیگرا و را آفرید
ظاہرش صلح و صفا باطن ستیز | اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز
صدق و اخلاص و صفا باقی نماند | آں قدح بشکست و آں ساقی نماند
چشمِ تو بر لالہ رویانِ فرنگ | آدم از افسونِ شاں بے آب و رنگ
ایں مسلماں از پرستاران کیست؟ | در گریبانش یکے ہنگامہ نیست
سینہ اش بے سوز و جانش بے خروش | روح را فیل است و صورا خموش
قلب او را محکم و جانش نژند | در جہاں کالائے او نا ارجمند

در مصافِ زندگانی بے ثبات | دارد اندر آستیں لات و منات
مرگ راچوں کاذاں دانہ ہلاک | آتش اہکم بہا مانندِ خاک
شعلۂ از خاکِ او باز آفریں | آں طلب آں جستجو باز آفریں
باز جذبِ اندروں او را بدہ | آں جنونِ ذوفنوں او را بدہ
شرق راکن از وجودش استوار | صبحِ فردا از گریبانش برآر
بحرِ احمر را بچوبِ او شگاف | از شکوہش لرزہ افگن بہ قاف

وہ دُنیا، اور مسلمانوں کی اس موجودہ روش سے بیزار ہو چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی حالت میں انقلاب ہو:—

یا مسلماں را بدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ | یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں، یا چناں کن یا چنیں
یا برہمن را بفرما نو خداوندے تراش | یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزیں، یا چناں کن یا چنیں
یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک | یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں، یا چناں کن یا چنیں
یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ | می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں، یا چناں کن یا چنیں
فقر بخشی با شکوہِ خسرو پرویز بخش | یا عطا فرما خرد با فطرتِ روح الامیںؑ، یا چناں کن یا چنیں
یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب | یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں، یا چناں کن یا چنیں

مسلمانوں کے لیے خدا سے جو کچھ وہ مانگتے ہیں وہ "بانگ درا" کی اس مشہور دعا میں درج ہے:—

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے | جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے | پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے | دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل | اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر | اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو | وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر | خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا | امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

وہ بارگاہِ ایزدی میں ان خداوندانِ مکتب کی شکایت کرتے ہیں جو شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے رہے ہیں اس کے ردِ عمل کے لیے وہ خود اپنی قوم کے لیے خدا سے التجا کرتے ہیں:-

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جو دعا انھوں نے بالِ جبریلؑ کے ساقی نامے میں کی ہے وہ ایک الہامی کیفیت رکھتی ہے۔ میری رائے میں یہ ساقی نامہ دُنیائے شاعری کے چوٹی کے کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے:-

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنّا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

اُمنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے — لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اقبال دین و دُنیا دونوں کی نعمتوں سے بے نیاز ہیں اور ان چیزوں کے لیے بارگاہِ ایزدی میں دستِ طلب نہیں دراز کرتے حضور باری تعالیٰ میں بھی ان کی نظر اپنی درماندہ قوم اور اس کے آگے نوعِ انسانی پر رہتی ہے اور اس لیے وہ خود اپنی ذات میں اور اپنے کلام میں ایسی صفات طلب کرتے ہیں جن کی مدد سے وہ تمام انسانوں کے کام آ سکیں۔ اس قسم کی دعائیں انھوں نے اپنی مختلف تصنیفوں کی ابتدا میں درج کی ہیں۔ "پیامِ مشرق" میں رباعیوں کے بعد جب افکار کا حصہ شروع ہوتا ہے تو وہ اس طرح دعا کرتے ہیں:۔

اے کہ از خمخانۂ فطرت بجامم ریختی — ز آتشِ صہبائے من بگداز مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز د گرمیٔ فریاد من — شعلۂ بیباک گرداں خاک سینائے مرا
چوں بمیرم از غبارِ من چراغِ لالہ ساز — تازہ کن داغِ مرا سوزاں بصحرائے مرا

زبورِ عجم کی ابتدا اس دعا سے کرتے ہیں:۔

یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشہ را نگرم آں نظر بدہ
ایں بندہ راکہ بانفسِ دیگراں نزیست — یک آہ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ
سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ — جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا — با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ
شاہینِ من بصیدِ پلنگاں گذاشتی — ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
رفتم کہ طائرانِ حرم را کنم شکار — تیرے کہ نافگندہ فتد کارگر بدہ
خاکم بہ نورِ نغمۂ داؤد برفروز — ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

اور آگے چل کر ان کی درخواست یہ ہے:۔

اے کہ زمن فزودۂ گرمیٔ آہ و نالہ را — زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
غنچۂ دل گرفتہ را از نفسم گرہ کشائے — تازہ کن از نسیمِ من داغِ درونِ لالہ را
خواجۂ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش — آں کہ ز جوئے دیگراں پُر نہ کند پیالہ را

پھر کہتے ہیں:-

بضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلہ نوائے — دلِ خاکیاں فروزم دلِ نوریاں گدازم

اقبال ایسے دل سے بیزار ہیں جو اپنے آپ کو کھویا ہوا ہو، جو دوسرے کے دماغ سے سوچتا ہو، جو کم و بیش کی فکر میں لگا ہوا ہو۔ وہ ایسا دل مانگتے ہیں جو اپنی شراب سے آپ مست ہو اور جس میں ساری دنیا سے محبت ہو:-

بدہ آں دل کہ مستی ہائے او از بادۂ خویش است — بگیر ایں دل کہ از خود رفتہ و بیگانہ اندیش است
بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی را فرا گیرد — بگیر ایں دل بگیر ایں دل کہ در بندِ کم و بیش است
مرا اے صید گیر از ترکشِ تقدیر بیروں کش — جگر دوزی چہ می آید ازاں تیرے کہ در کیش است

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے دل میں گمان و ظن اور شک و شبہ کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور یقین سے لبریز ہو جس میں ان کو تقدیرِ عالم روشن تر نظر آسکے:-

ایں دل کہ مرا دادی لبریزِ یقیں بادا — ایں جامِ جہاں بینم روشن تر ازیں بادا
تلخے کہ فرو ریزد گردوں بسفالِ من — در کامِ کہن رندے آں ہم شکریں بادا

"انسان" کے تخیل کو انھوں نے اس قدر بلند کیا ہے اور اس کی عظمت کا احساس ان کو اس قدر ہے کہ جب وہ خدا کی راہ میں نکل جاتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ خدا کو ڈھونڈھتے پھریں، بلکہ وہ خود اپنی تلاش میں محو ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انسان کی ہستی اور اس کی تقدیر ان پر نمایاں ہو جائے:-

درونِ سینۂ ما دیگرے چہ بوالعجبی است — کرا خبر کہ توئی یا کہ دو چار خودیم
کشائے پردہ ز تقدیرِ آدمِ خاکی — کہ ما بہ رہ گزرِ تو در انتظارِ خودیم

ان کی ایک بہت موثر اور روح پرور مناجات وہ ہے جس سے "جاوید نامہ" کا آغاز ہوتا ہے اور جو ان کے سیرِ افلاک کا پیش خیمہ ہے:-

اے ترا تیرے کہ ما را سینہ سفت — حرفِ ادعونی کہ گفت و با کہ گفت؟
روئے تو ایمانِ من قرآنِ من — جلوۂ داری دریغ از جانِ من؟
از زیانِ صد شعاعِ آفتاب — کم نمی گردد متاعِ آفتاب
عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست — جانِ بے تابے کہ من دارم کجاست؟

عمرہا بر خویش می پیچد وجود — تا یکے بے تاب جاں آید فرود

گر نہ رنجی ایں زمینِ شورہ زار — نیست تخم آرزو را سازگار

از درونِ ایں گلِ بے حاصلے — بس غنیمت داں اگر روید دلے

تو ہمی اندر شبستانم گذر — یک زماں بے نوریِ جانم نگر

شعلہ را پرہیز از خاشاک چیست — برق را از برفتادن باک چیست

زیستم تا زیستم اندر فراق — وانما آں سوئے ایں نیلی رواق

بستہ درہا را برویم باز کن — خاک را با قدسیاں ہمراز کن

آتشے در سینۂ من برفروز — عود را بگذار و ہیزم را بسوز

باز آتش بنہ عود مرا — در جہاں آشفتہ کن دودِ مرا

آتشِ پیمانۂ من تیز کن — با تغافل یک نگہ آمیز کن

یا کشا ایں پردۂ اسرار را — یا بگیر ایں جانِ بے دیدار را

نخلِ فکرم ناامید از برگ و بر — یا تبر بفرست یا بادِ سحر

عقل دادی ہم جنونے دہ مرا — رہ بجذب اندرونے دہ مرا

علم در اندیشہ می گیرد مقام — عشق را کاشانہ قلبِ لاینام

علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشاخانۂ افکار نیست

ایں تماشاخانہ سحرِ سامری است — علم بے روح القدس افسونگری است

بے تجلی مردِ دانا رہ نبرد — از لکدکوبِ خیالِ خویش مرد

بے تجلی زندگی رنجوری است — عقل مہجوری و دیں مجبوری است

ایں جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر — ما نظر خواہیم و او گوید خبر

منزلے بخش ایں دلِ آوارہ را — باز دہ با ماہ ایں مہ پارہ را

گرچہ از خاکم تر دید بسر کلام — حرفِ مہجوری نمی گردد تمام

زیرِ گردوں خویش را یابم غریب — زانسوئے گردوں بگو آئی قریب

تا مثالِ مہر و مہ گردد غروب — ایں جہات و ایں شمال و ایں جنوب

از طلسمِ دوش و فردا بگذرم	از مہ و مہر و ثریا بگذرم
تو فروغِ جاوداں ما چوں شرار	یک دو دم داریم و آں ہم مستعار
اینم من جاودانی کن مرا	از زمینی آسمانی کن مرا
ضبط در گفتار و کردارے بدہ	جادۂ پیداست رفتارے بدہ
آنچہ گفتم از جہانے دیگر است	ایں کتاب از آسمانے دیگر است
بحرم و از من کم آشوبی خطاست	آں کہ در قعرم فرو آید کجاست
یک جہاں بر ساحلِ من آرمید	از کراں غیر از رمِ موجم ندید
من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن	دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا	بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

"بالِ جبریل" کی تیسری نظم میں وہ خدائے تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:—

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر	ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں، حُسن بھی ہو حجاب میں	یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو	یا مجھے ہم کنار کر، یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گُہر کی آبرو	میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر
نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو	اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر
باغِ بہشت سے مجھے حُکمِ سفر دیا تھا کیوں	کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل	آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اسی طرح آگے چل کر کہتے ہیں:—

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر	شریکِ زمرۂ "لایحزنون" کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں	مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

"اسرارِ خودی" کے آخر میں انھوں نے بڑے سوز و گداز کے ساتھ دعا کی ہے جس میں اپنی تنہائی کا اظہار کرتے خدا سے اپنے لیے ایک ہمدم مانگا ہے:—

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی	جانِ ما باشی و از ما می رمی

نغمه از فیض تو در عود حیات — موت در راه تو محسود حیات

باز تسکین دل ناشاد شو — باز اندر سینه ها آباد شو

باز از ما خواه ننگ و نام را — پخته تر کن عاشقان خام را

از مقدر شکوه ها داریم ما — نرخ تو بالا و ناداریم ما

از تهی دستان رخ زیبا مپوش — عشق سلمانؓ و بلالؓ ارزاں فروش

چشم بے خواب و دل بے تاب ده — باز ما را فطرت سیماب ده

کوه آتش خیز کن ایں کاه را — ز آتش ما سوز غیر الله را

رشتهٔ وحدت چو قوم از دست داد — صد گره بر روئے کار ما فتاد

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم — ہمدم و بیگانہ از یکدیگریم

باز ایں اوراق را شیرازه کن — باز آئینِ محبت تازه کن

باز ما را بر ہماں خدمت گمار — کار خود با عاشقان خود سپار

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش — قوت ایمانِ ابراہیم بخش

عشق را از شغلِ لا آگاه کن — آشنائے رمزِ الا اللہ کن

منکہ بہر دیگراں سوزم چو شمع — بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع

یارب آں اشکے کہ باشد دلفروز — بیقرار و مضطر و آرام سوز

کارمش در باغ و روید آتشے — از قبائے لالہ شوید آتشے

دل بدوش و دیده بر فردا ستم — در میان انجمن تنہا ستم

ہر کسے از ظن خود شد یار من — از درونِ من نجست اسرار من" (رومی)

در جہاں یارب ندیم من کجاست — نخلِ سینایم کلیم من کجاست

سینۂ عصر من از دل خالی است — می تپد مجنوں کہ محمل خالی است

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست — آه یک پروانۂ من اہل نیست

انتظارِ غمگسارے تا کجا — جستجوئے رازدارے تا کجا

اے ز رویت ماه و انجم مستنیر — آتش خود را ز جانم باز گیر

ایں امانت بازگیر از سینہ ام | خار جوہر برکش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ | عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ

یہاں اقبال نے مختلف چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا بیان کیا ہے اور پھر بعد میں اپنی تنہائی بیان کرتا ہے:۔

موج در بحر است ہم پہلوئے موج | ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است | ماہ تاباں سر بزانوئے شب است
روز پہلوئے شب یلدا زند | خویش را امروز بر فردا زند
ہستیٔ جوئے بجوئے گم شود | موجۂ بادے بہوئے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص | می کند دیوانہ با دیوانہ رقص
گرچہ تو در ذات خود یکتاستی | عالمے از بہر خویش آراستی
من مثالِ لالۂ صحرا ستم | در میانِ محفلے تنہا ستم
خواہم از لطف تو یارے ہمدمے | از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمِ دیوانۂ فرزانۂ | از خیال این و آں بیگانۂ
تا بجان او سپارم ہوئے خویش | باز بینم در دل او روئے خویش
سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش | ہم صنم او را شوم ہم آذرش

لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی بات کو سمجھنے والا کوئی نہیں، جو چنگاری ان کے دل میں پنہاں ہے اس کے لیے کہیں خس و خاشاک میسر نہیں ہوتا تو کہہ اٹھتے ہیں:۔

شرارا ز خاکِ من خیزد کجا ریزم کرا سوزم | غلط کردی کہ در جانم فگندی سوزِ مشتاقی

شاید اسی دل شکنی کے عالم میں انھوں نے اپنی وہ نظم لکھی ہے جو "ایک آرزو" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں درج ہے اور جو اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

دُنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب | کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو

اس نظم کا مقابلہ غالب کی اس مشہور نظم سے کیجیے جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو | ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　　اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب کے اشعار ایک ایسے دل سے نکلے ہیں جو یاس اور نا اُمیدی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا ہے۔ اقبال چونکہ آیۂ "لاتقنطو" پر کامل ایمان رکھتے ہیں اس لیے تاریک اور گہرے بادلوں کے پیچھے بھی ان کو اُمید کی کرن نظر آتی ہے اور دل کے بجھ جانے اور انسانوں کی محفل سے اُکتا جانے کے باوجود وہ بزم قدرت کی رنگینیوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور بے نوحہ خواں مرنے کی تمنا کی بجائے کسی بے سروساماں، اور بھولے بھٹکے مسافر کے کام آنے کی آرزو کرتے ہیں کنج تنہائی میں بھی وہ پناہ لیتے ہیں تو بے فکری کی موت کے لیے نہیں بلکہ خاموشی میں تاروں کو اپنے نالے سنانے کے لیے۔

آخر دم تک اقبال کی یہی دعا تھی کہ ان کے کلام کے اثر سے مُردہ انسان بھی زندہ ہو جائیں اور زمین و آسمان کی قسمت بدل جائے چنانچہ "ارمغان حجاز" کی رباعیوں میں کہتے ہیں:۔

زمن ہنگامۂ دہ ایں جہاں را　　　دگرگوں کن زمین و آسماں را
ز خاکِ ما دگر آدم برانگیز　　　بکش ایں بندۂ سود و زیاں را

عطا کن شور رومی سوز خسرو　　　عطا کن صدق و اخلاص سنائی
چناں با بندگی در ساختم من　　　نگیرم گر مرا بخشی خدائی

جہانِ لست در دست خسے چند　　　کساں او نہ بند ما کسے چند
نیر در در میانِ کارگاہاں　　　کشند خود را بہ عیش کر کسے چند

یکے اندازہ کن سود زیاں را　　　چو جہت جاودانی کن جہاں را
نمی بینی کہ ما خاکی نہادان　　　چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

تو می دانی حیات جاوداں چیست　　　نمی دانی کہ مرگ ناگہاں چیست
ز اوقاتِ تو یک دم کم نہ گردد　　　اگر من جاوداں باشم زیاں چیست

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

بدن وا ماند و جانم در تگ و پوست
سوئے شہرے کہ در بطحا رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

چناں از خود بروں آوردۂ کیست
جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پردۂ کیست

دلِ بے قیدِ من در پیچ و تابیست
نصیبِ من عتابے یا خطابیست
دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد
گناہِ گاہ گاہِ من صوابیست

مئے من از تنک جاماں نگہ دار
شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار
شرار از نیستانے دور تر بہ
بخاصاں بخش از عاماں نگہ دار

ترا از کشمکش اندر طلب نیست
ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست
از آں از لامکاں بگریختم من
کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

نخواہم ایں جہان و آں جہاں را
مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش
بوجد آرم زمین و آسماں را

نگاہِ تو عتاب آلود تا چند | بتانِ حاضر و موجود تا چند
درین بتخانۂ اولادِ براہیم | نمک پروردۂ نمرود تا چند

خدا سے شوخیاں اور ناز و نیاز کرنا، اور حُسنِ ادا سے شکایت کو شکر بنا دینا اقبال کا ایک لازوال کارنامہ ہے جس کا جواب مشرق و مغرب کی شاعری میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی ایک مثال عمر خیام کی اس رباعی میں ملتی ہے جو اس نے اپنے پیالے کے گِر کر ٹوٹ جانے پر کہی تھی :۔

ابریق مئے مرا شکستی ربی | برمن عیش را بہ بستی ربی
برخاک بریختی مئے ناب مرا | من مست نیم ولے تو مستی ربی

لیکن اقبال کے ہاں اس کا کچھ اور ہی عالم ہے جس کی کیفیت چند نمونوں سے کافی طور پر واضح ہو جائے گی۔ اس کی سب سے پہلی اور شاید سب سے زیادہ اہم مثال اس لافانی مسدّس میں ملتی ہے جو "شکوہ" کے نام سے زبان زدِ خاص و عام ہے اور اس میں وہ کہتے ہیں :۔

جراءت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو | شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے | خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں :۔

چُپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال | کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا مُنہ بند
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا | جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

اقبال کی اس شوخی پر جب فرشتوں کو بھی حیرت ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ :۔

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں | شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں
اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے | تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے
عالم کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے | ہاں مگر عجز کے اسرار سے نا محرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو | بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

اس کا جواب اقبال کس لطیف پیرایہ میں دیتے ہیں:۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بے باک

اقبال کی یہ شوخی یا بے باکی ایک ناز ہے جو کبھی کبھی عاشق اپنے محبوب سے کرتے ہیں

اقبال جب اپنے کو کائنات میں اکیلا محسوس کرتے ہیں اور ہمدم کی تلاش میں زمین کے سمندر اور پہاڑ یا آسمان کے چاند اور ستاروں کو مخاطب کرتے ہیں اور ان سے کوئی جواب نہیں پاتے تو خدا کی بارگاہ میں فریاد لیکر آتے ہیں:۔

شدم بہ حضرت یزداں گذشتم از مہ و مہر کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست

جہاں تہی ز دل و مشت خاک من ہمہ دل چمن خوش است و لے در خور نوایم نیست

تبسمے بہ لب او رسید و ہیچ نہ گفت

پھر کہتے ہیں کہ انسان میں سوز و ساز ہے خدا میں نہیں:۔

تب و تاب فطرت ما ز نیاز مندی ما تو خدائے بے نیازی نرسی بسوز و سازم

اسی مضمون کو "ارمغان حجاز" کی رباعیوں میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

ترا ایں کشمکش اندر طلب نیست ترا ایں درد و داغ و تاب و تب نیست

از آں از لامکاں بگریختم من کہ آں جا نالہ ہائے نیم شب نیست

تو می دانی حیات جاوداں چیست نمی دانی کہ مرگ ناگہاں چیست

ز اوقات تو یک دم کم نہ گردد اگر من جاوداں باشم زیاں چیست

خدا سے کہتے ہیں کہ تو خدائی کرتے کرتے تھک گیا ہے تھوڑی دیر میرے سینے میں آرام لے:۔

در سینۂ من دمے بیاسائے از محنت و کلفت خدائی

ایک دوسری نظم میں وہ خدا سے اس طرح خطاب کرتے ہیں کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے نظارہ کے لیے اپنی خودی کھو بیٹھوں تو یہ سودا بہت مہنگا ہے۔ میری خودی تیرے نظارہ سے زیادہ قیمت رکھتی ہے:۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولی نگیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

نگاہِ بے ادب زد در رخنہ ہا در چرخِ مینائی دگر عالم بنا کن گر حجابے درمیاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا — شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی
مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر — ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

ایک اور موقع پر وہ خدا کی بے وفائی کی شکایت کرتے ہیں :-

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی — در بیابانِ جنوں بردی و رسوا ساختی
جرمِ ما از دانۂ تقصیرِ او از سجدۂ — نے بآں بیچارہ می سازی نہ باما ساختی
صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل — یک جہاں و آں ہم از خونِ تمنّا ساختی
طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

آخری شعر میں کہتے ہیں کہ یہ دُنیا ایک کھلونا ہے، خدا کی قدرت کا شایانِ شان نمونہ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ یہ مٹی کا پتلا بنانا خدا کا کام نہیں ہے ایک پختہ تر آدم بنا :-

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار — لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری دُنیا جب تک ہمارے معیار پر پوری نہ اُترے مکمل نہیں ہوسکتی :-

عالمِ آب و خاک را بر محکِ دلم بسائے — روشن و تار خویش را گیر عیار ایں چنیں

کبھی وہ خدا سے کہتے ہیں کہ تو نے یہ کراماً کاتبین جو ہم پر مقرر کر رکھے ہیں اس سے کیا فائدہ۔ تو نے ہمیں اس دُنیا میں اتنی مہلت ہی کہاں دی ہے کہ ہم کچھ گناہ کر سکیں :-

گناہ ما چہ نویسند کاتبانِ عمل — نصیبِ ما ز جہانِ تو جز نگاہے نیست

انسانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس طرح جیو کہ اگر ہماری موت دائم موت ہے تو خدا کو بھی شرم آئے کہ اس نے ایک ایسی بہترین مخلوق کو فنا ہونے دیا :-

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام — خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

وہ کبھی خدا سے اس کے بخل کی شکایت کرتے ہیں :-

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دُنیا اور مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت پر خدا کو اس طرح متنبہ کرتے ہیں :-

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے روشن جہاں تیرا
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

اسی طرح "بالِ جبریل" کی ایک دوسری نظم میں خدا سے فریاد کرتے ہیں :-

اثر کرے نہ کرے، سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد؟

قصور وار، غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال اپنی اور خدا کی دُنیا کا مقابلہ کرتے ہیں :-

تری دُنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دُنیا فغانِ صبح گاہی

تری دُنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دُنیا میں تیری بادشاہی

اسی طرح "ارمغانِ حجاز" میں خدا سے کہتے ہیں کہ تو اپنی جنت کا مقابلہ ہماری اس دُنیا سے کر جس کو ہم نے آراستہ کیا ہے اور دیکھ کہ دونوں میں کون بہتر ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ تو اس دُنیا کو بھی جنت کی طرح جاودانی بنا دے :-

یکے اندازہ کن سود و زیاں را
چو جنت جاودانی کن جہاں را

نمی بینی کہ ما خاکی نہاداں
چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

جب وہ کونین پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ دُنیا و آخرت دونوں ان کو پسند نہیں آتے کیوں کہ :-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

خدائی اور بندگی کا فرق بتلاتے ہیں :-

خدائی اہتمام خشک و تر ہے ۔ خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی! استغفراللہ ۔ یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اگر وہ شکایت کرتے ہیں تو خدا کو بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ اسی نے ان کو یہ تابِ سخن دی ہے:۔

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک ۔ تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی
ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل ۔ کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

ان کا جنون ایسا ہے کہ وہ قیامت کے دن بھی خدا سے نپٹ لے گا:۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا ۔ یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

اپنی اور غیر قوموں کی حالت کا فرق خدا سے بیان کرتے ہیں:۔

یارب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن ۔ کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ ۔ دُنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگ گیاہے نہ دہی اہلِ خرد را ۔ او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں ۔ مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر ۔ تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا ۔ افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

"ضربِ کلیم" میں شکر و شکایت ایک ساتھ کرتے ہیں:۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا ۔ رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے جہاں کو ۔ لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں ۔ مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے ۔ جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

آدم شیطان کے دھوکے میں آتے ہیں تو اقبال کس مدلل پیرایہ میں عذر داری پیش کرتے ہیں:۔

جہاں از خود بروں آوردہ کیست ۔ جمالش جلوۂ بے پردۂ کیست؟
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن ۔ بگو با من کہ او پروردۂ کیست؟

اقبال نے جا بجا سوال و جواب کے پیرایہ میں خدائے تعالیٰ کو انسان کا ہم سخن بنایا ہے بلکہ ان کا تو اعتقاد تھا کہ انسان ہی کیا یہ جھاڑ اور پہاڑ بھی خدا سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تیری ؎ شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

اسی بنا پر جب وہ "شکوہ" اور دوسری نظموں میں اپنی صدائے فریاد بلند کرتے ہیں تو ان کے نالے عرش سے جا کر ٹکراتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے ؎ پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے ؎ خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا

آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پھر نا ممکن تھا کہ یہ فغانِ نیم شبی بے اثر رہ جائے اور اس کا کوئی جواب نہ آئے، چنانچہ آخر کار جو پردے خالق و مخلوق میں حائل تھے وہ اٹھ جاتے ہیں:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر ؎ کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

پھر سب سے پہلے جو آواز ان کے کانوں میں آتی ہے وہ "جوابِ شکوہ" میں درج ہے :-

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا ؎ اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا

آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا ؎ کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حُسنِ ادا سے تو نے

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

"شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" اس صنف میں ان کی فن کاری کے بہترین نمونے ہیں، لیکن اسی قسم کی متعدد مثالیں ان کی دوسری تصنیفوں میں بھی ملتی ہیں، چنانچہ "پیامِ مشرق" میں خدا، اور انسان کا ایک مکالمہ درج کیا ہے جس میں خدا انسان کو ملزم ٹھیراتا ہے کہ تو نے میری دُنیا کو تباہ کر دیا۔ انسان جواب دیتا ہے کہ نہیں میں نے تو تیری دُنیا کو دوزخ سے جنّت بنا دیا، خدا کہتا ہے :-

جہاں را زِ یک آب و گِل آفریدم ؎ تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

من از خاک پر درد ناب آفریدم ؎ تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہالِ چمن را

قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان جواب دیتا ہے :-

تو شب آفریدی، من چراغ آفریدم ؎ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کوہسار و راغ آفریدی ؎ خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

کسی قدر مزاحیانہ انداز میں وہ خدا سے اس وقت مخاطب ہوتے ہیں جب ایک مُلّا کو جنت میں لے جانے کا حکم ملتا ہے :-

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا   حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف   خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول   بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا   اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

خدائے تعالیٰ سے سوال و جواب کی ایک بہترین مثال اقبال نے "جاوید نامہ" میں پیش کی ہے جس میں ان کے سارے فلسفۂ حیات کا نچوڑ موجود ہے۔ افلاک کی سیر کرتے ہوئے اور فردوس بریں سے گزر کر جب وہ حضور باری میں پہنچتے ہیں تو اس کرۂ خاکی کی موجودہ حالت کی طرف توجہ دلاتے ہیں :-

عشقِ جاں را لذتِ دیدار داد   باز بانم جرأتِ گفتار داد

اے دو عالم از تو با نور و نظر   اندکے آں خاکداں را نگر

بندۂ آزاد را نا سازگار   بر دمد از سنبل او نیش خار

از ملوکیت جہانِ تو خراب   تیرہ شب در آستینِ آفتاب

دانشِ افرنگیاں غارت گری   دیرہا خیبر شد از بے حیدری

آنکہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست   فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پے ایں دیر میر   سود خوار و والی و مُلّا و پیر

ایں چنیں عالم کجا شایانِ تست   آب و گل داغ کہ بر دامانِ تست

اس کے جواب میں ذاتِ باری کی طرف سے ندائے جمال آتی ہے جس میں تخلیقِ عالم کی حقیقت بتلائی گئی ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے :-

کلکِ حق از نقش ہائے خوب و زشت   ہر چہ ما را سازگار آمد نوشت

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب   از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب

آفریدن؟ جستجوئے دلبرے   وا نمودن خویش را بر دیگرے

ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود   بے جمالِ ما نیاید در وجود

زندگی ہم فانی و ہم باقی است — این ہمہ خلاقی و مشتاقی است

زندۂ؟ مشتاق شو خلاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو

در شکن آن را کہ ناید سازگار — از ضمیر خود دگر عالم بیار

بندۂ آزاد را آید گراں — زیستن اندر جہانِ دیگراں

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست

از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد — از نخیلِ زندگانی بر نخورد

مردِ حق برندہ چوں شمشیر باش

خود جہانِ خویش را تقدیر باش

اقبال پھر عرض کرتے ہیں کہ جو قوم ایک مرتبہ مُردہ ہو چکی وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتی ہے:۔

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو — جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجو

زندگانی را سرِ تکرار نیست — فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست

زیرِ گردوں رجعت او را ناروا است — چوں ز پا افتاد قومے بر نخاست

ملتے چوں مرد کم خیزد ز قبر

چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر

اس کا جواب دیتے ہوئے باری تعالیٰ کہتا ہے زندگی کا راز وحدتِ افکار و کردار میں پوشیدہ ہے:۔

زندگانی نیست تکرارِ نفس — اصلِ او از حی و قیوم است و بس

فرد از توحید لاہوتی شود — ملت از توحید جبروتی شود

بے تجلّی نیست آدم را ثبات — جلوۂ ما فرد و ملت را حیات

ہر دو از توحید می گیرد کمال — زندگی این را جلال آں را جمال

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ؟ — با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

اہلِ حق را حجت و دعوے یکے ست — خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے ست

ذرّہ ہا از یک نگاہی آفتاب — یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

ملتے چوں می شود توحید مست — قوت و جبروت می آید بدست

روحِ ملّت را وجود از انجمن | روحِ ملّت نیست محتاجِ بدن
مردہ؟ از یک نگاہی زندہ شو | بگذر از بے مرکزی پایندہ شو
وحدتِ افکار و کردار آفریں | تا شود اندر جہاں صاحب نگیں

پھر اقبال حقیقتِ عالم اور انسان کی مجبوری کے متعلق سوال کرتے ہیں :-

من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجاست | درمیانِ ما و تو دوری چراست؛
من چرا در بندِ تقدیرم بگوئے | تو نہ میری من چرا میرم بگوئے!

جواب ملتا ہے کہ مجبوری کا علاج انسان کی خودی میں ہے :-

بودہ اندر جہان چارسو | ہر کہ گنجد اندرو میرد درو
زندگی خواہی خودی را پیش کن | چارسو را غرق اندر خویش کن

باز بینی من کیم تو کیستی
در جہاں چوں مردی و چوں زیستی

آخر میں اقبال مشرق و مغرب کی تقدیر معلوم کرنا چاہتے ہیں :-

یورشِ ایں مردِ ناداں در پذیر | پردہ را از چہرۂ تقدیر گیر
انقلابِ روس و الماں دیدہ ام | شور در جانِ مسلماں دیدہ ام

دیدہ ام تدبیر ہائے غرب و شرق
وا نما تقدیر ہائے غرب و شرق

اس کے جواب میں اقبال نے باری تعالیٰ کا جو پیام منظوم کیا ہے وہ زبان، خیالات اور تغزل کے لحاظ سے فن کاری اور قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے :-

بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو | کہ نیرزد بجوئے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ | ہم بجبریلِ امینے نتواں کرد گرو
زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است | اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو
تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ | آنچناں زی کہ بہر ذرّہ رسانی پرتو
چوں پرِ کاہ کہ در رہ گذر باد افتاد | رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو

اے تنک جامیٔ تو مئے کدہ رسوا گردید
شیشۂ گیر و حکیمانہ بیاشام و برو

حُسن اور خدا کا جو مکالمہ "بانگِ درا" میں درج ہے اس کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے:۔

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا — جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا!
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا — شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

آخر میں ہم اقبال کے اس کلام کا نمونہ پیش کریں گے جس میں ؎

"خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے بعض جگہ تخیل اور شاعرانہ قوت سے کام لے کر اپنے خیالات کو ذاتِ باری تعالیٰ کے روبرو ابلیس، آدم، لینن وغیرہ کی زبانی پیش کیا ہے اور ان میں ایسے ایسے لطیفے پیدا کیے ہیں جو تخلیقی آرٹ کی بہترین مثال ہیں۔

"پیامِ مشرق" کی ایک رباعی میں ایک برہمن خدا پر طعن کرتا ہے کہ بُت آدمی سے زیادہ دیرپا ہیں اور اگر تو نے انسان کو سجدہ کرایا تو میرا بُت کو سجدہ کرنا کیوں جُرم ہے:۔

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت — فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم — صنم از آدمی پایندہ تر بود

خدا جب ابلیس کو حُکم دیتا ہے کہ آدم کو سجدہ کر تو ابلیس کا انکار ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

نُوریٔ ناداں نیم سجدہ بآدم برم — او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات — من بہ دو صرصرم، من بہ نمو تندرم
رابطۂ سالمات، ضابطۂ امہات — سوزم و سازے دہم آتشِ مینا گرم
پیکرِ انجم ز تو، گردشِ انجم ز من — جاں بجہاں اندرم، زندگیٔ مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی، شور بجاں من دہم — تو بہ سکوں رہزنی، من بہ تپش رہبرم
آدمِ خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد — زاد در آغوشِ تو پیر شود در برم

قیامت کے دن آدم حضورِ باری میں عذر داری پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے جنت میں جو قصور کیا تھا وہ ایک مصلحت پر مبنی تھا، اور یہ کہ انسان نے دُنیا کی ساری قوتوں کو مسخر کیا، اور آخر میں اہرمن کو سجدہ کرا کر ہی چھوڑا:۔

اے کہ ز خورشیدِ تو کوکبِ جاں مستنیر	از دلم افروختی شمع جہانِ ضمیر
ریخت ہنرہائے من بحر بیک نائے آب	تیشۂ من آورد از جگر خارہ شیر
زہرہ گرفتارِ من، ماہ پرستارِ من	عقلِ کلاں کارِ من، بہرِ جہاں دار و گیر
من بہ زمیں در شدم، من بہ فلک بر شدم	بستۂ جادوئے من ذرّہ و مہرِ منیر
گرچہ فسونش مرا برد ز راہِ صواب	از غلطم در گذر، عذرِ گناہم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم	جز بکمندِ نیاز، ناز نہ گردد اسیر
تا شود از آہ گرم ایں بتِ سنگیں گداز	بستن زنارِ او بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمن شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

ایک مردِ نکتہ بیں مرنے کے بعد خدا کے پاس فریاد لے آتا ہے کہ ملک الموت کو جان لینے کا فن نہیں آتا اس کو مُلکِ فرنگ روانہ کرتا کہ اس فن کو اچھی طرح سیکھ کر آئے:۔

تفنگش بہ کشتن چناں تیز دست	کہ افرشتۂ مرگ را دم گسست
فرست ایں کُہن ابلہ را در فرنگ	کہ گیرد فنِ کشتن بے درنگ

ابلیس بارگاہِ ایزدی میں نالہ کرتے ہوئے آتا ہے کہ ابنِ آدم کا شکار کرنے میں مجھے کوئی لطف نہیں آتا اور بغیر مزاحمت اور مقابلے کے فتح کرتے کرتے بیزار ہو گیا ہوں، کوئی ایسا مردِ خدا بھیج جو میرا مقابلہ کرے اور مجھے ٹھکرا دے تاکہ اس شکست میں مجھے کچھ مزہ ملے:۔

اے خدا وندِ صواب و ناصواب	من شدم از صحبتِ آدم خراب
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت	چشم از خود بست و خود را در نیافت
خاکش از ذوقِ ابا بیگانۂ	از شرارِ کبریا بیگانۂ
صید خود صیاد را گوید بگیر	الاماں از بندۂ فرماں پذیر

از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست از و آں ہمتِ والائے من — وائے من اے وائے من اے وائے من
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف — تابِ یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریفِ پختہ تر باید مرا
لعبتِ آب و گل از من باز گیر — می نیاید کودکی از مردِ پیر
ابنِ آدم چیست یک مشتِ خس است — مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود — ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
شیشہ را بگداختن عکارے بود — سنگ را بگداختن کارے بود
آں چناں تنگ از فتوحات آمدم — پیشِ تو بہرِ مکافات آمدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم — لرزہ اندازد نگاہش در تنم
آں کہ گوید از حضورِ من برو — آں کہ پیشِ او نیرزم با دو جو

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست

اسی طرح ایک دوسری مرتبہ ابلیس عرضداشت لیے ہوئے آتا ہے کہ خود انسانوں میں بہت سے ابلیس سیاست دانوں کی شکل میں موجود ہیں، اب دنیا میں میری ضرورت باقی نہیں ہے:۔

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے — پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب — دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت — مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی — ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہے غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

حدیثِ دیگراں کے سلسلے میں اعلیٰ ترین مثال وہ ہے جو "بالِ جبریل" میں لینن اور خدا کے مکالمے کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ لینن خدا کے حضور میں عرض کرتا ہے:۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندۂ فلزات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

لینن کی ان شکایتوں کو سن کر خدا، فرشتوں کو بھیجتا ہے کہ وہ دنیا میں جا کر تحقیقات کریں کہ واقعی یہ شکایتیں ؟

[illegible]

صحیح ہیں یا نہیں۔ فرشتے واپس آکر عرض کرتے ہیں :۔

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی ۔۔۔ نقشِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر ۔۔۔ تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست ۔۔۔ بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام ۔۔۔ عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی ۔۔۔ آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

لینن کی شکایتوں کی جب اس طرح تصدیق ہو جاتی ہے تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے :۔

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔۔۔ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ۔۔۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے ۔۔۔ بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے ۔۔۔ میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے ۔۔۔ آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

یہ ہے خدا، اور بندے کا وہ معاملہ جس کو اقبال نے مختلف پہلوؤں سے باندھا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں صرف اس کلام پر بحث کی ہے جس میں دو بدو خدا سے خطاب کیا گیا ہے۔ اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ ان شعروں اور نظموں پر مشتمل ہے جن میں ذات باری تعالیٰ اور اس کی مختلف صفتوں کا صیغۂ غایب میں ذکر ہے۔ اس قسم کا کلام ان کی ابتدائی تصنیفوں کے مقابلے میں آخری تصنیفوں میں زیادہ پایا جاتا ہے اور وحدت کا رنگ آخر میں ان پر اس قدر چڑھ گیا تھا کہ اگر اور چند سال زندہ رہتے تو شاید کلیتہً خدا سے ہی مخاطب رہتے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو احساس تھا کہ انھوں نے جو کچھ کہا اس کے مقابلے میں جو وہ کہنا چاہتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان کی مختصر زندگی اس کے لیے ناکافی ہے اور اس کے علاوہ کوئی ہستی انسانوں میں ایسی نہیں ہے جس سے وہ ان رموز کو کہہ سکیں اور جو ان کی اس امانت کا حامل ہو سکے :۔

رمزِ عشق تو بار باب ہوس نتواں گفت — سخن از تاب و تب شعلہ بخس نتواں گفت
تو مرا ذوقِ بیاں دادی و گفتی کہ بگوے — ہست در سینۂ من آنچہ بکس نتواں گفت
شوق اگر زندۂ جاوید نہ باشد عجب است — کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

رضی الدین صدیقی

انجمن اشاعت اردو کی مطبوعات

فلسفۂ عجم علامہ اقبالؒ کی گراں قدر تصنیف "دی ڈولپمنٹ آف میٹا فزکس" کا ترجمہ
مترجمہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) دوسرا ایڈیشن قیمت (عہ/)

ختم نبوت اور قادیانیت علامہ اقبالؒ کے ایک مقالہ کا ترجمہ۔ مترجمہ میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) قیمت (۳/)

نظم اقبالؒ سفر حیدرآباد دکن اور سر اقبالؒ کے تاثرات ۱۹۱۰ء میں۔ قیمت (۲/)

تین افسانے سر شیخ عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل (لندن) کے تین قابل دید افسانوں کا مجموعہ:-
۱- تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر۔ ۲- وطن آخر وطن۔ ۳- دل ہی تو ہے۔ قیمت (۴/)

بندے ماترم اور اس کا تاریخی پس منظر مرتبہ محمد داور حسین بی اے، ال ال بی (عثمانیہ) قیمت (۲/)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کا ایک مقالہ قیمت (۲/)

مقالاتِ اقبالؒ علامہ اقبالؒ کے مضامین و مقالات کا مجموعہ (۲۵۰) صفحات۔ قیمت (عہ/)

ملنے کا پتا

احمدیہ پریس چارمینار

(حیدرآباد دکن)

مونادانی تصوّریت

فلاطون اور برکلے کی تصوریت کے سوا ایک اور قسم کی تصوّریت ہے جس کو جرمن فیلسوف "لائبنز" (گاٹفریڈ ولہلم نان) (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) نے پیش کی ہے۔ فلاطون نے ذہن کو کائنات میں سب سے زیادہ اہم حقیقت قرار دیا تھا، ذہن معانی یا اقدار پر مشتمل تھا، اس کی تصوّریت کو "نصب العینوں کی تصوّریت" (Idealism of Ideals) کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ اقدار نصب العین قرار دیے گئے تھے۔ برکلے کی تصوّریت "تصوّریت تصورات" کہلاتی ہے (Idealism of Ideas) جس کی رو سے کائنات اذہان اور اس کے تصوّرات پر مشتمل قرار دی گئی ہے۔ لائبنز کی تصوّریت کی رو سے کائنات لاتعداد "مونادات" یا "مرکز قوۃ" پر مشتمل ہے، یہ مونادات روح جیسے جوہر ہیں، جن پر موناد برتر، خدا، کی حکمرانی ہے۔ لائبنز کے نظریۂ تصوّریت کو "مونادیت" (Monadism) کہا جاتا ہے۔ طلبا کو لائبنز کی مندرجۂ ذیل کتابیں پڑھنی چاہیئے:- (۱) The Discourse on Metaphysics (۲) Letters to Arnauld

(۳) Monadology (۴) The New System

پہلی دو کتابیں ایک ہی جلد میں مل جائیں گی جس کی اشاعت "اوپن کورٹ کمپنی" نے کی ہے۔ ہم یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ مونادانی تصوریت کی توضیح کرتے ہیں۔

فلسفۂ جدید کے موسس ڈیکارٹ کی طرح لائبنز بھی تسلیم کرتا ہے کہ میرا اور دوسری ارواح یا نفوس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں غیر روحانی یا مادّی موجودات کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ہم جنھیں اشیاء مادّی کہتے ہیں وہ ذہن سے خارج میں مستقل اور غیر محتاج طریقے پر پائی جاتی ہیں، یہ اپنے وجود میں ذہن کی محتاج نہیں (برعکس برکلے) لیکن جب ہم ان خارجی مادّی اشیاء کی حقیقی ماہیت دریافت کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل ذہنی یا روحانی ہیں۔ اس طرح کائنات میں ایک ہی قسم کی حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ

روحانی یا ذہنی ہے۔ کائنات بے شمار ارواح (مونادات) کی ایک جماعت پر مشتمل ہے (روحانی کثرتیت)۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لائبنز غیر روحانی یا جسمانی یا مادّی حقایق کے وجود کے انکار میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔

لائبنز کے پیشرو، وجود مادّہ کے قائل فلسفی، ڈیکارٹ و ہابس نے مادّے کے حقیقی صفات امتداد اور حرکت قرار دیے تھے۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ برکلے نے ان صفات کو ذہنی ثابت کیا تھا۔ اب لائبنز یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہے کہ امتداد اور حرکت کو انتہائی حقیقت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ ایک قوت کے اظہارات ہیں اور یہ قوت اپنی ماہیت کے لحاظ سے روحانی ہے۔

لائبنز کہتا ہے کہ امتداد لامتناہی طور پر قابل تقسیم ہے، یعنے اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی تجریداً مزید حصص میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اب لائبنز کا یہ دعوےٰ ہے کہ جو شئے اپنی ماہیت کے لحاظ سے لامتناہی طور پر قابل تقسیم ہو وہ کبھی انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ بہ الفاظ دیگر 'انتہائی حقیقت' سے مراد ناقابلِ تحویل حقیقت ہے لہٰذا جو شئے غیر محدود طور پر قابلِ تقسیم ہے وہ انتہائی نہیں ہو سکتی۔

اب رہی 'حرکت' اس کے متعلق بات اور صاف ہے کہ یہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ لائبنز کہتا ہے کہ:-

> "اگر ہم حرکت کے ٹھیک رسمی معنے لیں یعنے تغیّر مقامی کے معنے میں اس کو سمجھیں تو وہ کوئی حقیقی شئے باقی نہیں رہتی، اور جب کئی اجسام مقابلتاً اپنا مقام بدلتے ہیں تو پھر اجسام ہی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس امر کا تعیّن کرنا ممکن نہیں کہ ان میں سے کس کے ساتھ حرکت یا سکون کو منتصف کیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ جو شئے ہمیشہ کسی دوسری شئے کے ساتھ اضافت رکھتی ہو وہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔ حرکت تغیّر مقامی کے معنے میں ایک اضافی شئے ہے لہٰذا وہ انتہائی حقیقت نہیں ہو سکتی۔

جب امتداد و حرکت انتہائی حقایق نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ غیر روحانی یا جسمانی اشیا جن کی ماہیت امتداد و حرکت قرار دی جاتی ہیں انتہائی حقایق نہیں ہو سکتیں۔ اب لائبنز کا خیال ہے کہ ان اشیا کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرکی حقایق ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، ان کا مبدء قوۃ ہے۔ ڈیکارٹ کی یہ تعلیم تھی کہ حرکت کی مقدار معیّن ہے؛ لیکن مشاہدہ شاہد ہے کہ اجسام حرکت بھی کرتے ہیں اور ساکن بھی ہوتے ہیں: اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت پیدا بھی ہوتی ہے اور فنا بھی ہوتی ہے اور یہ قانونِ تسلسل کے خلاف ہے۔ ایسی چیز ضرور ہونی چاہیئے جو

حرکت کے موقوف ہونے پر باقی رہے، جو حرکت کا مبدء ہو اور یہ قوت ہے اور قوت اپنی کمیت یا مقدار میں مستقل و متعین ہوتی ہے۔

اس طرح حرکت و امتداد کو ایک تحتی قوۃ کے ظواہر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے کائنات روحانی حقایق اور غیر روحانی ممتد و متحرک حقایق پر مشتمل نہ ہوگی بلکہ روحانی حقایق اور غیر روحانی قوتوں پر۔ اب سوال یہ ہے کہ قوت کی کیا ماہیت ہے؟ لائبنز کہتا ہے کہ باطنی تجربے سے ہمیں صرف ایک ہی حقیقی فعّال قوۃ کا علم ہوتا ہے جو ہماری روح ہے۔ کسی شئے کا قوت میں تصوّر کرنا اس کو کسی معنے میں ہماری اپنی ارادہ رکھنے والی عمل و کوشش کرنے والی ذات کی طرح سمجھنا ہے۔ لائبنز کہتا ہے کہ اس یقین سے کہ حقیقی اکائیوں کی ماہیت قوت پر مشتمل ہے" یہ لازم آتا ہے کہ ہم ان کا وہی تصوّر کریں جو ہمیں اپنی روح کا حاصل ہے۔"

خلاصہ یہ کہ لائبنز کا فلسفیانہ غور و فکر اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ غیر روحانی یا مادّی یا جسمانی حقایق کی اگر آخری تحلیل کی جائے تو وہ روحانی ثابت ہوتی ہیں۔ اس نتیجے کی بنیاد اس دلیل پر۔ تاہم ہے کہ مادّی یا جسمانی حقیقت کا تصوّر یا تو بہ حیثیت ایک ممتد و متحرک شئے کے کیا جانا چاہیئے (جیسا کہ ڈیکارٹ و ہابس نے کیا تھا) یا بہ حیثیت قوت کے لیکن چونکہ امتداد لامتناہی طور پر قابلِ تقسیم ہے اور حرکت ہمیشہ اضافی، لہذا ان کو انتہائی حقیقت نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ امتداد و حرکت کو قوت کے اظہارات یا مظاہر تصوّر کیا جانا چاہیئے اور قوت کا تصوّر روح کے سوا اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ لہذا ساری کائنات روحانی حقایق پر مشتمل ہے۔ لائبنز روح جیسے جوہر، کو موناد کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موناد کی اصطلاح اس نے فان ہلمنٹ سے لی ہے۔

لائبنز کی تعلیم کا پہلا حصہ تو یہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا کہ انتہائی حقیقت روحانی ہے۔ اس کی تعلیم کا دوسرا حصہ جس کا وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کرتا بلکہ محض تسلیم کر لیتا ہے یہ ہے کہ کائنات کثرت پر مشتمل ہے، یعنے انتہائی حقیقت جو روحانی ماہیت رکھتی ہے کثیر مونادات پر مشتمل ہے جو ارواح کے مانند جوہر ہیں۔ اپنی فلسفیانہ تعلیم کے دوسرے حصے کے لیے لائبنز کسی ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ اس کو ایک بدیہی چیز خیال کرتا ہے۔

لائبنز موناد یا 'روح جیسی حقیقت' کی چار اہم قسمیں قرار دیتا ہے:۔

(۱) موناد برترین، یعنے خدا

(۲) ارواحِ عقلیہ (Spirits)

(۳) حساس و غیر عقلی مونادات (Souls)

(۴) سادہ موناداتؔ، یعنے اجسام عضویہ وغیر عضوی اجسام (Bodies)[1] . . . .

موناد برترین یا خدا سے لائبنز کی وہی مراد ہے جو ڈیکارٹ نے لی تھی، یعنے ایک ایسی ذات جو لامحدود اور کامل و اکمل ہے، جو قادرِ مطلق حکیمِ مطلق و خیرِ مطلق ہے خدا کے وجود کے دلائل جو لائبنز پیش کرتا ڈیکارٹ کے دلائل سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ خدا کے کامل ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی خلق کردہ دُنیا بھی بہترین دُنیا ہے۔ لائبنز مغربی فلسفے میں رجائیت کے ایک عظیم الشان نظام[2] کا بانی ہے اس کے نزدیک ہماری دُنیا سب سے بہتر دُنیا ہے جہاں شر سے زیادہ خیر اور غم سے زیادہ راحت ہے۔

تمام محدود موناداتؔ خدا کے محتاج ہیں جو ان کا خالق ہے تخلیق کی مثال صاف طور پر پیدایش افکار سے دی گئی ہے۔ خدا سے محدود موناداتؔ کا صدور "ایک طرح کا اشراق ہے"۔ خدا ان کو اسی طرح پیدا کرتا ہے "جس طرح ہم افکار کو پیدا کرتے ہیں"۔ "کائنات میں افراد کی اس لیے کثرت ہے کہ خدا کائنات کے تمام پہلوؤں کا تمام ممکنہ طریقوں سے ملاحظہ کرتا ہے اور کائنات کے ہر منظر کے نتیجے کے طور پر جو ایک مختلف مقام سے حاصل ہوتا ہے ایک جوہر پیدا ہوتا ہے"۔[3]

"ہر موناد نقال ہے"، جو ہر وہ نہیں جو اپنی ذات سے قایم ہو (جیسا کہ اسپینوزا نے کہا تھا) بلکہ جوہر وہ ہے جو اپنی ذات سے فاعل ہو یا جو اپنے متغیر حالات کا مبدء اپنی ہی ذات میں رکھتا ہو" جوہر وہ ہستی ہے جو فعلیت کے قابل ہے"۔ فعلیت دو وجود کے ایک کر دینے سے انفرادی اشیا میں پھر جوہریت پیدا ہو گئی جس کو اسپینوزا نے (جوہر کی قایم بالذات شئے تعریف کرکے) ان سے چھین لیا تھا۔ اپنی باطنی فعلیت کی وجہ سے ہر موجود شئے ایک متعین فرد قرار پاتی ہے جو ہر دوسری شئے سے مختلف ہے۔ جوہر وہ انفرادی ہستی ہے جو قوت سے متصف ہے۔

ہر موناد، دوسرے موناد سے مطلقاً علیحدہ اور جدا ہوتا ہے۔ "ہر انفرادی جوہر ایک علیحدہ دُنیا ہے اور سوائے خدا کے ہر شئے سے غیر محتاج"۔ "یہ نہ کسی پر عمل کرتا ہے اور نہ کسی کا معروضِ عمل بنتا ہے"۔ موناداتؔ کے دریچے نہیں ہوتے جن میں سے کوئی چیز آسکے یا جاسکے"۔ لائبنز کے اس دعوے کی تائید مطالعۂ باطن سے ہوتی ہے جب میں اپنی ذات پر غور کرتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ میں ایک یگانۂ روزگار فرد ہوں، میری ذات اور دوسروں کی ذات میں ایک خلیج حائل ہے۔

---

[1] ۔ دیکھو مونا ڈالوجی بند ۱۹ — ۲۹۔

[2] ۔ دیکھو رجائیت پر لائبنز کی مشہورِ عالم کتاب (Theodicy) جو اس نے شہزادی صوفیا چارلٹ کے لیے لکھی تھی۔

[3] ۔ دیکھو لائبنز کی (Discourse) بند چہار دہم، نیز مقابلہ کرو بند ۳۲ یہاں کالکنس کی کتاب محولہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

بالکل مجھ سا کوئی فرد نہیں۔ موناڈات کی اس تجرید و علیحدگی سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ ناقابلِ فنا اور ازلی ہیں۔ کیوں کہ اگر یہ اپنے سے کسی خارجی شئے سے متاثر ہی نہیں ہو سکتے تو یہ نہ فنا ہو سکتے اور نہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ لائبنز کہتا ہے کہ "معجزہ ہی کی رُو سے کسی جوہر کی ابتدا یا انتہا ہو سکتی ہے۔"

ہر موناد ساری کائنات کا آئینہ ہے، یعنے ہر موناد ادراک کی قوت رکھتا ہے اور وہ ساری کائنات کا ادراک کرتا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے۔ اس معنے کی رُو سے وہ ایک عالم اصغر ہے "کائنات کا زندہ آئینہ"۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ "ہر شئے ان تمام چیزوں کا احساس کرتی ہے جو ساری کائنات میں وقوع پذیر ہو رہی ہیں، جو شخص دیدۂ بینا رکھتا ہے وہ ہر شئے میں سب کچھ دیکھ سکتا ہے جو دوسری جگہ وقوع پذیر ہو رہا ہے اور نیز جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا ہے اور ہونے والا ہے، اس طرح حال کے آئینہ میں زمان و مکان کے بعید واقعات کا مطالعہ کر سکتا ہے"۔ "جو شخص کسی بھی موناد کے پردوں کو کھول سکتا ہو وہ ان میں دُنیا کی ساری تاریخ پڑھ سکتا ہے۔"

بابا افضل کوہی اور درد نے شاید اسی مفہوم کو اپنے اشعار میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

در جُستنِ جامِ جم زکوتہ نظری	ہر لحظہ گمانے نہ بہ تحقیق بری	(بابا افضل کوہی)
رَو دیدہ بدست آرکہ ہر ذرۂ خاک	جامیست جہاں نمائے چوں درنگری	

ہر گوشۂ فضائے صد بیاباں دارد	ہر غنچہ بمشت خود گلستاں دارد	(درد)
گر عقدۂ خاطرت کشاید بینی	ہر قطرہ بجیبِ خویش طوفاں دارد	

ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ لائبنز کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ "ہر موناد تمام کائنات کو اپنے طریقے پر ظاہر کرتا ہے"، بہ الفاظ دیگر، کائنات کی عکاسی کرتا ہے یا اس کا آئینہ دار رہے۔ لائبنز کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ چونکہ ہر موناد ایک دانا ہے لہٰذا وہ تمام دُنیا کا شعور رکھتا ہے، یعنے ایک حد تک ساری کائنات کو جانتا ہے۔ میں اپنی ذات میں فرد (موناد) کی علیحدگی اور اس کی ظاہرا ہم آہنگی کو جمع کرتا ہوں۔ میں ایک منفرد ذات ہوں، اپنے سے باہر نہیں ہو سکتا، اپنے تجربے سے باہر جا نہیں سکتا؛ تاہم مجھے دوسرے نفوس و اشیاء کا شعور رہے۔ کائنات کا علم رکھنے کی وجہ سے میں اس کی عکاسی کرتا ہوں، تاہم میرا علم مجھے اپنی منفرد و جدا ذات سے باہر نہیں لے جاتا۔

اس نظریہ کے سمجھنے میں دو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے:۔ (۱) چونکہ میں ایک ذی شعور ہستی ہوں لہٰذا یہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میں کائنات کا اپنے علم کی وجہ سے اظہار کرتا ہوں لیکن اس امر کا سمجھنا مشکل ہے کہ کس طرح ایک بے جان شئے، جیسے چٹان، کائنات کا اسی معنے میں اظہار کر سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ لائبنز نے کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام حقایق ارواح ہیں (حقیقت اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانی ہے) تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ ذی شعور بھی ہیں۔

(۲) دوسری مشکل یہ ہے:۔ لائبنز یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ایک محدود موناد کو ساری کائنات کا علم ہے؟ کیوں کہ کیا یہ ایک بدیہی امر نہیں کہ کسی محدود و متناہی ذات یا موناد کو ساری کائنات کا علم نہیں ہو سکتا؟ لیکن لائبنز پھر وہی کہتا ہے کہ بے شک روح کو "لامتناہی کا علم حاصل ہے، وہ سب کچھ جانتی ہے"۔ اپنی اس تعلیم کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے وہ اس امر پر زور دیتا ہے کہ بہت ساری چیزوں کے متعلق جن کا ہمیں صاف و واضح علم نہیں، مبہم و غیر ممیز علم ضرور ہوتا ہے۔ یہی نوعیت اس علم کی ہے جس کا ہمیں بدیہی تو نہیں ہوتا یا جس کا ہم منطقی طور پر استناج نہیں کرتے۔[۱]

یہ ہیں چند خصوصیات جو تمام محدود موناد ان میں پائے جاتے ہیں: پہلے تو وہ تمام خدا یا موناد مونادات کے محتاج ہیں جو ان کا خالق ہے؛ دوسرے ہر موناد فعّال ہوتا ہے؛ تیسرے، ہر موناد دوسرے موناد سے بالکل جدا یا علٰحدہ ہوتا ہے، "اس میں کوئی دریچہ نہیں ہوتا"؛ چوتھے، ہر موناد ساری کائنات کا آئینہ دار ہوتا ہے یعنے قوۂ ادراک سے متصف ہوتا ہے اور ساری کائنات کا اپنے طریقے سے اظہار کرتا ہے۔

اب ہمیں مختلف قسم کے مونادات کا باہمی فرق ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

عقلی موناد سے لائبنز کی مراد ذات، نفس یا روح ہے جس کا ہر انسان کو علم ہوتا ہے جیسے زید، لائبنز، فارابی۔ لائبنز نفس عقلی کے وجود پر کوئی دلیل نہیں لے آتا، بلکہ شعور کی ناقابلِ انکار شہادت کی بنا پر اس کو مان لیتا ہے۔ وہ میری ذات کے علاوہ دوسرے نفوس انسانی کے وجود کو بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ دوسرے تمام محدود مونادات سے عقلی مونادات کا ما بہ الامتیاز ان کے شعور کی صفائی اور وضاحت ہے۔ صرف نفوس عقلیہ ہی علاوہ ادراک و

---

[۱] دیکھو کاللکنس کی محولہ بالا کتاب صفحہ ۸۷ جہاں سے مندرجہ بالا بیان ماخوذ ہے۔ ان مشکلات کی مفصل توجیہ اسی کتاب میں آگے چل کر ملے گی (صفحہ ۹۷)۔

حافظہ کے عقل کے ملکہ سے متصّف ہوتے ہیں؛ اور صرف نفوسِ عقلیہ ہی اخلاقی آزادی اور ذمہ داری کے حامل ہیں۔ ارادے کی آزادی اور ذمہ داری کا تسلیم کرنا نفوسِ عقلیہ کی اخلاقی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

موناداتِ کی دوسری قسم حسّاس مونادات یا غیر عقلی ارواح ہیں۔ لائبنز حیوانات کی غیر عقلی حسّاس ارواح کو افرادِ انسانی کی ذی عقل شاعر بالذات ارواح سے صاف طور پہ ممیّز کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کی رُو سے حیوانات کی ارواح ادراک اور حافظہ سے تو متصّف ہیں لیکن نہ واضح طور پر شاعر بالذات ہیں اور نہ عقل اور اخلاقی آزادی رکھتے ہیں۔ ان میں اور انسان میں ادراک وشعور کی وضاحت و صفائی کا فرق ہے۔ انسانی اور حیوانی ارواح دونوں ساری کائنات کا ادراک کرتی ہیں اور اس طرح اس کی آئینہ دار ہیں لیکن حیوانی ارواح کا ادراک غیر صاف اور مختلّ و مبہم ہوتا ہے۔

مونادات کی تیسری قسم سادہ یا بسیط مونادات کی ہے جس میں عضوی و غیر عضوی اجسام داخل ہیں۔ عضوی اور غیر عضوی اجسام کا فرق اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔ یہ دونوں کئی مونادات یا مراکزِ قوت سے مرکب ہوتے ہیں؛ ان میں سے کوئی بھی صرف ایک موناد پر مشتمل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہر مادّی جسم قابلِ تقسیم ہوتا ہے اور تمام حیوانی اجسام مقطوع الاعضا ہو سکتے ہیں؛ اگر جسم روح ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں روح بھی قابلِ تقسیم و فنا قرار پائے گی جو محال ہے۔ اسی لیے اجسام کئی سادہ مونادات کے مجموعہ قرار دیے گئے ہیں اور یہ سادہ مونادات ہمیشہ ایک مسلسل تغیّر کی سی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی ایک جسم کا حصہ بنتے ہیں، کبھی دوسرے کا، اور اپنا مقام بدلتے رہتے ہیں، کبھی تو آہستہ آہستہ اور مسلسل، جیسے تغذیہ کی حالت میں، اور کبھی یکایک دم، جیسے پیدائش اور موت کے وقت۔

عضوی اجسام (برخلاف غیر عضوی اجسام کے) ایک مرکزی موناد پر مشتمل ہوتے ہیں، ایک ایسے موناد پر جس کو ملکہ کہنا چاہیئے، یا روح، جس کے آگے تمام جسم کی ایک تصویر ہوتی ہے اور جو جسم کے دوسرے تمام مونادات کی ہدایت و رہبری کرتی ہے۔ یہ مرکزی موناد گویا حکمراں ہے اور دوسرے مونادات حکم بردار۔ غیر عضوی اجسام میں اس قسم کا کوئی مرکز نہیں ہوتا بلکہ وہ مونادات کے محض ایک مجموعے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ بہ قول لائبنز کے "جواہر کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں اور صحیح معنے میں ایک جوہر نہیں ہوتے۔"

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ لائبنز کے نزدیک سادہ اور حسّاس موناد یعنے مادی شئے، اور نفس یا ذات (حیوانی ہو یا انسانی) میں فرق صرف شعور کے درجوں کا ہے۔ لائبنز ہمیشہ اس امر پہ زور دیتا ہے کہ

سادہ موناد حساس موناد کی طرح مُدرِک ہوتا ہے، ورنہ اس کی ماہیت روح جیسی نہ ہوگی، لیکن اس کا ادراک اس قدر غیر واضح، خفیف اور مبہم ہوتا ہے کہ سادہ موناد کو ہم اچھی طرح غیر حساس یا خفتہ موناد کہہ سکتے ہیں۔

جس دُنیا کو ہم بے جان دُنیا کہتے ہیں لائبنز کے نزدیک وہ مدہم شعور رکھنے والی ارواح سے مملو ہے:۔

"دُنیا ایک بے جان مشین نہیں جیسا کہ ڈیکارٹ اور ہابس نے خیال کیا تھا۔
اس میں کی ہر چیز گویا قوت ہے، روح ہے، زندگی ہے، فکر و خواہش ہے!
ہمیں جو چیز نظر آرہی ہے وہ مشین ہے، لیکن ہم ہستی کے صرف خارجی پہلو کو
دیکھ رہے ہیں۔ ہستی وہ شئے ہے جو خود دیکھتی ہے" (مُدرک ہے) (بوترو)

اس بعید از قیاس نظریہ کو قابلِ فہم بنانے کے لیے لائبنز بار بار اس فرق کی طرف ہماری توجہ کو مبذول کرتا ہے جو متوجہ و غیر متوجہ شعور میں پایا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہزارہا علائم و اشارات ہمیں اس نتیجے کی طرف رہبری کرتے ہیں کہ
ہم میں ہر لحظہ لامتناہی ادراکات وقوع پذیر ہو رہے ہیں، لیکن نہ ہمیں
ان کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ہم ان پر غور کرتے ہیں، یعنی ہماری
روح میں ایسے تغیرات جاری ہیں جن کا ہم کو ادراک (یا شعوری علم)
نہیں ہوتا، اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ارتسامات یا تو نہایت
خفیف ہیں یا بے شمار ہیں یا بالکل متحد ہیں اس لیے ان میں کوئی چیز
تمیز پیدا نہیں کرتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی بنا پر ہمیں عادت پن چکی یا آبشار کی
حرکت کا خیال کرنے سے باز رکھتی ہے جب ہم کو کچھ عرصہ اس کے قریب
رہتے ہوئے گزر چکا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ حرکت کا ہمارے
اعضائے حواس پر اثر نہیں ہوتا، اور اس کے بالمقابل روح میں ایک
تغیر پیدا نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ ارتسامات اتنی
طاقت نہیں رکھتے کہ ہماری توجہ اور ہمارے حافظہ کو اپنی طرف جذب کریں"[ا]

[ا] دیکھو لائبنز کی کتاب (New Essays) دیباچہ۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعور کا خوابیدہ غیر متوجہ پہلو بھی ہوتا ہے۔ شعور ہمیشہ واضح و اُجاگر نہیں ہوتا، خفتہ و خوابیدہ حالت میں ہی ہوتا ہے۔ سادہ موناداِت کا شعور اسی خوابیدہ حالت کا سا ہوتا ہے۔ استدلال سے لائبنز یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ علاوہ حیوانانی و انسانی ارواح کے دوسری ارواح بھی پائی جاتی ہیں۔ کائنات ساری ارواح سے مملو ہے۔ ان ارواح کے شعور کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں۔ جن اشیاء کو ہم مادّی سمجھتے ہیں وہ خفتہ شعور رکھنے والی ارواح ہیں، حیوانات کی ارواح شعور و حافظہ رکھتی ہیں، انسانی ارواح شعور ذات اور عقل سے متّصف ہیں۔

انسان میں سادہ موناداتِ بہ منزلہ جسم ہیں اور اعلیٰ تر موناد اس کی روح یا نفس ہے۔ جسم اور روح کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اپنی کتاب "نظام جدید" میں لائبنز اعتراف کرتا ہے کہ روح اور جسم کی وحدت ہی کے سوال پر غور کرتے ہوئے وہ جواہر (موناداِت) کے اشتراک باہمی والے عام مسئلے تک جا پہنچا۔

روح اور جسم کے باہمی ربط کو ایک تمثیل کے ذریعے لائبنز یوں ظاہر کرتا ہے:۔

"ایسی دو گھڑیوں کا تصوّر کرو جو ٹھیک ایک ہی وقت بتلاتی ہیں۔ یہ تین طریقوں سے ممکن ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ ان دونوں میں باہمی اثر و تاثر ہوگا؛ دوسرا یہ کہ ہم ان کو ایک ہوشیار صنّاع کے ہاتھ میں دے دیں جو انھیں ہر لحظہ ایک ساتھ چلائے؛ تیسرا یہ کہ ان دونوں گھڑیوں کو ایسی حکمت و صحت کے ساتھ بنایا جائے کہ آیندہ یہ ٹھیک ایک سا وقت بتلاتے رہیں۔ باہمی اثر و تاثر نظریہ روزمرّہ کا فلسفہ[1] ہے؛ لیکن چونکہ ہم ایسے مادّی ذرّات کا تصوّر نہیں کر سکتے جو ایک جوہر سے نکل کر دوسرے میں نفوذ کر سکیں، لہٰذا یہ تصوّر قابل تردید ہے۔ خالق کی مسلسل معاونت کا نظریہ نظامِ علل اتفاقیہ[2] والا نظریہ ہے؛

---

[1] یہ ڈیکارٹ کا تعامل یا (Interactionism) والا نظریہ ہے جس کی رُو سے ذہن جسم پر عمل کرتا ہے اور جسم ذہن پر، چونکہ خود ڈیکارٹ کے نزدیک جسم اور روح بالکل مختلف الماہیت ہیں لہٰذا یہ تعامل ناقابلِ فہم ہے۔

[2] یہ گیولنکس اور مالبرانش کا نظریہ ہے جن کے نزدیک خدا نے روح اور جسم دونوں کو پیدا کیا ہے اور ہر موقع پر

لیکن میری رائے میں یہ خدا کو ایک فطری اور معمولی معاملے میں گھسیٹ لانا ہے جہاں عقل کی رُو سے اس کو تو اسی حد تک اشتراکِ عمل کرنا چاہیئے جس حد تک کہ وہ دوسرے تمام فطری مظاہر میں کرتا ہے۔ لہٰذا اب میرا نظریہ یہی باقی رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ روزِ ازل ہی سے خدا نے ان دونوں جوہروں (روح و جسم) کو کچھ ایسی فطرت و نوعیت کا بنایا ہے کہ اپنے ہی قوانین کی پابندی کرنے کے باوجود، جو ہر ایک کی فطرت ہی میں ودیعت ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ توافق رکھتا ہے گویا کہ وہ ایک دوسرے پر عمل کر رہے ہیں۔"[1]

یہ ہے لائبنز کا نظریہ جس کو وہ "نظریہ توافق مقدّر" (Pre-established harmony) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ "ارواح کا عمل علل غائیہ سے متعلق ہوتا ہے" یعنے خواہشات، غایات ان کے اعمال کا تعین کرتے ہیں۔ "اجسام کا عمل علل فاعلی یا حرکات سے متعین ہوتا ہے" یہ دونوں اپنے اپنے قوانین کی پابندی کرتے ہیں، جو ان کی فطرت میں ودیعت ہیں، تاہم ان دونوں میں کامل توافق ہے اور یہ توافق روزِ ازل ہی سے مقدّر کر دیا گیا ہے۔ اجسام عضویہ بہ قول لائبنز "خدائی مشین" ہیں

"توافق مقدر" کا نظریہ لائبنز کے نزدیک صرف روح و جسم کی وحدت ہی کی توجیہ نہیں کرتا بلکہ یہ ساری کائنات پر حاوی ہے۔ تمام مونادات اس طرح آپس میں مل کر عمل کرتے ہیں گویا کہ وہ ایک ہی عضویت کے مختلف حصّے ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا علٰحدہ وظیفہ ہے۔ لائبنز کہتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز ربط علیّت سے مربوط ہے لیکن علیت سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمام حصص کے اعمال ایک توافق رکھتے ہیں، ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو خدا نے پہلے ہی سے مقرر کر دی ہے۔ بہ الفاظ دیگر خدا نے کائنات کو کچھ اس طرح سے ترتیب دی ہے کہ وہ بغیر اس کی کسی قسم کی مداخلت کے چل رہی ہے:

جب روح اور جسم کو ایک ساتھ عمل کرنا ضروری ہوتا ہے تو خدا مداخلت کرتا ہے اور ان دونوں میں ربط قایم کرتا ہے اس کو "اتفاقیت" والا نظریہ کہتے ہیں (Occasionalism)

[1] فوشر کے اعتراضات کے جواب میں لائبنز نے گھڑیوں کی یہ تمثیل پیش کی اور اپنے نظریہ کو بہت واضح کیا۔

ہر موناد کی ہر کیفیت اس کی گذشتہ کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور دوسرے تمام مونادات کی کیفیتوں کے ساتھ مل کر عمل کرتی ہے۔ کائنات کا توافق اور اس کی ہم آہنگی کامل و مکمل ہے۔ فطرت کی ہر شئے میکانکی اور سائنٹفک طور پر سمجھائی جا سکتی ہے، یعنے عالم طبیعی میں قانون، یکسانیت، نظم و ترتیب پائے جاتے ہیں، لیکن ان کا مبدء خدا ہے۔ اسی لیے لائبنز اپنے نظامِ فلسفہ کا ماٹو یہ مقرر کرتا ہے: "میکانیت کا مبدء مابعد الطبیعیات ہے"۔ اس طرح میکانیت اور غایتیت میں تطبیق پیدا کی جاتی ہے: فطرت کی توجیہ بغیر غایت و مقصد کے تصور کو داخل کرنے کے بھی کی جا سکتی ہے، لیکن میکانکی فلسفہ خدا کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے اور اسی کے آستانے کی جانب لے جاتا ہے کیوں کہ طبیعیات اور میکانیات کے اصول و قوانینِ کلّی کی توجیہ بغیر خدائی غایت و مقصد کے ہو نہیں سکتی۔ اس طرح لائبنز مذہب و عقل میں تطبیق پیدا کرتا ہے۔[1]

لائبنز نے کائنات کی جو تصویر پیش کی ہے اس کے جلی خد و خال ان الفاظ میں ملخصاً پیش کیے جا سکتے ہیں:۔

> "یہ فعّال قوتوں یا ارواح کی زندہ روحانی دُنیا ہے، جن میں سے ہر روح کامل ہے اور اپنی ہی فطری قوانین کے تحت اپنی غایت کا تحقق کر رہی ہے، ہر روح دوسری روح سے جدا و ممیّز ہے تاہم اپنے مقصد اور تمام کائنات کے اظہار کی قابلیت کے لحاظ سے دوسری تمام ارواح سے توافق اور ہم آہنگی رکھتی ہے۔ ان تمام روحانی قوتوں کا خالق اور ان میں توافق پیدا کرنے والا موناد برتر خدا ہے، جو ایک ذی شعور، آزاد، قوتِ مطلق، حکمتِ مطلق و خیرِ مطلق رکھنے والی ہستی ہے۔ اور درجۂ کمال کے اعتبار سے اس کے قریب تر آزاد اور شاعر بالذات ارواح ہیں جن سے بہ قول لائبنز کے، "ارواح کی ایک جمہوریت" تشکیل پاتی ہے، جس کا بادشاہ خدائے لایزال ہے۔"[2]

میر ولی الدین

---

[1] دیکھو تاریخ فلسفہ از تھلی ص ۲، ۳ - ۳۷۳ - [2] دیکھو کالکنس ص ۹۲۔

۵۰

خوابوں کی بستی

خوابوں کی بستی اس نامعلوم مدت سے بسی چلی آتی ہے جب سے ہماری یہ ظاہری دُنیا جیتی جاگتی آباد ہے اس میں صرف سونے جاگنے کا فرق ہے ورنہ جو کچھ ہم جاگنے میں کرتے۔ دیکھتے۔ سُنتے اور چلتے پھرتے ہیں اُسی طرح سونے میں بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر دیکھتے اور کرتے ہیں گویا سونے کے بعد ایک عجیب عالم ہمارے سامنے آباد نظر آتا ہے اور ہر عمر کے بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ عورت اور مرد سب اس کی سیر کرتے اور اس نامعلوم آبادی سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں بہت کم معلوم ہے کہ خوابوں کی اس دل فریب بستی کی اصلیت کیا ہے؟ یہ کیوں ہے اور کیسے ہے؟ زمانۂ جاہلیت سے آج کی مہذب جدید سائنس کی ترقی یافتہ دُنیا تک خواب اور اس کی تعبیر کا مسئلہ لاینحل معمّہ سا بنا ہوا ہے اور باوجود مسلسل غور و فکر کے منفقہ طور پر اس کی تحقیق ابھی تک مکمل نہیں ہوسکی ہے، اس کا خاص سبب یہ بھی ہے کہ گو خواب کی اصلیت سے کسی زمانے میں کسی کو انکار نہیں ہوا لیکن عرصۂ دراز تک فلاسفۂ قدیم نے اس کی طرف توجہ نہ کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم علم لوگوں نے خوابوں کی حقیقت اور تعبیروں کے لیے اپنی سمجھ اور علم کے موافق تاویلیں کرلیں اور وہ اپنی رائے سے انھیں کو ماننے لگے۔ مفکرین و علماء نے غور بھی کیا تو بہت بعد میں اور وہ بھی بہت کم۔

جاہلیت کے زمانے میں خواب کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور رمل۔ نجوم یا فال کی طرح خواب سے بھی ماضی اور مستقبل کے حالات کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر علمائے مذہب نے اس پر توجہ کی، اور قریب قریب ہر مذہب میں خواب کی حقیقت اور سچے خوابوں کی تعبیر کی اصلیت مانی جاتی رہی۔ جس قدر تحقیق کی روشنی بڑھتی گئی وہمی خوابوں کی اہمیت کم ہوتی گئی اور خوابوں کے شاعرانہ تخیل اور اصلیت کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا۔ علمائے اسلام کے نزدیک خواب کی جو حقیقت ہے دوسرے مذہبی علماء اور اکثر فلاسفۂ قدیم کا بھی اسی پر اتفاق ہے۔ البتہ جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے کچھ اصطلاحی فرق

قدیمی خیالات میں ضرور ہے۔ یہاں خوابوں کی ہستی کے تذکرے میں قدیم اور جدید فلسفہ دونوں کی بحث آئے گی
اور ضمنی طور پر مذہبی نقطۂ نظر بھی واضح ہوتا جائے گا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کے پانچ حواس ظاہری ہیں، یعنے دیکھنا، سُننا، چکھنا، سونگھنا، اور چھونا۔
اسی طرح پانچ طاقتیں دماغ میں اور پوشیدہ ہیں جنھیں حس مشترک۔ خیال۔ متصرفہ۔ واہمہ اور حافظہ کہتے ہیں،
ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا کام الگ الگ جاری رہتا ہے۔ ہم جو کچھ جاگتے میں دیکھتے ہیں یا سُنتے ہیں اور چھوتے ہیں
خیال اور حافظہ کی مدد سے ہمارے دماغ میں ان کی یادداشتیں محفوظ ہو جاتی ہیں اسی طرح جو باتیں جاگتے میں
ہمارے وہم و گمان کو محسوس ہوتی ہیں ان کی یاد ہمارے دماغ کے پردے پر قایم ہو جاتی ہے مگر ہم جاگنے کی
حالت میں چونکہ برابر دماغ کی ان طاقتوں سے کام لیتے رہتے ہیں اس لیے یک سوئی حاصل نہیں ہوتی متصرفہ کا
کام یہ ہے کہ جو باتیں اور صورتیں ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں ان میں تصرف کر کے آپس میں ملائے لیکن
اس قوت کا یہ کام جاگنے کی حالت میں پوری شدّت سے اس لیے نہیں ہوتا کہ یک سوئی نہیں ہوتی جب ہم
سو جاتے ہیں تو یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ ہمارے تمام ظاہری حواس بالکل غافل اور بے ہوش ہوتے ہیں۔
لیکن پوشیدہ طاقتیں پورے اثرات کے ساتھ جاگتی ہیں اور اپنا کام شروع کر دیتی ہیں، اب ظاہر ہے کہ قوتِ متصرفہ
خیال۔ حافظہ اور وہم کی تمام یادداشتوں پر جب قابو پاتی ہے تو ان کو حرکت میں لاتی ہے اور اس حالت میں
جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے ہم روک نہیں سکتے کیوں کہ ہمارے ظاہری حواس سو رہے ہوتے ہیں یہی سبب ہے کہ
ہم خواب میں ایسی ایسی باتیں دیکھتے ہیں جو جاگتے میں ممکن نہیں ہوتیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے جیسے سینما کے پردے پر
بہت چھوٹی تصویریں غیر معمولی بڑائی کے ساتھ عجیب و غریب حرکتیں کرتی دکھائی دیتی ہیں اسی طرح متصرفہ کی
مشین ہماری یادداشتوں کی تصویروں کو گھٹا بڑھا کر خواب کے پردے پر لے آتی ہیں اور ہم چپ چاپ
دیکھے چلے جاتے ہیں، یعنے جو کچھ جاگتے میں دیکھنے، سُننے یا سوچنے سے ہمارے دماغ کی یادداشتوں میں
محفوظ ہوتا ہے، وہی اکثر خواب میں کبھی بجنسہٖ اور کبھی گھٹنے بڑھنے کے بعد نظر آتا ہے۔

یہ ہے خواب کی حقیقت فلاسفۂ قدیم کی نظر میں جس میں علمائے اسلام کی رائے خصوصاً شامل ہے
لیکن فرق یہ ہے کہ ایک گروہ کا بیان ہے کہ "تمام خواب گزری ہوئی باتیں اور پہلے زمانے کے خیالات ہیں جو
سوتے میں نظر آتے ہیں"۔ اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اس حقیقت کے علاوہ بعض خوابوں کے
ذریعے غیب کی خبریں خدا کی طرف سے روحوں کو ملا کرتی ہیں اور یہ خواب صحیح یا رویائے صادقہ

کہلاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خواب صحیح کے منکر اس قسم کے خواب کے ثبوت مل جانے کے بعد اس کی اصلیت سے تو انکار نہیں کرتے، مگر دبی زبان سے یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ جب تک روح کے مسئلے کا انکشاف پورے طور پر نہیں ہوا ہے اور عالم ارواح کی حقیقت کو نہیں سمجھا گیا ہے مادہ پرست سائنس اس قسم کے خواب کی اہمیت کو نہیں مان سکتا۔

گذشتہ خیالات و حالات کے خواب کی مثالیں تو شب و روز ہمارے سامنے ہی آتی رہی ہیں لیکن مذہب و سائنس سے قطع نظر کرکے خوابِ صحیح کی مثالوں کے تجربے بھی ہم میں سے اکثر اصحاب کو ذاتی طور پر ہوتے رہتے ہیں اور اس قسم کے واقعات بھی کثرت سے شہادت دیتے ہیں، چنانچہ:۔

"حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب سب سے پہلے اس کے شاہد ہیں جن کا ذکر متعدد آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ قرآن کریم میں تو اس کی پوری تفصیل ہے لیکن توریت میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ (حضرت) یوسفؑ نے لڑکپن کے زمانے میں ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائیوں سے بیان کیا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میرا پولا اُٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا، تمھارے پولے جو اِدھر اُدھر کھڑے تھے وہ میرے پولے کے آگے جھک گئے اور اس کا سجدہ کیا۔"

اس پر ان کے بھائیوں نے کہا کہ کیا تو ہمارا حاکم بنے گا اور ہم تجھے سجدہ کریں گے۔

اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے پھر خواب میں دیکھا کہ سورج۔ چاند اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس خواب کو جب ان کے باپ حضرت یعقوبؑ نے سُنا تو فرمایا کہ کیا تیری ماں، باپ (میں) اور سب بھائی تجھ کو سجدہ کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت یعقوبؑ نے اس خوابِ صحیح کی تعبیر یہ کی کہ وہ بادشاہ ہوں گے اور ان کو سورج۔ چاند، یعنے ان کے ماں، باپ اور گیارہ ستارے، سب بھائی سجدہ کریں گے۔ اس پر ان کے بھائی ان سے جلنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے جانی دشمن ہو گئے، لیکن باوجود بھائیوں کی قاتل دشمنی کے ان کا بال بیکا نہ ہو سکا اور گو وہ بھائیوں کی دشمنی سے کنویں میں گرے۔ غلام بنے۔ مصر میں قید ہوئے، لیکن ایک دن ان کے خواب کی تعبیر پوری ہوئی، وہ واقعی شاہ مصر بنے اور ان کے ماں، باپ۔ بھائیوں نے سجدہ کیا۔ حالانکہ خواب دیکھتے وقت ان کے گمان میں بھی یہ واقعات نہ تھے جو

انھیں نظر آئے یہ روحانی پیغام نہ تھا تو کیا تھا۔ اب ہم خوابوں کی تقسیم سے پہلے جدید سائنس کا نظریۂ خواب بھی یہاں واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ دونوں کی روشنی میں خوابوں کی بسنی کی سیر سے دلچسپی حاصل ہو سکے۔

مذہبی حیثیت سے جو خواب نامے یا تعبیر نامے یورپ میں مرتب ہوئے ان کو چھوڑ کر یورپ کے فلاسفر خواب کے مسئلے کو سن ۱۹۰۰ء تک وہم و خیال سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

وائنا یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سگمنڈ فرائڈ نے سن ۱۹۰۰ء میں خواب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کیا۔ اس فاضل پروفیسر کی تحقیقات خواب سے پہلے نفسیات خواب پر کوئی تصنیف موجود نہ تھی اور نہ سائنٹفک طریقے سے اس مسئلے پر غور ہوا۔ فرائڈ کی نفسیات خواب کی تحلیل کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیند اس حالت کا نام ہے جب ہمارے ظاہری حواس سو جاتے ہیں۔ حواس کی دو طاقتیں ہیں، ایک شعور اور دوسرے غیر شعور۔

"شعور کا کام ہمارے حواسِ خمسہ کو کام میں لانا، یعنے دیکھنا۔ سُننا۔ چکھنا۔ سونگھنا۔ اور چھُونا ہے اور غیر شعور، شعور کے ماتحت فکر و غور کا کام کرتی ہے۔ جاگنے میں ہمارے شعوری حواس کام کرتے ہوتے ہیں اس لیے غیر شعوری طاقت یکسوئی کے ساتھ اس وقت اپنا کام نہیں کر سکتی۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب ہم ایک تحریر پڑھتے ہوتے ہیں اس وقت کوئی مضمون دماغ سے سوچ کر لکھ نہیں سکتے۔ لیکن سو جانے کے بعد "شعور" کا کام بند ہوتا ہے، اس لیے غیر شعوری مدد کے تیار کیے ہوئے خاکے اُبھرتے ہیں اور خواب کے پردے پر ان کی حرکتیں شروع ہو جاتی ہیں اور وہ تمام خیالات و حالات جو جاگتے وقت ہمارے شعور کے سامنے آتے ہیں اُنھیں ہم سونے کے وقت شعور کے غافل ہوتے ہی تیزی سے حرکت کرتے دیکھتے ہیں۔"

اسی نظریہ کو زمانۂ حاضرہ کا دوسرا فلاسفر پروفیسر برگسان تصدیق کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ:۔

"بے شمار خواہشیں۔ خیالات اور صورتیں ہمارے دل اور دماغ۔
ذہن و حافظہ میں بند ہوتی رہتی ہیں اور جاگنے کی حالت میں
ان سب پر شعور کی روشنی پڑتی رہتی ہے اسی طرح غیر شعور کی
مدد سے جو کچھ سوچتے سمجھتے ہیں وہ بھی یادداشت میں ہیں، لیکن

ان کی مثال ایک اندھے کنویں کی سی ہے۔ ہماری یہ یادداشتیں
ذہن کے اندھے کنویں میں بند ہیں اور ان پر شعور کی روشنی پھیلی
ہوتی ہے، غیر شعور کی طاقت اس کے نیچے دبی رہتی ہے اس لیے
جاگتے ہیں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی جو ذہن میں گزشتہ
شعور نے بند کی ہیں سونے کے بعد اس اندھے کنویں کا دروازہ
کھل جاتا ہے، یعنے شعور کے سوجانے سے سب رکاوٹیں اُٹھ جاتی ہیں
اس لیے یہ یادداشتیں اس اندھے کنویں میں سے نکلنا شروع
ہوتی ہیں اور غیر شعور کی تاریکی میں حرکت کرتی رہتی ہیں اس حالت کو
خواب دیکھنا کہتے ہیں اب جو باتیں سونے سے پہلے ہمارے ذہن
اور دماغ سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، جو آوازیں ہمارے کانوں پر
اپنا اثر زیادہ مس کرتی رہی ہیں وہی پہلے اور زیادہ واضح ونمایاں
ہوکر ہمارے سامنے سب سے پہلے خواب میں آتی ہیں اور
"خوابوں کی بستی" کو معمور کرتی ہیں۔"

یہ ہے جدید سائینس کی روشنی میں خواب کی حقیقت۔

اب خوابوں کی تعبیر اور اُن کے اثرات پر قدیم اور جدید فلسفے کی رُو سے نظر ڈالیں تو اب سے پہلے ہمارے سامنے وہ تقسیم آتی ہے جو فلاسفہ نے خوابوں کی بستی کے لیے کی ہے، یعنے اول خواب پریشاں دوسرے خواب مرض تیسرے خوابِ صحیح یا رویائے صادقہ۔ سب خواب سچے اور یقین کے قابل نہیں۔ ان میں سے پہلے دو کے متعلق قدیم اور جدید فلاسفہ کا اتفاق ہے، مگر خوابِ صحیح پر جدید سائینس یقین نہیں کرتا خوابِ صحیح کا ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے۔ خوابِ پریشاں وہ خواب ہیں جو ہاضمہ کی خرابی یا دماغ کی پریشانی کی حالت میں سوجانے سے دکھائی دیتے ہیں جیسے سردی کے موسم میں سوتے وقت کمبل یا لحاف ہمارے اوپر سے دور ہوجائے تو ہم خواب دیکھتے ہیں کہ بالکل ننگے پھر رہے ہیں اسی طرح بھوک پیاس اور اس طرح کی تمام خواہشوں اور ضرورتوں میں سونے والے اس خواہش کو پورا ہوتے دیکھتے ہیں اور جاگنے کے بعد ان کا نہ کوئی اثر ہوتا ہے نہ وہ آیندہ زندگی سے کوئی تعلق رکھنے والی ہیں، مگر بعض اوقات اس قسم کے

خواب بھی سچّے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے شہرۂ آفاق شاعر کولرج کی مشہور نظم "کبلا خان" کے دو سو سے تین سو مصرعے خواب میں اس نے کہے۔ جاگنے کے بعد وہ سب شعر اس کو یاد تھے جو اس نے لکھ لیے۔

خوابِ مرض میں وہ خواب شامل ہیں جو کسی بیماری کی حالت میں سوتے وقت نظر آتے ہیں۔

مثلاً ہماری روح اور دماغ پر بخار کے سبب گرمی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ آگ میں جل رہے ہیں یا آگ کے شعلے ہمیں جلائے دیتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کی تعبیر بہت آسان ہے جن کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر بیماری کے زمانے میں زرد رنگ کی مختلف شکلیں لڑتی جھگڑتی یا مار پیٹ کرتی دکھائی دیں تو یہ صفرے کی زیادتی کے سبب سے ہیں۔ سرخ یا کسی رنگ کی خوشنما حسین صورتیں نظر آئیں تو یہ خون کی کثرت کے سبب سے ہیں۔ دریا میں تیرنا۔ مینہ یا پانی کے طوفان دیکھنا بلغم کی زیادتی کی علامت ہے۔ سیاہ رنگ کی صورتیں۔ قبرستان۔ مُردے۔ سیاہ رنگ کے کتّے۔ دیو اور آندھی وغیرہ سوداویت کی علامت ہیں اور ان سب واقعات میں خوابِ پریشاں کی طرح بے ترتیبی بے تُکاپن ہوتا ہے لیکن خواب دیکھنے والے کی روزمرّہ کی زندگی کے واقعات سے دُور نہیں ہوتے بلکہ عام دیکھی اور گزری ہوئی باتیں بڑھنے گھٹنے کے بعد نظر آتی ہیں جدید تحقیقات کے بعد بعض ڈاکٹر نفسیاتی نقطۂ نظر سے امراض کا علاج کرتے وقت اس قسم کے خوابوں سے مرض کی تشخیص میں مدد لیتے ہیں۔

اب صحیح خوابوں کی باری آتی ہے۔ اس قسم کے خواب کی نسبت افلاطون کی تحقیق بہت کچھ سچ ثابت ہوتی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ خواب میں ہم عموماً وہی چیزیں دیکھتے ہیں جنھیں جاگتے وقت دیکھا یا سُنا ہے لیکن ایسے خواب کھانا کھانے کے بعد سوتے وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب معدہ اور دماغ کے خالی اور لطیف ہونے کے وقت جو کچھ ہم خواب میں دیکھتے ہیں ان کا تعلق کسی اور دُنیا سے ہے۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق علمائے اسلام خصوصاً اور دوسرے مذہب کے بزرگوں نے ثبوت کے ساتھ کی ہے اور اکثر واقعات اور تجربات بھی موجود ہیں۔ دو فلاسفرز کا متفقہ بیان ہے کہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اُن میں سے بعض یقیناً خدا کی طرف سے ہیں۔

مذہبی روایات اور بیانات کو چھوڑ کر جدید ماہرین نفسیات کے بیانات بھی بڑی حد تک صحیح خوابوں کی حقیقت کو مانتے ہیں مگر کُھلم کُھلا نہیں بلکہ دبی زبان سے چنانچہ ایک ماہر نفسیات کہتا ہے کہ:-

"ہم خواب میں جو حالت دیکھتے ہیں اگر وہ کیفیت خواب ہی میں ختم

ہو جائے تو اس کی تعبیر کرنی چاہیئے کہ نتیجہ آیندہ کچھ نہ ہوگا، وہیں
تمام ہوگیا، اور اگر وہ حالات خواب میں نا تمام رہے یا کش مکش کو
جاری دیکھ کر آنکھ کھل جائے تو نتیجہ ضرور نکلے گا اور ناخوشگوار ہوگا۔"

ڈاکٹر یونگ جو پروفیسر فرائڈ کا سب سے بڑا نایب ہے کہتا ہے کہ:۔
"خواب سب کے لیے اہم اور مفید ہوتے ہیں بہ شرطیکہ اُن کا استعمال
کرنا ہم سیکھ چکے ہوں"۔

اس کے مختلف نظریوں کا لب لباب یہ ہے کہ خواب کی صحیح تعبیر اس وقت کی جا سکتی ہے کہ خواب دیکھنے کے بعد واقعات یاد رہیں اور یہ اچھی طرح دیکھ اور سمجھ لیا جائے کہ خواب میں دیکھی ہوئی باتیں ہم نے اس سے پہلے نہ کبھی سُنیں نہ ان حالات کو دیکھا، اور نہ ان کا ہماری روز مرہ کی زندگی میں کبھی کوئی ذکر یا خیال آیا ہمارا ذہن جاگتے وقت ان حالات سے بالکل خالی تھا اس وقت یہ سمجھنا چاہیئے کہ خواب سچا ہے اور اس کی تعبیر دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔

علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ:۔
"جو خواب دماغ کی درستی۔ جسم کی پاکیزگی اور خیالات کی صفائی کی
حالت میں سوتے ہوئے دکھائی دیں وہ خواب صحیح ہیں اور اُن کو
خدا کی طرف سے روح کو ملے ہوئے پیغام سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ
شاعر۔ شریر۔ مست۔ مریض اور غمگین آدمیوں کے خواب اکثر سچے
نہیں ہوتے۔ خواب میں ہم بعض اوقات ماضی کے علاوہ حال کی باتیں
اور مستقبل کے واقعات قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کے
حالات بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ یہ سب خواب روحانی کہے جاتے ہیں"۔

شنکر موہن لعل ماتھر

انڈیا آفس کی چند تاریخی دستاویزات

انڈیا آفس (لندن) کے کتب خانے میں قلمی اور مطبوعہ کتابوں، مرقعوں وغیرہ کے ساتھ قدیم اسنادی کاغذات بھی محفوظ ہیں۔ میں نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں بہ لحاظ دلچسپی ان کا بھی معاینہ کیا تھا۔ ان کی مختصر کیفیت یہاں درج کی جاتی ہے۔

اس قسم کے فارسی کاغذات ایک "چکٹ بک" میں چسپاں ہیں، اور ان پر ایک ایک انگریزی نوٹ بھی لگا ہوا ہے۔ اس چکٹ بک میں جو کاغذات ہیں وہ حسب ذیل ہیں:—

(۱) کاغذات فتح علی شاہ قاچار (۲) خطوط والاجاہ رئیس ارکاٹ

(۳) فرمان شہنشاہ بابر (۴) اسنادات عالمگیر

(۵) پاس پورٹ سلطنت ترکی (۶) سند سلطنت آصفیہ

فتح علی شاہ قاچار کے کاغذات وہ فرامین ہیں جو کمپنی انگریزیہ اور ان کے سفیر مقیم ہندوستان کو تجارت وغیرہ کے متعلق دیے گئے ہیں۔ ان فرامین کی طرز بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ سلطنتِ مغلیہ اور سلطنتِ آصفیہ کے قدیم اسنادات وغیرہ ہوتے ہیں۔ ناصیہ پر مہر۔ خاتمے پر دستخط اور پشت پر تاریخ وغیرہ۔ یہ مراسلت شاہ انگلستان کے نام نہیں ہوئی ہے، بلکہ کمپنی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ کاغذات ۱۲۲۵ھ اور اس کے مابعد کے ہیں۔

والاجاہ کے خطوط شاہ انگلستان جارج سوم، اور سرکار کمپنی دونوں کے موسومہ ہیں۔ یہ مراسلت نہایت عمدہ زر افشانی سنہرے حاشیے کے کاغذ پر ہوئی ہے۔ ایک خط میں والاجاہ نے اپنے خاندانی جھگڑوں کے متعلق بھی خاص اپنے قلم سے صراحت کی ہے۔ یہ مراسلت ہم رتبہ بادشاہوں کی مراسلت کا انداز رکھتی ہے، برتری اور بزرگی کا پتا نہیں چلتا۔

بابر کا ایک فرمان ہے جو قاضی جلال کی معاش کے متعلق ہے۔ عالمگیری کاغذات میں مختلف فرمان اور اسناد وغیرہ شامل ہیں، جو صوبہ جات الہ آباد۔ پنجاب وغیرہ کے معاشوں کے متعلق ہیں اور بعض کاغذات اسد خاں محمد اسلم۔ قاضی شریعت خاں وغیرہ کے مہری بھی ہیں۔ ان کے تفصیلی معائنے کے لیے بڑے وقت کی ضرورت تھی۔

سلطنت ترکی کا صرف ایک پاس پورٹ اس میں شامل تھا۔ سلطنتِ آصفیہ کی ایک سند موجود تھی، یہ سند قطب الدولہ کی موسومہ ہے اس کے ساتھ ان کا ایک وصیت نامہ بھی ہے۔

قطب الدولہ آصف جاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں راج بندری۔ ویلور وغیرہ کے جاگیردار تھے، ان کا وصیت نامہ حسب ذیل ہے:۔

وصیت نامہ قطب الدولہ تحریر غرہ ذیقعدہ ۱۲۴۳ھ

"وصیت نامہ چوں ایں جانب را بیماری دراز شدید لاحق شدہ اگرچہ بحو نہ تعالیٰ صحت یافتم اما زندگی را چہ اعتبار است، لہذا برخوردار مرزا زین العابدین عرف سبحان بخش راکہ اکبر اولاد است ولیعہد و قایم مقام خود کردم۔ بعد از من خانہ و اثاثہ سرانجام ہمہ املاک وجاگیرات و دیہات وغیرہ ہر رطب و یابس کہ در ملکیت دارم ہمہ از برخوردار مذکور است، بجان و دل بخشیدم دیگرے را دراں دخل و اختیار نیست، باید کہ برادران کہ از و کوچکتر اند ہمیشہ در اطاعت و اختیار او بودہ دعویٰ و طلب چیزے نداشتہ باشند۔

برخوردار پرورش ابنہا و ہمشیرہا و جملہ قبائل و وابستگان خواہد کرد اگر از اولاد من کسی بدستور عوام از مرزا زین العابدین درخواست ترکہ و حصہ بکند مناسب نیست چراکہ نام و آبرو کہ پیدا کردہ ام نخواہد ماند۔

ایں جانب از رفاقت بندگان عالی بر آمدہ رفیق کمپنی انگریز

شدہ ام وازدوستی وغیرخواہی جائے پرورش درکمپنی پیدا کردہ ام ازینجا بجائے دیگر نباید رفت۔

حرف نمکحرامی حضور کہ از سبب رفاقت کمپنی بر این جانب آمدہ است اگر خدا توفیق بدہد بوساطت نواب رکن الدولہ یا ظفر الدولہ مراسلات از حضور کردہ این حرف را از من باید برآورد۔

برائے حج وزیارت از طرف من کدام شخص صالح را مقرر کردہ باید فرستاد و قرضداری مردم کہ بطرف منست از آمدنی جاگیرات وغیرہ ادا باید کرد چوں برخوردار مرزا زین العابدین خورد سال است تا حین رشد بعد بلوغیت، نواب صاحب مشفق مہربان نواب جرأت جنگ بہادر را وصی و امین و اتالیق مقرر کردم۔ احتیاط و خبرداری درہمہ امورات خانگی و جاگیرات وغیرہ کردہ بعونہ تعالیٰ بعد رسیدن بحد بلوغ جملہ املاک و سامان و سرانجام مرزا زین العابدین بسپارند۔ تحریر فی تاریخ صدر۔"

اس وصیت نامے کے ساتھ انھوں نے اپنے جاگیرات کی سند کی نقل بھی شامل کی ہے، یہ سند حضرت آصفجاہ ثانی کی معطیہ ہے، نقل سند کو قاضی سید علی امجد کی مہر موثق کرتی ہے۔

اس سند کی رُو سے پرگنہ۔ ایٹ کوٹہ وغیرہ سرکار راج بندری صوبہ حیدرآباد مجمع کامل (الہ سالمہ) ہن قطب الدولہ حسن علی خاں انتظام جنگ کی جاگیر میں عطا ہوئے ہیں۔ (تعلقہ) (ضلع)

یہ سند ان کے وصیت نامے کے پہلے عطا ہوئی ہے۔ سند کے ساتھ دفتری کیفیت کی نقل بھی موجود ہے (جیسا کہ اس زمانے میں قاعدہ تھا) اس کیفیت پر حضرت آصف جاہ ثانی کی شرح تجویز کی نقل کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے:۔

"خاطر جمعدارند انشاء اللہ تعالیٰ این چار تعلقہ برشما تا اولاد احفاد برقرار خواہد بود۔"

اس سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث معاش قطب الدولہ کی صرف وہ معاش تھی جو ان کے حسب خواہش

ان کی اولاد و احفاد کے نام عطا ہوئی تھی۔ اس جاگیر کے علاوہ شمالی سرکار کے کئی تعلقے مثلاً مصطفےٰ نگر، ایلور، راج بندری وغیرہ بھی قطب الدولہ کی جاگیر میں تھے۔

اب مورخ دکن کے لیے یہ سوال دلچسپ اور تحقیق طلب ہوگا کہ سرکار کمپنی کی رفاقت نے اپنی رفاقت کا کیا صلہ دیا، اور قطب الدولہ کے بعد ان کی جاگیرات جو لاکھوں کی تھی کیا حشر ہوا؟

نصیر الدین ہاشمی

واردات

یاد میں ان کی جیے جاتا ہوں　　دہر میں نام کیے جاتا ہوں

اور کیا دہر سے ملتا مجھ کو　　غم کے کچھ داغ لیے جاتا ہوں

اس قدر ہے تری رحمت کا یقیں　　جرم پر جرم کیے جاتا ہوں

جیسے آئیگی نہ اب فصلِ بہار　　یوں گریباں کو سیے جاتا ہوں

زندگی موت سے بدلی کاوشؔ
میں بہرحال جیے جاتا ہوں

کاوشؔ

مبداءِ حیات

"جو طیلسانئین عثمانیہ کی چھٹی سالانہ کانفرنس میں پڑھا گیا"

ہماری زندگی کے بہت سے مسائل ایسے ہیں، جو عقلی جستجو سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم قدیم زمانے سے زندگی کے تمام مسایل پر خواہ وہ عقلی ہوں یا نقلی، روایتی انداز میں غور کرکے مذہب کی طرح ایقان کا ایک جزو بنانے کے عادی ہوگئے ہیں۔ انھیں میں ایک حیات اور اس کے مبداء کا مسئلہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ قدیم خیالات کے حامی اس پر ناک، بھوں چڑھائیں گے کہ مبداءِ حیات کا سوال ہی کیوں اُٹھایا گیا! وہ تو صرف اتنا جاننا کافی سمجھتے ہیں کہ خدا نے انسان اور دوسری جان دار مخلوق کو اپنی قوت "کُن فیکون" سے پیدا کردیا۔ ایک سائنس داں کو پورا یقین ہے کہ کائنات کی تخلیق میں پہلے بر قیے ارتقائی منزلوں کو طے کرکے جوہر بنے، اور اس کے بعد ان جوہروں نے مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔ سادہ جوہروں سے مرکب سالمات پیدا ہوئے، اور بالآخر، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص طریقے سے، جس کو "پُراسرار" کہنا چاہیئے، زندہ مادے کا ظہور ہوگیا۔ اس لیے مبداءِ حیات کا سوال یہاں خود بہ خود پیدا ہوجاتا ہے۔ چارلس گبسن کے الفاظ میں:۔

> "ایک عالمِ حکمیات، خالق کو اس کی کائنات سے جُدا کرنا نہیں چاہتا،
> بلکہ وہ صرف ان طریقوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے جن سے خالق کائنات نے
> فطرت میں گُل کاریاں کی ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ ابتدائے حیات کے مسئلے پر، انسان عرصے سے غور کرتا رہا ہے۔ قدیم مصری آفتاب کو مبدءِ حیات سمجھتے تھے۔ ہندی آریاؤں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ آفتاب سرچشمۂ حیات ہے۔ چنانچہ اسی لیے وہ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ سب سے پہلے، ایک یونانی حکیم تھالیس نے ۶۴۰ء ق م میں اس مسئلے کو چھیڑا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ کائنات کی تمام اشیاء کا اصل مبدا، صرف پانی ہی ہو سکتا ہے، لیکن اس طریقۂ استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو پانی کی ترکیب معلوم نہ تھی، اسی طرح ۵۵۰ ق م میں ایک اور حکیم نے ہوا کو توانائی اور حیات کا اصل منبع قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک خیالِ خام سے زیادہ نہیں ہے، اسی طرح اور یونانی حکماء نے اپنی خیال آرائیاں کیں، مختلف عناصر اور مرکبات کو مبدء حیات سمجھتے رہے، لیکن ان خیالات کی اب صرف تاریخی اہمیت رہ گئی ہے، البتہ ان مباحث سے ایک فایدہ یہ ضرور ہوا کہ متجسس آنکھوں کے سامنے تحقیق و تدقیق کے کئی راستے کھل گئے۔

اس تحقیق کی دوسری منزل ۱۸۳۹ء ہے جبکہ دنیا خلیوں کی کائنات سے روشناس ہوئی، خلیوں کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک قدرتی ساخت ہوتی ہے۔ یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے۔ ان کی شکل شہد کی مکھی کے چھتے کی سی ہوتی ہے۔ ہر خلیہ (یا cell) ایک جھلی سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ خلیے کے اندرونی حصے میں ایک رقیق دانہ دار مایع ہوتا ہے، اس کو "نخرمایہ" یا ابتدائی جان دار مادہ کہنا چاہیئے۔ نخرمایہ (یعنی protoplasm) کے بیچ میں ایک اور جسم ہوتا ہے جو رنگوں کو آسانی سے قبول کرنے کی وجہ سے گہرے رنگ کا نظر آتا ہے، اور اس کو مرکزہ (یا nucleus) کہتے ہیں تمام پودوں اور جانوروں کے جسم انھی خلیوں کے بنے ہوتے ہیں اس انکشاف کے بعد سائنس دانوں کا خیال ہوا کہ یہ خلیہ ہی زندگی کا پہلا جزو، یا اکائی ہے۔ اسے ایک مکمل جان دار عضویہ سمجھا جا سکتا ہے جو حیات کے جملہ افعال انجام دیتا ہے۔ چنانچہ امیبا، اور کلامیڈوماناس، دو یک خلوی عضویے ایسے ہیں جو جملہ حیاتی افعال انجام دے لیتے ہیں۔

اگر ہم اس حقیقت کا پتا لگانا چاہیں کہ جان دار سے بے جان کی کیسے ابتدا ہوئی، تو ہم کو پہلے ایک تعریف کی تلاش کرنی چاہیئے۔ جان دار، یا ذی حیات کے کیا معنے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ "حیات" ہمیشہ کاربن سے مشہور عنصر کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاربن کا، چند اور عناصر، یعنی نائٹروجن، ہیڈروجن اور آکسیجن کے ساتھ مل کر مرکب بنانا ضروری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ "حیات" مقناطیسیت اور تاب کاری (Radio-activity) کی طرح تمام جواہر میں پوشیدہ ہے۔ یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ "حیات" ایک پُر اسرار شئے ہے جس کے ظہور کے لیے مادّے اور توانائی کا ملاپ ضروری ہو۔ بات یہ ہے کہ کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں جس کو ایک عالمِ حیاتیات، ذی حیات اشیاء سے مخصوص کر سکے، اور جس کا اطلاق

بے جان مادے پر بالکل نہ ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک عضویہ (یعنے Organism) اپنی طرح کے اور عضویوں کی تولید کر سکتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں نمک کا ایک قلم بھی، جو ایک بے جان چیز ہے، یہ کام کر سکتا ہے یا ایک مجروح غوک بچہ (یا Tadpole) اپنی نئی دُم پیدا کر لے سکتا ہے، لیکن ایک منتشر جوہر (یعنے Mutilated atom) بھی اپنی اصلی حالت پر واپس آ سکتا ہے۔ ابتدائی آبی حیوان امیبا، بیرونی محرکات سے متاثر ہوتا ہے تو ایک گیسی سالمہ بھی بیرونی محرکات جیسے برقی اور مقناطیسی میدان کے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ انسان اور آبی حیوان پیرامیشیم، دونوں سانس لیتے ہیں، لیکن کچھ بے جان اجسام بھی ہیں جو آکسیجن استعمال کرتے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی بیکٹیریا جراثیم ہیں جو بغیر آکسیجن کے زندہ رہتے ہیں۔ بہرحال حیات کی کوئی مخصوص پہچان نہیں، اور نہ کوئی ایسا موزوں امتحان ہے جس سے تمام صورتوں میں اس کی تمیز ہو سکے۔ حیات کی تعریف اس طرح نہیں کی جا سکتی جیسے کہ ایک چوہے یا مُنّے کے متعلق ہو سکتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کی کیفیات سے آشنا ہیں، اور اس لیے اس کو پہچان سکتے ہیں۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ چوہا ایک زندہ حیوان ہے، اس کے پیر کاٹ ڈالیے تو بھی چوپایہ دستور زندہ رہتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس کو چیر کے اس کے دل کو نکال لیں اور اسے اس کے مخصوص ماحول کے اندر کسی آلے میں رکھیں تو کئی مہینے تک چوہے کا یہ عضو زندہ رہ سکتا ہے۔ اس پورے عضو کو نکالنا بھی ضروری نہیں۔ دل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو کاٹ کر مناسب اور موافق حالات کے تحت، ایک غذا رساں محلول میں رکھیں تو بافت کا یہ جزو اپنے کُل سے علیحدہ ہونے پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

خوردبین سے معلوم ہوتا ہے کہ بافت (یا Tissue) واحد اکائیوں کا مجموعہ ہے، اور نازک جھلیوں کی دیواروں کے اندر چھوٹے چھوٹے سریشی مائع کے قطرے پائے جاتے ہیں۔ بافت کا ہر فرد ایک زندہ خلیہ ہے۔ اور یہ کہنا غالباً صحیح ہوگا کہ بافت کے ہر فرد کو شیشے کے برتن میں خاص محلول کے ساتھ نہ صرف زندہ رکھا جا سکتا ہے، بلکہ اس میں نشو و نما بھی ہو سکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ خلیہ کو بافت سے، اس کی صحت مند حالت میں آسانی سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ بعض خلیے آزادانہ طور پر زندہ رہتے ہیں، چنانچہ خلوی پودوں اور جانوروں کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو اپنی چھوٹی سی کائنات میں تمام حیاتی افعال پورے کر لیتے ہیں۔ بافتی خلیے اسی قسم کے مخصوص فرد ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات یعنے اس کُل کو اعضا میں تقسیم کر کے

ہر عضو کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اعضا کی بافتوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، اور بافت انفرادی طور پر زندہ رہ سکتی ہے۔ بافتوں کی خلیوں میں تقسیم ہو سکتی ہے، اور ہر منفرد خلیہ زندہ رہ سکتا ہے۔

یہاں مبداء حیات کے سوال میں یہ دیکھنا ہے کہ آیا متذکرہ بالا بحث اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کافی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک خلیہ کا جزو بھی انفرادی طور پر زندہ رہ سکے؟ یا کیا ہم خلیہ کی مزید تقسیم کر سکتے ہیں، یا خلوی کل میں کوئی ایسا جزو تلاش کر سکتے ہیں جو دوسرے اجزا کی نسبت زیادہ "زندہ" ہو، کوئی اور چھوٹی وحدت جو اس پوشیدہ شعلۂ حیات کی چنگاری ہو، یا مختصر الفاظ میں، وہ جگہ جہاں سے حیات کی ابتدا ہوتی ہو؟

یہ ایک دلچسپ، لیکن مشکل سوال ہے۔ یہاں چند جدید تحقیقات، اور ان مختلف کوششوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنی ضروری ہے جو اس سوال کو حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

(۱)

طاقتور خوردبین سے کسی خلیہ کا معاینہ کیا جائے تو یہاں ان گنت تبدیلیوں کی ایک دُنیا نظر آتی ہے۔ خلوی دیوار کی نازک پرت میں تخم مایہ (یا پروٹو پلاسم) بہتا اور گردش کرتا ہے، غالباً یہ زندہ مادے کی حرکت ہے۔ لیکن اس متحرک مادے کے علاوہ خلیہ میں چند غیر متحرک چیزیں بھی ملتی ہیں۔ وسط میں ایک کروی یا بیضوی شکل کا حصہ ہوتا ہے جو اپنے آس پاس کے مادے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، یہ اندرونی تخم مایہ خلوی مرکزہ ہے جو خلیہ کا سب سے اہم جزو ہے اور یہ خلیے کے تمام معاملات پر قابو رکھتا ہے۔ اور جو مائع اس کو گھیرے ہوئے ہے خلیہ مایہ (Cytoplasm) کہلاتا ہے۔ یہ مرکزہ بیکٹیریا (یا جراثیم)، بعض لجی (یعنے ابتدائی سبز پودے) اور پستانی خون کے سُرخ جسیموں کو چھوڑ کر باقی تمام قسم کے خلیوں میں واضح طور پر پایا جاتا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ خلیہ کو مارے بغیر خلوی دیوار میں سُوراخ کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خلیہ کو مارے بغیر خلیہ مایہ (Cytoplasm) کا بیشتر حصہ نکال لیا جائے۔ اصل میں اس نقصان کی تلافی نئے خلیہ مایہ کی تیاری سے ہو جاتی ہے۔ غو کچہ کی طرح ایک خلیہ بھی اس قابل ہوتا ہے کہ محدود تولید کر سکے، لیکن اگر مرکزہ کو ضرر پہنچایا جائے تو صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ اندرونی حصہ نہایت اہم اور ضروری ہے، اس کے کسی حصے کی علیحدگی بھی خلیہ کی زندگی کو ختم کر دیتی ہے۔

اگر ہم تخم مایہ یا پروٹوپلاسم کے مخصوص حصوں کو جنہیں (Germ cells) نابت خلیے یا تناسلی خلیے کہتے ہیں منتخب کرلیں تو مرکزہ کی اس اہمیت کو تجربے سے سمجھا سکتے ہیں، غالباً یہی، یعنے مادہ کے (Egg cells) بیضوی خلیے اور نر کے (Sperm cells) یا منوی خلیے دورِ ارتقا میں حیات کے مخصوص حامل ہو گئے۔ چند سال پہلے یہ تحقیق ہوئی تھی کہ کسی بیضے (مثلاً Sea urchin کے بیضے) پر نمک کے محلول، یا اس میں سوئی چبھانے کے عمل، یا کسی اور میکانکی عمل سے خلیہ میں مصنوعی طور پر اپج پیدا کی جا سکتی ہے، اور وہ نمو پاکر ایک نیا (Sea urchin) بن جاتا ہے۔ یہاں بیضہ کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں کہ ایک نصف مرکزہ (یعنے Nucleus) آجائے اور دوسرا نصف بغیر مرکزے کے رہے۔ وہ نصف جس میں مرکزہ موجود ہے بار ور ہو سکتا ہے اور دوسرا عقیم رہ جاتا ہے۔ بعض حیوانوں کی صورت میں جن میں مرکزہ بیضے کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہوتا ہے، مرکزے کو نکال دینے سے بیضے کی جسامت میں زیادہ فرق تو نہیں ہوا، لیکن ایسے بے مرکزہ بیضے میں تولیدی قابلیت باقی نہیں رہی۔

عموماً قدرت میں (Sperm) یا منویہ کے بیضے (Egg) میں دھنس جانے سے باروری ہوتی ہے۔ منویہ (Sperm) مرکزے سے پیوست ہوتا، اور اسی میں مل جاتا ہے (Sperm cell) منوی خلیہ بہت زیادہ چھوٹا ہوتا ہے، اور ایک مرکزی سر، اور (Cytoplasm) کے ایک چھوٹے باریک تاگہ نما حصے پر مشتمل ہوتا ہے۔ اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود یہ منوی خلیہ (Sperm Cell) اپنے اجداد کی تمام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، جو بعد کو بچہ میں نمودار ہوتی ہیں۔

یہاں ایسے بیضے کے متعلق جس میں سے مرکزہ نکال لیا گیا ہو، ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منوی خلیہ (Sperm cell) شعلۂ حیات کو اس بیضے تک پہنچاتا ہے یا نہیں؟

جب بیضے کا صرف ایک حصہ جو خلیہ مایہ (Cytoplasm) پر مشتمل تھا، اس کی اپنی نوع کے ایک منوی خلیے (Sperm cell) سے ملایا گیا تو تخم یا (Sperm) بیضے (Egg) کے اس ٹکڑے میں داخل ہوا، اور اس ادخال کے ساتھ ہی مرکزے کا مادہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ تجربے سے دیکھا گیا کہ بیضے کے ایسے حصے کی احیاء ہوئی، اس کی تقسیم ہونے لگی اور یہ نمو پاکر ایک نئے فرد میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرکزہ ہی حیات کا حامل سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ حیات پر کتنا قادر ہے اور اپنی چھوٹی سی جسامت کے ساتھ کتنی اہمیت

رکھتا ہے اس کا تذکرہ (J. Mueller) کی کتاب (Out of the Night) میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمام انسانی (Sperms) یا منویے اور بیضوں کے ضروری مادے کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ان کی جسامت ایک اسپیرن کی ٹکیہ کے برابر ہو جائے گی حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر مُلر کے بیان پر ذرا مشکل سے یقین ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ایسے مرکزوں کے متعلق قیاس کیا ہے جو تمام دنیا میں کروڑں اور اربوں کی تعداد میں انفرادی حیثیت سے واقع ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خلوی مادہ بہت پیچیدہ ہے، اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی اور اہم بھی۔

اس کی بعض پیچیدگیاں مناسب نوشبیہ (یعنے Stain) یا رنگوں کے استعمال سے) کرکے خوردبین کے ذریعے دیکھی جا سکتی ہیں۔ مرکزے کے اعضا کا اچھی طرح مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کروموسومز، جو چھوٹی چھوٹی مختلف شکل کی ساختیں ہیں، نظر آتے ہیں۔ کروموسومز صرف تناسلی یا ثابت خلیوں ہی میں نہیں بلکہ جسدی خلیوں (یعنے Somatic or Body Cells) میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہر خلیہ میں ان کی ساخت ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔

پودے اور حیوان کی ہر نوع میں ان مرکزی اعضا (یعنے Nuclear organs) کی ایک تمثیلی تعداد ہوتی ہے اور ہر ایک میں مخصوص شکل، سائز اور ترتیب ہوتی ہے۔ اناج کے خلیوں میں بیس کروموسومز ہوتے ہیں۔ لیلی (Lily) کے خلیوں میں چوبیس، مینڈک میں چھبیس، انسان میں اڑتالیس اور گھوڑے میں ساٹھ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ہاتھی اور وہیل جیسے بڑے جانوروں میں کروموسومز کی کیا تعداد ہوتی ہے جو انسان کے کروموسومز کی، یعنے اڑتالیس لیکن جنوبی امریکہ کے بندروں کی صورت میں تھوڑا سا فرق ہے ان میں کروموسومز کی تعداد چوّن ہوتی ہے۔

ان خوردبینی مرکزی اجسام، اور مسئلہ وراثت میں تعلق کی دریافت بیسویں صدی کی تحقیقات میں سے ہے۔ (Thomas Hunt Morgan) پر متعدد تجربے کیے گئے پھل مکھیوں (fruit flies) اور ان کے ساتھیوں نے جو کولمبیا یونیورسٹی میں تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں ان چھوٹے حیوانوں کی جن کا نام Drosophila Melanogaster ہے) بوتلوں میں پرورش کی۔ ان کے نمو اور تولید کے لیے مقدور بھر مناسب حالات فراہم کیے اور کئی پشتوں تک ان کی ایک ہی نسل کو برقرار رکھا۔ جیسے ہی نئی مکھیاں پیدا ہوتیں، یہ ماہرانِ حیاتیات ہر نو عمر فرد کا مطالعہ کرتے کہ کسی قسم کی تبدیلی ان کی طبعی خصوصیات میں تو

نہیں واقع ہوئی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھوں نے مختلف تبدیلیاں دیکھیں۔ مثال کے طور پر ڈروسوفائلا کی ابھری ہوئی آنکھیں عموماً سرخ ہوتی ہیں لیکن کبھی ان سے سفید آنکھ والے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔

(Morgan) اور اس کے ساتھیوں نے ان ناگہانی تبدیلیوں (Mutations) کی توجیہ اس تبدیلی سے کی جو مکھی پیدا کرنے والے بیضے کے کروموسومز کے ایک مخصوص حصے میں واقع ہوتی ہے۔ بعد کو انھیں معلوم ہوا کہ (wings) پروں میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ عملاً مکھی کی ہر خصوصیت میں بیسیوں اختلافات ہوتے جاتے ہیں۔ غرض ان تمام طبعی تبدیلیوں کی توجیہ اُن لوگوں نے اس طرح کی کہ کروموسومز میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر ملر کے شعاعی عملوں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ملر نے بتلایا کہ مکھیوں پر لاشعاعوں کا عمل کریں تو ناگہانی تبدیلیوں (Mutations) کی رفتار طبعی حالت کی نسبت بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس سے کروموسومز کے مخصوص حصوں اور کروموسومز سے پیدا ہونے والی مکھیوں کی طبعی خصوصیات میں راست رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ ان چھوٹے خلوی اعضا میں شعاعوں کا ادخال تخریبی بھی تھا اور تعمیری بھی۔ بعض صورتوں میں کروموسومز کے ایک حصے کو سخت صدمہ پہنچا، اور وہ بالکل غایب ہوگیا، اور بعض میں اس حصے کے دوسرے کروموسومز سے مل جانے سے ایک غیرطبعی جسامت اور شکل کی نئی ساخت پیدا ہوئی۔ دوسرے تجربوں میں کروموسومز کی دو دو حصوں میں تقسیم کی گئی اور ایک کے نصف کی جگہ دوسرے کا نصف رکھا گیا، اس طرح نئی مخلوط شکلیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس طرح کے تمام تجربوں کے نتیجے کے طور پر سائنس دانوں کو یہ خیال ہوا کہ کروموسومز سادہ مسلسل کُل (Simple continuous wholes) نہیں ہیں بلکہ ان کی پیچیدہ قسم کی ایک دنیا ہے، جو نہایت چھوٹی تبدیل پذیر اکائیوں سے بنی ہوتی ہے۔ یہی اکائیاں جین (Genes) کہلاتی ہیں۔

کسی نے اب تک جین (Gene) کی شکل نہیں دیکھی۔ زیادہ طاقتور خوردبین کے عمل سے بھی اس کی وضاحت ناممکن سی ہے لیکن جس طرح مادہ کے کیمیاوی اور مناظری (Optical) پہلو کے لیے ہم جوہر (atom) جیسی اَن دیکھی چیز فرض کرلیتے ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ تخم مایہ یا پروٹوپلاسم کے نموی پہلو پر روشنی ڈالنے کے لیے اَن دیکھے جین (Gene) کا وجود بھی فرض کرلیں۔ جین ایک واحد ساخت ہے جو جوہرِ وراثت ہے۔

لیکن یہی ہمارا حاصل نہیں موجودہ تحقیقات سے ایک اور بنیادی حقیقت کا پتا چلتا ہے۔ تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ جین کو نقصان پہنچانے سے خلیہ بھی بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے بعض جین (Genes) ضائع ہوجائیں تو موت بھی واقع ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خلیہ کے افعال میں جین (Gene) کا فعل صرف وراثت پر قابو حاصل کرنا ہی نہیں، بلکہ حیات کو قبضے میں رکھنا بھی ہے۔

۲

جین کی حیاتی اہمیت کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر (Demerec) کے سر ہے، وہ (Carnegie Institution of Washington) کے Geneticist ہیں۔ چند سال سے ڈاکٹر دیمیرک، ڈروسوفائلا مکھی کی تولیدی قوت پر ناگہانی تبدیلیوں کے اثرات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی آف ٹکساس (Texas) کے تجربوں سے بھی فایدہ اُٹھایا۔ اس جین کی جسامت کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں لیکن اس مسئلے کو حل کرنے کا غالباً یہ اچھا طریقہ ہے کہ کروموسوم میں جین (Genes) کی تعداد معلوم کی جائے اور کروموسومی مادے کے طول کی اس جین کی تعداد سے تقسیم کی جائے اس سے ایک اوسط قیمت حاصل ہوجاتی ہے۔

یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جین کی تعداد کروموسوم میں ان مقامات کی تعداد کے متناسب ہوتی ہے جہاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ڈروسوفائلا پر تجربے کرکے معلوم کیا گیا ہے کہ ایسے مقامات تین ہزار ہیں۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہر خلیہ میں تقریباً تین ہزار جین (Genes) ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹکساس کے ڈاکٹر (Painter) نے ۱۹۳۲ء میں جین (Genes) کی تعداد معلوم کرنے کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا۔ انھوں نے پھل مکھی کے لعابی غدودوں پر تجربے کیے۔ یہ غدود کافی بڑے خلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر Painter نے معلوم کیا کہ ان خلیوں کے کروموسوم میں جین زنجیر کی شکل میں ہوتے ہیں۔ کروموسوم کی ہر پٹی بہ ذات خود جین نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی جین gene کے حامل ہیں اور ڈاکٹر پینٹر کے الفاظ میں: "یہ پٹی وہ مقام ہے جس میں جین رہتا ہے۔" لہٰذا ان پٹیوں کی تعداد معلوم کرلینے سے جین (gene) کی تعداد معلوم ہوجاتی ہے۔ (Calvin B. Bridges) اور مکرو غیرہ نے ان پٹیوں کی تعداد معلوم کی ہے، لیکن ہم یہاں (Bridges) کی گنتی کو لیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ڈروسوفائلا مکھی کے خلیے میں تقریباً پانچ ہزار جین ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک جین کروموسومی مادے کے $\frac{1}{5000}$ حصے کے برابر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حیات کی اس اکائی کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا ایک دلچسپ جواب ڈروتھی ایم رینچ Dorathy M. Wrinch کے تجربوں میں ملتا ہے، وہ کروموسومز کو خاص قسم کے پروٹینی سالموں کے متعدد رشتک سمجھتے ہیں، لیکن عام طور پر Geneticists ذرّے کے تخیل پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ڈیمرک جین Gene کو ایک نامیاتی ذرّے کی شکل میں پیش کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ ایک واحد بڑا سالمہ ہے، اس سالمے کی ساخت ایک پیچیدہ مرکب پر مشتمل ہے جسے Nuclear Proteins کہتے ہیں یہ مرکب (Thymo-Nucleic acid) کے کیمیاوی تجزیئے سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا ایک سالمہ ہیڈروجن۔ کاربن۔ آکسیجن۔ نائٹروجن اور فاسفورس کے جملہ (۱۵۳) جوہروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اکثر دیشتر کسی ایک جوہر کے نقصان سے بھی جین Gene کی ساخت بالکل بدل جاتی ہے، اس کا دوہرا ہونا (Duplication) ناممکن سا ہو جاتا ہے اور اس سے خلیہ کی تقسیم بھی اکثر صورتوں میں رُک جاتی ہے۔

غرض ہم اس طرح نخز مایہ تک پہنچتے ہیں جہاں ایک چھوٹی سی وحدت غیر معمولی طور پر اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی وحدت پر ہی جین (Gene) کے افعال کا دار و مدار ہے۔ جین کی غیر موجودگی میں کروموسومز بے کار ہو جاتے ہیں، اور پھر کروموسومز معطل ہو جائیں تو خلیہ ہی باقی نہیں رہتا، وہ اپنے افعال انجام نہیں دے سکتا، اس کا نمو رُک جاتا ہے، تولید بند ہو جاتی ہے اور حیات باقی نہیں رہتی۔ اب اگر جین کے افعال پر حیات کا دار و مدار ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم حیات کے متعلق یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی ابتدا جین (Gene) کی حرکت سے ہوئی؟

جین کی اس حرکت کے تین نتایج یقینی ہیں:۔

(۱) یہ کہ جین Gene دوہرا ہو جاتا ہے

(۲) یہ کہ جین (Gene) میں کبھی ناگہانی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں

(۳) یہ کہ جین (Gene) کو اپنے امتیازی طبعی خصوصیات پر قابو رہتا ہے اور ان کو وہ اپنی اولاد میں منتقل کرتا ہے

لیکن یہ تمام مظہر جین کے گروہوں ہی میں دیکھے گئے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ہم جین کو گنجان کروموسومز میں ان کی حرکات سے جان سکے ہیں۔ ایک واحد جین میں جو اپنے گروہ سے علحدہ کر دیا گیا ہو یہ مظہر دیکھنے میں نہیں آئے۔ چنانچہ ڈاکٹر B.M. Dugg کا خیال ہے کہ ایک واحد جین برباد کن ہی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں (Virus) تذکرہ بھی کیا ہے۔

وائرس (Virus) کا وجود کوئی چالیس برس سے معلوم ہے، اور عرصے سے یہ خیال ہے کہ وائرس (Virus)
سب میں اولین زندہ شے ہے۔ گذشتہ تین سال کے عرصے میں اس پر بہت کچھ کام ہوا ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر
(Wendell M. Stanley) کے تجربات بہت اہم ہیں، ان کے تذکرے کی یہاں گنجائش نہیں،
لیکن ان کا حاصل یہ ہے کہ وائرس (Virus) کی ماہیت کے متعلق ہم کو بہت سے قیمتی معلومات
ملتے ہیں۔ مختلف بیماریوں جیسے فالج، انفلوئنزہ، زرد بخار (Sleeping Sickness) وغیرہ اور نیز
بہت سی پودوں کی بیماریوں کا سبب یہی وائرس ہیں۔ ڈاکٹر (Stanley) نے متعدد بار وائرس کو
قلمایا، خوردبینی مطالعے میں چمک دار سُوئی نما ساختوں کا ایک تودہ نظر آتا ہے، ان میں کی ہر سُوئی کو ایک وائرس
نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ جس طرح شکر کا ہر قلم شکر کے متعدد سالموں پر مشتمل ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح ان قلمی شوکوں
(Spikes) کا ہر فرد پروٹین کے لاکھوں سالموں کا ایک گچھا ہے اور ہر سالمہ ایک واحد وائرس ہے۔
(Stanley) کے کیمیاوی تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وائرس (Virus) کا سالمہ کاربن۔
ہیڈروجن۔ نائٹروجن، اور آکسیجن پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس میں گندک اور فاسفورس نہیں ہوتی۔ اس سالمے میں کاربن۔
ہیڈروجن وغیرہ کے جوہروں کے تناسب اور سالمے کی ساخت کے متعلق ابھی تحقیقات جاری ہیں۔

وائرس Virus کے متعلق Stanley کے تجربوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں جان دار اور بے جان
دونوں کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں، غالباً وائرس کے سالمے کی دو حیثیتیں ہیں، وہ زندہ ہے بھی اور نہیں بھی، زندہ مناسب
ماحول میں جو اس کے لیے مفید ہو، اور بے جان کبھی دوسرے ماحول میں وائرس کی دریافت اور اس کے خواص کا مطالعہ
ہماری صدی علم حیاتیات کی سب سے بڑی ترقیوں میں سے ہے۔

۳

قلمائے ہوئے وائرس (Virus) کا چھوٹا سا ٹکڑا تمباکو کے پتے پر ڈال دیا جائے تو پورا پودا
بیمار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ تمباکو کا پورا کھیت اس سے متاثر ہوتا ہے، اس بیماری کا نام Mosaic Disease ہے،
اس کے (Mosaic proteins) اکثر باتوں میں جین (Gene) سے مشابہت رکھتے ہیں، دونوں کی
تقریباً ایک ہی جسامت ہوتی ہے، دونوں سالمے ہیں جو خاص ماحول میں اپنے کو دوہرا سکتے ہیں، دونوں اپنی اس تولید کی
خاصیت کو عرصہ دراز تک ملتوی رکھ سکتے ہیں اور مناسب ماحول مل جانے پر ان میں تولید کی خاصیت پھر ظاہر

ہو جاتی ہے۔ جین (Gene) بعض اوقات غیر قیام پذیر ہوتے ہیں اور (Stanley) نے اپنے
قلمی پروٹین میں بھی کچھ اسی طرح کی خاصیت دیکھی ہے Carnegie Institution of Washington کے
ڈاکٹر Oscar Riddle نے جین اور وائرس کے تعلق پر دلچسپ تجربے کیے، ان کا خیال ہے کہ
جین، وائرس کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ عضویوں کی نمایندگی کرتا ہے لیکن یہاں بھی :-

"فرد قایم ضبط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں"

ایک جین (Gene) تنہا کچھ نہیں ڈاکٹر Riddle کے خیال میں ایک واحد جین کوئی فعل انجام نہیں
دیتا، یہی نہیں بلکہ وہ ایک واحد جین کو ذی حیات سمجھنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ Stanley بھی اپنے
قلمی پروٹین کے متعلق کچھ ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔

ازوٹوبیکٹر (Azotobacter) نامی ایک جرثومہ ہے، جو زمین کے اندر رہتا ہے، وہ
سانس لیتا ہے اور اپنے ماحول سے غذا حاصل کرتا ہے، وہ نشو و نما پاتا، اور اپنی تعداد کو بڑھاتا جاتا ہے چنانچہ
اس کو تمام علما، حیاتیات متفق طور پر ذی حیات سمجھتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ ازوٹوبیکٹر میں ایک اور
اہم و دلچسپ خاصیت پائی جاتی ہے، وہ آزاد ہوا سے نائٹروجن حاصل کرتا ہے، اور زمین سے بعض کیمیاوی
مادّوں کو جذب کرتا ہے، ان مادّوں اور نائٹروجن کے امتزاج سے وہ عجیب و غریب طریقے پر امونیا بناتا ہے۔
اس سے امائنو ترشے اور پھر ان سے پروٹین بنتے ہیں، یہ چیز حیات کے لیے بہت ضروری ہے کیوں کہ بغیر پروٹین کے
تخمِ مایہ، یا پروٹوپلاسم حاصل نہیں ہوتا۔ پروٹین بنانے کی قابلیت ہی حیات کا ثبوت ہے۔

ماسکو کی (Academy of Sciences) میں تین روسی کیمیادانوں نے حال ہی میں
ازوٹوبیکٹر پر متعدد تجربے انجام دیے ہیں، ان کے نام (A. M. Bach، Z. V. Yermolieva اور
M. P. Stepanian) ہیں انھوں نے تھوڑے سے بیکٹریا کو شیشے کے برتن میں لے کر شکر سے ان کی پرورش کی،
اس سے وہ امونیا کی قلیل مقدار حاصل کرسکے اس کے بعد ان کیمیادانوں نے جراثیم کو اکٹھا کرکے کوٹا، پیسا اور
دباؤ کے تحت ان سے ایک رس حاصل کیا، اس بیکٹریائی مادّے کو خوب چھان لیا، صاف شفاف عطر میں انھوں نے
شکر ملایا اور ہوا کی تھوڑی سی مقدار محلول میں سے گزاری، مقطر میں جیسا کہ ان کا بیان ہے، کافی مقدار میں
امونیا پیدا ہوگئی یہاں بے جان رس میں کوئی پوشیدہ چیز وہ کام کر رہی ہے جس کو کہ بیکٹریا نے انجام دیا تھا۔

پروفیسر Bach اور ان کے ساتھیوں نے اس واقعے کی توجیہ اس طرح کی کہ

زندہ (انوبیکٹر) میں نائٹروجن کی تثبیت ایک خامرے (یا Enzyme) کی بدولت ہوتی ہے۔ خامرہ یعنی خمیر پیدا کرنے والا مادہ حامل (یا Catalyst) ہے، اور حامل ایک ایسا مادہ ہے جس سے دوسرے مادوں کے آپس میں تعامل میں مدد ملتی اور تعامل کی رفتار تیز ہوتی ہے لیکن وہ خود تعامل سے متاثر نہیں ہوتا۔ روسیوں کا خیال ہے کہ ان کے تجربے میں مقطر کے ساتھ وہ نامیاتی حامل آجاتا ہے اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ حامل اتنی ہی قوت سے شیشے کے برتن میں اپنا عمل کرتا ہے جتنا کہ قدرت میں جاندار عضویے کرسکتے ہیں۔

حیات کی تعریف غالباً یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ مادے کی تنظیم کے لیے ایک اسٹیج ہے از وٹو بیکٹر (Azotobacter) سے انسان تک حیات کا تدریجی ظہور عضویوں کے ایک مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے جو بہت پیچیدہ طریقے پر واقع ہوا ہے، ٹھیک اسی طرح مادے میں (protons) سے شروع کرکے متعدد برقی ذرات کا ظہور جس سے جرثومہ کی پیدائش عمل میں آئی ہے، ایک پُراسرار اور پیچیدہ طریقے سے ہوا ہے۔

(Protons) اور (Neutrons) اپنے اطراف کے برقیوں (Electrons) کے ساتھ جوہر بناتے ہیں، لیکن جوہروں میں کسی صورت میں بھی حیات نہیں مانی جاسکتی۔ جوہروں سے سادہ مرکبات کے سالمے بنتے ہیں جیسے پانی، نمک وغیرہ کے سالمے لیکن ان حاصل مرکبات میں بھی حیات کا پتا نہیں چلتا۔ قدرت میں ان سادہ سالموں سے زیادہ پیچیدہ سالمے بنتے ہیں، جیسے شکر اور دوسرے کاربوہیڈریٹ۔ چربیاں اور دوسرے ہیڈروکاربنز، اور کسی خاص طریقے پر جو ہر آپس میں مل کر حامل (Catalyst) پیدا کرتے ہیں جن میں خامرے (یا Enzyme) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ابتدا میں حامل سے امائنو ترشے بنتے ہیں اور پھر ان سے پروٹین۔ سادہ پروٹین۔ پیچیدہ پروٹین میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر دو بڑے سالموں کے گروہوں کی شکل میں آپس میں مل جاتے ہیں اور کسی پُراسرار طریقے پر اولین جین (Gene) پیدا کرتے ہیں۔ یہ بڑے سالمے زنجیرے کی شکل میں ایک دوسرے سے متعلق ہوجاتے ہیں اور اس طرح کروموسوم بناتے ہیں، اُن کے خواص کا ظہور ہوتا ہے، ان کا آپس میں الحاق بڑھتا جاتا ہے، ہر فرد دوہرا ہوتا، تقسیم پاتا، اور اس طرح اپنی تعداد اضافہ کرتا جاتا ہے، پھر اُس کل میں داخل ہوتا ہے جو مسلسل طور پر حرکت میں ہے، اُس طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے ہم 'حیات' کہتے ہیں۔

یہاں اُس اعلیٰ مقام کا پتا لگانا مشکل ہے جو 'حیات' کا مبدء ہے، لیکن شاید ایسا سمجھنا قرین قیاس

ہوسکتا ہے کہ غیر ذی حیات میں حیات کی ابتدا پروٹین بنانے والے عامل (Catalyst) کے ظہور سے ہوتی ہے۔ جین (Genes) کو اولین زندہ وحدت سمجھا جاسکتا ہے اور وائرس (Viruses) حیات کے سب سے قدیم اور اولین خوشہ چیں (Precursor) تصوّر کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ خیال صحیح ہے کہ ان دونوں عضویوں میں سے کوئی بھی خامرے (Enzyme) سے قدیم تر نہیں۔ خامرے کو شاید "حیات" تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "حیات" کا خوشہ چیں ضرور ہے اور جس جگہ بھی وہ فاعل (active) بن جاتا ہے وہی "مبدء حیات" ہے۔

آجکل

ہر سو نشاط و کیف کا ساماں ہے آجکل
عالم تمام صبحِ بہاراں ہے آجکل

موجِ شراب زیست کا عنواں ہے آجکل
کونین غرقِ مستیٔ عصیاں ہے آجکل

قطرہ میں سلسبیل کی موجوں کا ہے فروغ
ذرّہ طلوعِ صُبحِ گلستاں ہے آجکل

لُطفِ نشاط کم نہیں ہوتا کسی طرح
ٹھیری ہوئی سی گردشِ دوراں ہے آجکل

فردا کی فکر ہے، نہ گذشتہ کا کوئی غم
دستِ جنوں میں ہوش کا داماں ہے آجکل

خود آرہے ہیں اُن کی طرف سے پیامِ شوق
اپنے کیے پہ حُسن پشیماں ہے آجکل

ٹھیرا ہوا ہے منزلِ عشرت پہ کارواں
قابو میں میرے عُمرِ گریزاں ہے آجکل

کہہ دو غمِ حیات سے فرصت نہیں مجھے
اُن کا خیال سلسلہ جُنباں ہے آجکل

وہ کیفیت کہ زیست کا حاصل کہیں جسے
ماہرؔ تری نظر سے نمایاں ہے آجکل

ماہر القادری

قانون بلدیہ اس کے اختیارات اور اثرات

قانون بلدیہ کے لحاظ سے مجلس بلدیہ حیدرآباد کو اگرچہ کہ اس کی ترکیب جداگانہ ہے بالکلیہ وہی اختیارات حاصل ہیں جو بلدیہ بمبئی کو حاصل ہیں جسے ہندوستان کی سب سے بڑی بلدیہ تسلیم کیا جاتا ہے موازنے کی ترتیب اور منظوری، تقررات اور علٰحدگی۔ جدید ٹیکس عائد کرنا وغیرہ ان سب امور میں بلدیہ بمبئی اور بلدیہ حیدرآباد بالکل مساوی الاقتدار ہیں۔

جہاں تک کہ ان امور کا تعلق ہے جو بہ موجب قانون بلدیہ مجلس بلدیہ انجام دے سکتی ہے، یا جن کا انصرام وہ اپنے صوابدید پر کرسکتی ہے۔ بمبئی میں بھی یہ امور کم وبیش وہی ہیں جو یہاں کے قانون میں موجود ہیں اسی طرح قانون بلدیہ حیدرآباد کی دفعات ۴۷ و ۴۸ ملاحظہ فرمائے جائیں جن میں مندرج ہے کہ:۔

"مجلس بلدیہ پر لازم ہے کہ ان سب امور کا مناسب اور معقول انتظام کرے، بجز اس کے کہ سرکار عالی نے کسی امر کا انتظام اپنے ذمہ رکھا ہو۔"

لیکن نفاذ قانون بلدیہ کے بعد سے سرکار عالی کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہیں ہوا کہ جس میں یہ صراحت رہتی کہ دفعہ ۴۷ میں مصرحہ کن امور کو سرکار عالی اپنے سے متعلق رکھنا چاہتی ہے محض عمل درآمد کے لحاظ سے جو امور بہ وقت نفاذ قانون بلدیہ دیگر سررشتہ جات انجام دے رہے تھے وہی عمل قایم رکھ کر وہ تمام امور بہ دستور ان ہی سررشتہ جات سے متعلق رہے، بلکہ فائر برگیڈ کی سررشتۂ کوتوالی کے تحت منتقلی عمل میں آئی اور محلہ جات کے نام رکھنے کی حد تک ذات شاہانہ کے ساتھ مختص کردیا گیا۔

نتیجہ یہ ہے کہ گو اقتدار کی وسعت کے لحاظ سے بلدیہ حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی بلدیہ کے مساوی ہے، لیکن کارفرمائی کا لحاظ کرنے بعض مضافاتی بلدیات برطانوی ہند کے مقابل بھی نہیں ہے۔

اس کے خلاف بلدیہ بمبئی وہ سب کام انجام دے رہی ہے جو بہ موجب قانون اس سے متعلق ہیں۔ ڈرینج۔

آب رسانی ۔ آرائش شہر ۔ انتظامات تدفین و تحریق ۔ نگرانی حیات و ممات ۔ چیچک براری ۔ امراض متعدی کا انسداد ۔ شفاخانے ۔ سینی ٹوریم ۔ مارکٹ ۔ مسالخ ۔ نگرانی تجارت اشیائے خورونوش و مضر و خطرناک ۔ فایر بریگیڈ ۔ تعمیر امکنہ و انہدام امکنہ خطرناک ۔ مانع گرد تعمیر شوارع وغیرہ ۔ برقی روشنی و آب پاشی شوارع ۔ شوارع کی نام رکھائی کے علاوہ ابتدائی تعلیم ۔ کتب خانے ۔ میوزیم ۔ چڑیا گھر ۔ باغ ۔ سڑکوں پر درختوں کی تنصیب ۔ پیمایش آراضی ۔ مردم شماری ۔ انتظامات موسیقی و بیانڈ نوازی اندرون حدود شہر بھی اسی سے متعلق ہیں ۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بلدیۂ بمبئی کے ساڑھے چار کروڑ موازنے میں حکومت بمبئی کی طرف سے کسی طرح کی گرانٹ یا امداد نہیں شریک ہے ۔ بلدیۂ بمبئی نے اپنے ہی صرفہ سے زمین دوز موریاں بنائی ہیں اور آب غلیظ کو سمندر میں بہا دینے یا اس کو صاف کرنے کے لیے انتظامات کا صرفہ بھی وہی برداشت کر رہی ہے ۔ آب رسانی کے لیے شہر سے (۲۶) میل کے فاصلے پر کئی کروڑ کے صرفہ سے اراضی حاصل کرکے تالاب کی تعمیر ۔ ڈبل پایپ لائین، اور ذخایر آب کا قیام کیا گیا ہے ۔ بلدی اراضیات پر قبرستان مسان دخمے قایم ہوئے ہیں، اور ان پر بلدی عملہ نگراں ہے ۔ خانگی قبرستان مسان بھی زیر نگراں ہیں ۔ حیات و ممات سے متعلقہ اعداد بہت ہی عمدگی اور وسیع طرز پر محفوظ رہتے ہیں ۔ ایسا ہی انتظام چیچک براری اور امراض متعدی کے انسداد کا ہے ۔ کنگ اڈورڈ میموریل ہاسپٹل جو بلدیہ کا اپنا شفاخانہ ہے ہندوستان کے سب سے بڑے دواخانوں میں ہے ۔ زچگی خانے میں مراکز اطفال کو امداد دی جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ایک میڈیکل کالج بھی قایم ہے ۔ امراض دق کے لیے سینی ٹوریم موجود ہے ۔ امراض خبایث کے لیے بھی جگہ جگہ مراکز علاج قایم ہیں ۔ حدود شہر میں کئی مارکٹ ہیں جہاں لاکھوں کا کاروبار ہوتا ہے ۔ خانگی مارکٹ بھی ہیں مگر زیر نگرانی بلدیہ ہیں ۔ مسلخ صرف ایک ہے اور حدود شہر سے دور قایم ہے ۔ ایسی نگرانی وہاں کی جاتی ہے کہ جس سے بہت اچھا گوشت شہر میں ملنا ممکن ہے ۔ مارکٹ میں کولڈ اسٹوریج قایم کرکے وہاں فروخت شدنی اشیاء کو دیر پا باقی رکھنا ممکن کیا گیا ہے، اور یہ سب باعث آمدنی ہے ۔ فایر بریگیڈ قایم ہے اور سارے ہندوستان میں ممتاز ہے ۔ ہر حلقے کے لیے فایر اسٹیشن ہیں اور کئی کئی انجن ہیں ۔ تعمیر امکنہ پر ایسی نگرانی ہے کہ مکان کا نقشہ بننے سے لے کر مکان میں قیام ہونے تک نگرانی رہتی ہے اور امکنہ محفوظ و دیرپا تعمیر ہونے کی طمانیت رہتی ہے ۔ سارے شہر میں مانع گرد سڑکیں بلدیہ نے ہی تعمیر کی ہیں ۔ سارے شہر میں روشنی شوارع بہ ذریعۂ گیاس یا بہ ذریعۂ قوت برقی ہوتی ہے، گو قوت خانہ بلدیہ کا اپنا نہیں ہے بلکہ اسے مقامی کارخانوں سے خریدا جاتا ہے ۔ ابتدائی تعلیم کے لیے چوتھائی کروڑ روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور دو حلقوں میں تعلیم جبری ہے ۔ ماسوا اس کے بہت سارے مدارس اور

تعلیمی اداروں کو امداد جاری ہے متعلموں کا طبی امتحان، ان کا معالجہ اور کشافی بھی رائج ہے وکٹوریہ گارڈن میں میوزیم اور چڑیا گھر بھی قایم ہے۔ شہر کی ہر جہتی پیمایش اراضی بلدیہ ہی سے ہوتی ہے۔

بالکل یہی حال بلدیۂ مدراس کا ہے۔ وہاں بھی یہ ساری مصروفیات بلدیہ کی جانب سے جاری ہیں۔ البتہ یہ فرق ہے کہ جملہ کارہائے سرمایہ کے لیے حکومت مدراس سے نصف رقم بطور عطیہ اور نصف رقم بطور گرانٹ ملتی ہے لیکن انجام دہی بالکلیہ بلدیہ کے ذمہ ہے چند ایک حلقوں میں ڈرینج ابھی ہوتا ہے۔ آب رسانی کے لیے حکومتی تالاب سے پانی بقیمت مقررہ حاصل کیا جاتا ہے، لیکن پایپ لائین فلٹر بڈ اور ذخائر آب بلدیہ کے ہیں۔ فایر بریگیڈ پر کوتوالی کی نگرانی رکھی گئی ہے، گویا کہ اشتراک عمل ہے۔ مانع گرد سڑکوں کی تعمیر بڑی حد تک تکمیل پا چکی ہے۔ ابتدائی تعلیم جبری ہے، غریب اطفال کو دوپہر کا کھانا مفت ملتا ہے۔ ایک ہائی اسکول بھی ہے۔ مراکز اطفال بلدیہ کے اپنے اہتمام میں قایم ہیں اور محلے محلے میں دواخانے ہیں۔ زچگی خاتون کو امداد دی جاتی ہے۔ روشنی سارے شہر میں قوتِ برقی سے ہوتی ہے جس کے لیے بلدیہ اپنے ذاتی ستون اور تار نیز ذیلی مراکز قایم کر رہی ہے تاکہ مجتمعاً قوتِ برقی یا تو مقامی ٹراموے کمپنی سے بہ دستور حاصل کی جائے یا حکومت مدراس سے ان کی تیار کردہ قوت لی جائے۔ حال حال تک بلدیہ کی اپنی نشتر گاہ بھی تھی۔

ان دو بڑے بلدیات کو چھوڑ کر بلاری اور مدورا کی بلدیات کی بابت بھی کچھ تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

بلاری میں آب رسانی بلدیہ سے ہی متعلق ہے۔ ڈرینج کی تعمیر سرکاری محکمے سے ہو رہی تھی اور بعد تعمیر وہ کام زیر نگرانی بلدیہ آرہا تھا، ان کے مدرسے بھی تھے اور نیز ان کا اپنا قوت خانہ تھا جہاں سے شہر بھر میں قوت فروخت کی جاتی اور سڑکوں پر روشنی ہوتی ہے۔ یہی حال مدورا کا بھی ہے۔ البتہ وہاں زچگی خانے بھی بلدیہ نے قایم کر رکھے ہیں اور بلدیات کی حد تک یہ اصول قایم ہے کہ کارہائے تعمیری جنھیں کارہائے سرمایہ کے طور پر انجام دلانا ہے حکومتی عملے کے ذریعے تعمیر پائیں، البتہ بعد تعمیر ان کو منتقل کر دیا جاتا ہے اور نصف رقم امداد نصف رقم قرضے کی شکل میں ایصال ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وسعتِ عمل کے لحاظ سے بلدیۂ حیدرآباد، مدراس و بمبئی تو کجا، ان صوبوں کی مضافاتی بلدیات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اگرچہ کہ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ گو وسعتِ عمل کے لحاظ سے بلدیۂ حیدرآباد، ٹری و نڈرم۔ ارنا کولم، اور میسور کی بلدیات کے مساوی ہے لیکن بہ لحاظ اقتدار محصلہ

بلدیۂ حیدرآباد ان تینوں مقامات سے فایق ہے مثلاً میسور میں ہلت افسر و انجنیئر کا تقرر ابتدائی منجانب حکومت ہوتا ہے، اسی طرح ٹری وینڈرم میں یہ دیکھا گیا کہ وہاں کا میونسپل کمشنر حکومت ٹراونکور کا ایک تحصیلدار ہے اور بہ لحاظ اپنے اختیارات و فرائض کے وہاں کی مجلس ہمارے ہاں کی سابقہ مجلس صفائی کے مماثل ہے یہی حال ارناکیلم کا ہے اور وہاں مثل سابقہ مجلس صفائی حکومت سے منظوریاں حاصل کی جاتی ہیں اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہ وجہ نفاذ قانون بلدیہ سرکار عالی نے دیگر ریاستہائے ہند میں ایک ترجیحی جہت حاصل کرلی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیوں نہ یہ امور جو بہ لحاظ قانون بلدیہ، بلدیہ سے متعلق رہنے ضروری ہیں اور جو دیگر مقامات میں بھی بلدیات سے ہی متعلق ہیں بلدیہ کے تفویض ہوں؟

واقعہ یہ ہے کہ نفاذ قانون بلدیہ کے ساتھ ہی سرکار عالی نے گویا اس اصول کو تسلیم کرلیا کہ بلدۂ حیدرآباد کا داخلی نظم و نسق جس سے ساکنین بلدہ متاثر ہوتے ہیں بہ ذریعہ مجلس بلدیہ مراحل تکمیل ختم کرے جہاں تک کہ کارکردگی کا تعلق ہے اس سے مطلق انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر وہ مختلف ادارے جن کا مقصد مشترک ہے ایک ہی نظام کے تحت مربوط ہو کر کام کریں تو زیادہ سے زیادہ فواید حاصل ہوں گے اور جو ہم آہنگی اس طرح ظہور پذیر ہوگی وہ بہت ہی اثر آفریں ہوگی۔

اس سے قطع نظر یہ بھی یقینی ہے کہ اس سے اخراجات میں بھی کفایت ہوگی۔ گذشتہ ڈسمبر میں معاشئین ہند کی جو کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تھی اس میں صوبہ واری مالیات کی ترقی اور استحکام کے عنوان پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا، اور انجام کار اس سے اتفاق کیا گیا کہ سردست اضافہ آمدنی کے وسایل تلاش کرنے کی جگہ طریقۂ خرچ اور نظم و نسق کی مشنری کی تفصیل سے دیکھ بھال اور تنقیح کی ضرورت ہے تاکہ سر رشتہ جات میں تواردی کیفیت (overlapping) پیدا نہ ہو جائے۔

صلاحیت کا سوال بجائے خود وہ مہتم بالشان سوال ہے جس کے تحت یہ موضوع نظرانداز ہوتا رہا ہے۔ مجالس بلدی کی حد تک اس کو برطانوی ہند میں بہت زیادہ اہمیت اور وزن دیا گیا ہے، لیکن وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صلاحیت بہت اچھی طرح سے مہیا ہو جاتی ہے بہ شرطیکہ طریقۂ کار معین اور مفید رہے۔

اکثر مواقع ایسے رہے ہیں کہ صلاحیت کا تعلق قانونِ بلدیہ اور مجلس بلدیہ کی ترکیب سے وابستہ ہو جاتا ہے، مثلاً احاطۂ مدراس میں ایک عرصہ تک مضافاتی بلدیات میں منتخب شدہ میر مجلس بلدیہ بھی عاملانہ فرائض انجام دیتا تھا جس کی بنا پر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ایک اعزازی میر مجلس جو اپنا پورا وقت بلدیہ کے لیے صرف نہیں کرتا ان فرائض سے

کماحقہ عہدہ برا نہیں ہوسکتا۔ اس کے نتایج یہ ہوئے کہ دفتر بلدیہ کے کم استعداد اور قلیل المواجب منتظمین کے ہاتھ میں انتظامات آ گئے جنھوں نے انسام کی ابتریاں پیدا کیں۔ بالآخر حکومت نے ہر بلدیہ کے لیے کمشنر کا تقرر لازم کر دیا۔ قانون میں اصلاح کی گئی اور اب وہاں ہمہ وقتی واقف کار افراد عاملانہ فرایض کی انجام دہی کے لیے کمشنر مقرر ہوتے ہیں۔

اسی طرح بلدی ملازمین کی حد تک قواعد تقرر و ملازمت کے فقدان سے عام شکایات پیدا ہوتی رہی ہیں تو حکومت ہائے مدراس و بمبئی نے اس کے لیے ضوابط و قواعد منظور کیے، نیز مختلف بلدیات ملازمین کا ایک مربوط کیڈر مرتب کر دیا ہے تاکہ عند الضرورت تبادلے کیے جا کر رفع شکایات ہو، نیز ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے گئے۔

اس قانون کی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں مجلس بلدیہ اور ناظم بلدیہ کے تعلقات اور فرایض کا بہت اچھی طرح سے تعین ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے ایک کمپنی سرمایۂ مشترکہ کا کاروبار انجام پاتا ہے، اسی طرح بلدیۂ بمبئی کا کاروبار بھی طے ہو رہا ہے۔ نظمائے بلدیہ بھی جو عہدہ دار مقرر ہوئے ہیں وہ حکومت بمبئی کے منتخب اور آزمودہ افراد ہوتے ہیں۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ہمارا قانون بلدیہ بھی اسی قانون کو پیش نظر رکھ کر مرتب ہوا ہے، اور چونکہ حیدرآباد میں سرکار و غیر سرکار کا فرق اس قدر شدید اور بعید نہیں ہے کہ جیسے بیرون حیدرآباد، لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکیب مجلس بلدیہ کی حد تک جو بھی اختلاف کیا گیا ہے اس سے ہمارا قانون اور بھی مفید مرام ہو گیا ہے۔

ہماری مجلس بلدیہ کی موجودہ ترکیب یہ ہے کہ ایک عہدہ دار سرکاری اس کے میر مجلس ہیں اور اس حد تک یہ عرض کرنا ہے کہ اس امر کو ہندوستانی ادارہ ہائے حکومت مقامی میں عام طور پر قبول کیا گیا ہے کہ ایک سرکاری عہدہ دار کے میر مجلس ہونے سے جو وزن اس مجلس کی آواز کو سارے ملک میں حاصل ہو جاتا ہے وہ غیر سرکاری میر مجلس کے ہونے پر کم ہو رہا۔ محض اس لیے کہ برطانوی ہند میں سرکاری عہدہ داروں کو غیر سرکاری حلقوں میں اجنبی تصور کیا جاتا رہا تھا اور نیز سوال حصول آزادی کا تھا لہذا سرکاری میر مجلس کے لیے اصرار بلکہ تقاضا کیا گیا۔ اگرچہ یہ اب بھی مسلم ہے کہ مجالس بلدی کی حد تک ایک سرکاری عہدہ دار بھی بہ حیثیت اہل شہر میں سے ہونے کے اور نیز بہ لحاظ اپنے مرتبے کے بہت زیادہ کار آمد میر مجلس ہوتا ہے اور اس طرح سے مباحث مجلس میں بھی ایک وزن قایم رہتا ہے۔

اس طرح ہماری مجلس بلدیہ میں تیرہ[۱۳] نمایندگان منتخب کے ساتھ تیرہ[۱۳] نمایندگان سرکار نامزد ہوتے ہیں۔

سابقہ مجلس صفائی میں کوتوال صاحب بلدہ۔ ناظم فوجداری۔ ناظم تعمیرات سمت حیدرآباد۔ ناظم طبابت۔ ناظم امور مذہبی بہ لحاظ عہدہ رکن رہتے تھے اگر اسی اصول پر اب بھی ان تیرہ نمایندگان سرکار کا تعلق ان محکموں سے

رہے کہ جن کے ذیلی بعض اُمور کو بلدیہ کے تحت منتقل کرنا پیش نظر ہے یا جن سے متعلق بلدہ کے متعلقہ اُمور ہیں۔ مثلاً محکمۂ تعمیرات۔ محکمۂ طبابت۔ محکمۂ کوتوالی بلدہ محکمۂ عدالت محکمۂ اُمور مذہبی محکمۂ تعلیمات۔ محکمۂ مالگزاری محکمۂ آبکاری محکمۂ کروڑگیری۔ محکمۂ ریلوے۔ محکمۂ برقی اور نیز محکمۂ صدر محاسب و فینانس، تو پھر عملاً کوئی شبہ مجلس بلدیہ کی صلاحیت سے متعلق سرکار کو نہیں رہنا چاہیئے۔

مزید طمانیت کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بلدیۂ بمبئی کے مماثل صیغہ ہائے تعمیرات۔ ہلت وغیرہ کی اسپیشل کمیٹیاں بنائی جائیں اور ہر امر جو اس صیغہ سے متعلق ہو، اس صیغہ کی اسپیشل کمیٹی کی رائے کے لیے اولاً پیش ہو، اور اس اسپیشل کمیٹی کا صدر بہ روئے قواعد یا قانون نمایندہ محکمہ کو ہی مقرر کیا جائے۔ معیار رائے دہی میں امتحان میٹرک یا اس کے مماثل امتحان کی کامیابی کا لزوم بھی مناسب ہوگا۔

عہدہ داران کی حد تک گو قانون میں ان کی قابلیت کی صراحت موجود ہے اور ان کا تقرر[۲] دو کی حد تک محتاج منظوری سرکار رہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ بھی طے کر دیا جائے کہ یہ دونوں عہدہ داران سرکار عالی سے مستعار حاصل کیے جائیں گے گو حق انتخاب بلدیہ کو رہے گا، اور رہ عہدہ داران کی حد تک بھی ایسا کیا جاسکتا ہے، یہ اس لیے کہ برطانوی ہند میں عہدہ داران کی کارکردگی کو کافی اہمیت دی جاتی ہے اور غالباً یہاں بھی مختلف محکمہ ہائے سرکار کے ارباب اقتدار یہ طمانیت طلب کریں گے اور اس کی حد تک انھیں یہ معلوم رہنا کہ عہدہ داران ہی کے مستعار دادہ ہوں گے نامناسب نہ ہوگا۔

آخری سوال اس ضمن میں مالیات کا ہے۔ برطانوی ہند میں مجالس بلدی کو شکایت رہی ہے کہ ذمہ داریاں انھیں تفویض ہوئیں، لیکن مالیہ کی حد تک انھیں بے بس رکھا گیا بہت ہی محدود ذرایع آمدنی انھیں دیے گئے۔

بلدیۂ بمبئی کو یہ ایک افتخار حاصل ہے کہ اپنی ساری مصروفیات کی تکمیل وہ اپنی ہی آمدنی سے کرتی ہے، یہ واقعہ اس ضمن میں قابلِ دلچسپی ہے کہ ایک مرتبہ بلدیۂ بمبئی میں یہ تحریک منظور ہوئی تھی کہ جزیرۂ بمبئی کی حد تک ایک علٰحدہ صوبہ بنایا جائے تو اہالیانِ شہر بمبئی اپنے جملہ لوازم حکومت کی خود تکمیل کرلیں گے۔

اس طرح بلدہ حیدرآباد کی حد تک یہ امر عدیم المثال ہے کہ یہاں کی تقریباً ساری شہری آسایشیں سرکار عالی نے بلا مجلس بلدیہ کو زیر بار کیے فراہم کی ہیں جس کی وجہ اہالیانِ حیدرآباد کو دوہرے اخراجات کا بار برداشت کرنا نہ پڑا۔

اس سلسلے میں یہ بہر حال وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ محکمۂ کروڑگیری۔ محکمۂ آبکاری۔ محکمۂ ریلوے۔ محکمۂ برقی،

نیز محکمہ ہائے ٹپہ۔ رجسٹریشن وعدالت سے سرکار عالی کو جو آمدنی اہالیان بلدہ حیدرآباد سے ہوتی ہے اس کی مقدار بہت کافی ہے اور اگر اس رقم کا کچھ حصہ بلدی انتظامات کے لیے مختص کر دیا جاتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جہاں رقم وصول ہو رہی ہے وہاں ہی صرف ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ سرکار عالی نے اب تک جو اخراجات برداشت کیے ہیں وہ اس آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں لیکن بہ لحاظ اس کے کہ بلدہ حیدرآباد اس ریاست کا پایہ تخت ہے، یہ صرفہ عین مناسب اور موزوں تھا۔
غرض کہ سرکار عالی خود اس وقت ان مختلف محکموں پر جو صرفہ برداشت کر رہی ہے کہ جو بلدہ کی حد تک آسایش انتظامات میں لگے ہوے ہیں، اگر وہی رقم آیندہ بھی بہ طور گرانٹ دی جائے تو بہت زیادہ ہم آہنگی کے ساتھ مفید تر انتظامات ہو کر اچھے نتایج برآمد ہوں گے۔

بہ تدریج بلدی محاصل بھی بڑھائے جاسکتے ہیں، بالخصوص بالواسطہ محاصل جیسے چنگی۔ ٹرمینل ٹیکس پٹرول ٹیکس۔ رجسٹری معاہدات کے ضمن میں فیس رجسٹری میں کچھ اضافہ کہ جو بلدیہ کو ایصال ہوگا۔

البتہ اس ضمن میں تنقیح حسابات کے لیے محکمہ سرکار کی مزید طمانیت کے لیے اگر ناظر صاحب حسابات لوکل فنڈ کا تعلق قایم رکھا جاسکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ قانون بلدیہ کے نفاذ کے بعد ہی یہ سوال محکمہ فینانس میں پیش ہوا تھا کہ جب سرکار عالی ایک کافی رقم بہ طور امداد بلدیہ کو دے رہی ہے تو کیوں نہ محکمہ صدر محاسبی وفینانس کا تعلق نگرانی قایم نہ رہے۔

جہاں تک محکمہ آرایش کا تعلق ہے چونکہ مجلس آرایش بلدہ کی تشکیل بالکل خاص ہے اس لیے اور یہ اس بنا پر بھی کہ آرایش بلدہ کے کام کی نوعیت کے مدنظر بمبئی۔ کلکتہ۔ ناگپور۔ لاہور میں علحدہ مجالس نے کام کیا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے لیے ایک مختصر ادارہ زیادہ موزوں ہے، اس لیے محکمہ آرایش بلدہ نیز مجلس آرایش بلدہ علحدہ رہ سکتا ہے لیکن ناظم صاحب بلدیہ کو بہ حیثیت عہدہ مجلس آرایش بلدہ کا معتمد قرار دیا جاسکتا ہے تاکہ زیادہ تر اتحاد عمل ہو رہے۔

اسی طرح محکمہ برقی بہ جائے خود علحدہ قایم رہ سکتا ہے کہ جیسے مدراس و بمبئی کا حال ہے مگو یہ بھی واقعہ ہے کہ اگر سرکار عالی اس ادارے کو محکمہ بلدیہ پر منتقل کر دے تو ایک ذریعہ آمدنی بھی محکمہ بلدیہ کو مل رہے گا۔

بالاجمال یہ ہر طرح ممکن ہے کہ کارکردگی کو بڑھانے اور اس طرح اخراجات میں بھی کفایت اور ان سے زیادہ سے زیادہ افادہ ممکن کرنے کے لیے سرکار عالی محکمہ بلدیہ پر بہت سارے امور کو منتقل کر دے جو چیدہ چیدہ محکمے انجام دے رہے ہیں، اور اس کے لیے بہ صراحت صدر تغیرات کیے جائیں تو خوش نظمی کی بھی طمانیت ہو رہے گی۔

سرمار

بزمِ طیلسانین

ڈاکٹر بہادر خاں صاحب کو ۱۳۳۹ف میں جبکہ انھوں نے کلیۂ طبیہ جامعہ عثمانیہ سے یم۔ بی۔ بی۔ یس کے پہلے فنی امتحان میں ممتاز طریقے پر کامیابی حاصل کی تھی، ان کی ذہانت محنت اور فراست کے مدِ نظر منجانب سرکار عالی علم طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہ عطائے وظیفۂ انگلستان روانہ کیا گیا جہاں انھوں نے آٹھ سال تک حصولِ تعلیم میں مصروف رہ کر یل۔ آر۔ سی۔ پی (لندن)، یم۔ آر۔ سی۔ یس (انگلینڈ)، یم۔ بی۔ سی یچ۔ پی (لیڈس)، یف۔ آر۔ سی۔ یس (لندن)، یم۔ سی ایچ (لیڈس) کی اعلیٰ ترین اسناد حاصل کیں، اور ملازمت سرکار عالی میں یکم آذر ۱۳۴۸ف سے بہ عہدۂ سیول سرجنی مامور ہو کر ملک کے عظیم المرتبت دواخانۂ عثمانیہ میں کام شروع کیا۔ ان کی شاندار کامیابی کے ساتھ مراجعت کے موقع پر کاوش صاحب نے یہ نظم "تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے" کے بہ مصداق کہی ہے۔ (ادارہ)

کامیاب زندگی

دوست! تجھ کو ہو مبارک نغمۂ روحِ نشاط — یہ ہجومِ فصلِ گل، یہ سرخوشی، یہ انبساط

ہو مبارک تجھ کو بوڑھے باپ کا دیدار بھی — اور اپنے دوستوں کا جلوۂ پندار بھی

ہو مبارک جلوۂ رنگِ حیاتِ کامیاب — تیری شہرت کا رہے رخشاں ہمیشہ آفتاب

ہو مبارک تجھ کو یہ سرشاریٔ جامِ سرور — ساقیٔ دوراں فزوں کر دے ترا حُسنِ شعور

کاوش

جمہوری شہریت کی تعلیم

جے ایچ نکلسن۔ پرنسپل۔ یونیورسٹی کالج ہل (انگلستان)

فاسسطی حکومتیں، اور سوویٹ روس، بالارادہ اپنے بچوں کو فاسسطیت اور اشتمالیت Communism کی تعلیم دیتے ہیں جمہوریت پسند اسے رجحان Bias کہتے ہیں، اور یہ دعوے کرتے ہیں کہ اُن کے اپنے مدارس غیر رجحاناتی ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے؟ ــ اور اگر ایسا ہے تو کیا یہ دانش مندی ہے؟

رجحان سے بچنے کا آسان ترین طریقہ واقعات کی تعلیم ہے، آراء کی نہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ سائنس کی حد تک یقیناً۔ ہاں! ــ کوئی حکیم (سائنس داں) واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے خیال کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتا لیکن فنون کی حد تک اس کا جواب نفی میں ہوگا! ادب جس طرح کہ آج کل اس کی تعلیم دی جاتی ہے، سائنس بھی ہے اور ایک فن بھی کیوں کہ وہ واقعات سے بحث کرتا ہے (جن کی تصدیق ضروری ہے) اور قدر و قیمت Values سے بھی (جو در حقیقت انفرادی رائے پر مبنی ہیں اور جن کی صحیح جانچ ناممکن ہے) ــ اور یہی آراء کی تعلیم ہے۔ ثقافتی علوم Humanities کا معلّم قدر و قیمت کے مسائل سے گریز نہیں کرسکتا۔ پھر رجحان سے گریز کیسا؟ ــ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم سیاسیات سے جس قدر قریب تر ہوجاتے ہیں یہ مسئلہ اسی قدر مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اسی لیے تو انگلستانی مدارس سے سیاسی پروپگنڈا کو جائز طور پر خارج رکھا گیا ہے لیکن کیا ہمیں ہر قسم کی سیاسی تعلیم کو بھی خارج رکھنا چاہیئے؟ ــ اگر ایسا ہے تو پھر شہریت کی تعلیم کا کیا حشر؟

چونکہ مدارس میں ہم قدر و قیمت کے مسائل سے گریز نہیں کرسکتے، اس لیے ہمیں رجحان کے مسئلے سے رو در رو ہونا چاہیئے۔ ہم بچوں کو خصوصیت کے ساتھ دیانت داری۔ سچائی۔ صفائی۔ پابندئ وقت اور شاید جرات اور ایثار کی جانب بھی مائل کرتے ہیں لیکن اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کرتا کیوں کہ عام طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ یہ

پسندیدہ خوبیاں ہیں ہم انھیں وفاداری کی بھی تعلیم دیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت انھیں آگے چل کر یہ پتا چلتا ہے کہ وفاداریوں کے درمیان اکثر تصادم ہو جاتا ہے۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم صرف انھی معاملات میں رجحان کو تسلیم کرتے ہیں جن کے متعلق خیالات (آراء) میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بالخصوص مذہب، سیاسیات، تاریخ اور معاشیات میں، مثلاً ہم ادب یا موسیقی یا فنون کے ایک استاد کو صحیح الدماغ (Sound) کہہ سکیں گے اگر اس کا مذاق مسلمہ معیاروں کے مطابق ہو یا اگر مطابق نہ ہو تو سرپھرا (Cranky) لیکن اسے عام طور پر "رجحان زدہ" یا متعصب (Biased) نہیں کہتے، یا اسی طرح اس کے بالکل برعکس اصول و فرائضِ زندگی (اخلاق) کی حد تک ایک بدعتی (Innovator) کو صرف نامہذب یا بداخلاق کہا جائے گا، اور بس۔

آمرین کی اُن کوششوں کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے جو وہ نہ صرف سیاسی و مذہبی خیالات اور معاشی زندگی پر قابو حاصل کرنے کے لیے بلکہ ادب و فنون اور موسیقی پر بھی اپنا قبضہ جمانے کے لیے کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل صحیح استدلال پر مبنی ہے، کیوں کہ بات یہ ہے کہ سیاسی اداروں کو ان سماجی بنیادوں سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا جن پر ان کی تعمیر ہوتی ہے۔ ادب اور فنون نے نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں کلیسا کی گرفت سے آزادی حاصل کی۔ ضمیر کی آزادی فکر (خیالات) کی آزادی کا پیش خیمہ بنی، سیاسی آزادی سب سے آخر میں حاصل ہوئی، لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم بہت تنگ ہے کیوں کہ ہم نے ابتدائی جدّوجہد کو بھلا دیا ہے۔ آزادی، امن کی طرح، ناقابلِ تقسیم ہے، یعنے کوئی شخص اس وقت تک حقیقی معنیٰ میں آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتا جب تک اس کے احساسات یا جذبات اُن قدر و قیمت کے تابع ہوں جنھیں اس نے دوسروں سے حاصل کیا ہے۔ اِلّا اس صورت کے جب کہ غور و فکر کسی تنگ مخصوص مہارتی میدان میں ہو۔ اسی طرح کوئی جماعت زیادہ عرصے تک سیاسی حیثیت سے آزاد نہیں رہ سکتی، تاوقتیکہ اس کے اراکین بھی نئی نئی سماجی قدر و قیمت کی تخلیق کرنے کے لیے آزاد نہ ہوں ——— اور آزاد نہ ہوں فنون، ادب اور کردار میں اُن کا اظہار کرنے کے لیے۔

ضبط یا انضباط (Discipline) اور آزادی کے درمیان بہ ظاہر جو تضاد اور تصادم پایا جاتا ہے اسی کو اکثر نمایاں کیا جاتا ہے، گویا یہ دونوں کبھی یکجا پائے ہی نہیں جا سکتے۔ مدرسہ ہو یا سماج ــ وجہ یہ ہے کہ تعلیم عام (Liberal education) کے سلسلے میں چند ابتدائی تجربات حقیقت میں صحیح راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ چونکہ کم عمر بچے کے لیے بیرونی اعانت کے بارہ میں جو اندازہ قایم کیا گیا تھا وہ ضرورت سے بھی کم تھا ــ اسی اعانت کے بارہ میں جو حقیقی دنیا کے متعلق اس کی اپنی ذاتی عجیب عجیب تاویلات کے

خلاف ہو۔ حالانکہ صحیح مشاہدہ اور منطقی استدلال کے لیے بچّے کی تربیت کرنا اس کی آزادی کو محدود کرنا نہیں ہے، بلکہ اس میں وسعت دینا ہے بہ شرطیکہ اس کے تفکّر کو مقید کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد الہامی حسِّ قدر و قیمت Intuition کے لیے وہی کرنا ہے جو کچھ ہم نے ذہن کے متعلق کرنا سیکھا ہے۔ لیکن آج کل ہم میں سے اکثر یا تو اپنے خود کے اخلاقی اور جمالیاتی معیاروں کو جبراً بچّے سے اختیار کرواتے ہیں یا اُسے اخلاقی اور جمالیاتی معاملات میں بغیر کسی حقیقی رہنمائی کے چھوڑ دیتے ہیں اس خوف سے کہ مبادا ہم اس کی فطری حسِّ قدر و قیمت کو برباد نہ کر دیں، یا پھر ہم اُن میں ایک میل پیدا کرتے ہیں۔ انضباط کی قسم سے زیادہ اس کی سختی کا لحاظ رکھتے ہوئے اب غور و فکر کرنا کچھ تو طریقۂ آزمائش و غلطی trial and error کے ذریعے سیکھتے ہیں (کیا یہ نتیجہ خیز ہے؟)؛ کچھ دوسروں کو غور و فکر کرتے ہوئے دیکھ کر یا پھر ہمارے سامنے پیش کردہ مختلف توضیحات میں سے کسی کا مجبوراً انتخاب کرنے کی وجہ سے۔ ہمیں تقریباً اسی طرح قدر و قیمت کا تعین کرنا سیکھنا چاہیئے۔ اولاً آزمائشی تعین قدر و قیمت کے ذریعے جو ممکن ہے امتحان میں پورا نہ اُترے، یا ثانیاً یہ دیکھ کر کہ دوسرے اشخاص اشیا، کی اور ہمارے اپنے افعال کی قدر و قیمت کا کیا تعین کرتے ہیں۔ یا ثالثاً متضاد قدروں Values کے درمیان انتخاب کے ذریعے، سچ تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے ہیں، لیکن جبکہ ایک طرف تمام بہترین اساتذہ میدانِ فکر میں تجربہ کرنے اور تصدیق کرنے کے لیے بچّے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو دوسری طرف قدر و قیمت کے مسئلے میں طریقۂ دوم پر (تعلیم بہ ذریعۂ نقل یا تقلید پر) بے انتہا زور دیا جاتا ہے اور قدر و قیمت کے راست تعین کی کوشش پر بہت ہی کم۔ شاید یہ اس لیے ہوگا کہ ممکن ہے، یہاں آزمائشات مضر ثابت ہوں، یعنے ایسی بدعتوں Innovations کی جانب رہنمائی کریں جو سماجی نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہوں۔ درحقیقت ایک ایسا مقام بھی ہے جہاں پر ہمیں مداخلت کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ تنبیہ کرنی پڑتی ہے کہ: "اگر تم ایسا کرو گے تو تمھیں معلوم ہوگا۔ ۔ ۔" یا پھر "ایسا مت کرو۔ ۔ ۔" (کیوں کہ ایک غلط وجہ بتانے سے کچھ نہ بتانا بہت بہتر ہے) جہاں کہیں بھی اس کا امکان ہو عقل سے اپیل کرنا ہمیشہ بالکل درست فعل ہے۔ اس طرح بچّے کی اپنی متعین کردہ قدر و قیمت سے مختلف ایک اور قدر و قیمت اس کے سامنے رکھنے کی کوشش بھی درست ہے بہ شرطیکہ آپ اس قدر کو اپنے ذاتی استناد کی بناء پر قبول کرنے کے لیے اس کو مجبور نہ کریں۔ فطری طور پر بچّے کی نظر میں بالغ آدمی کا وقار ہوتا ہے، اور اس وقار سے وہ (بالغ) ہرگز دست بردار نہیں ہو سکتا، ورنہ بچّے کے دل میں اس کا اعتماد باقی نہیں رہے گا؛ یہ ایک مفید تعلیمی ذریعہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا غلط استعمال کیا جائے۔

بہ لحاظ کردار کسی شخص کی شخصیت کے مقابلے میں اس کی "آرا" کی اہمیت بہت کم ہوتی ہے۔ اکثر تیقنات جو بہت زیادہ پختہ ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد یں جذباتی ہوتی ہیں ـــ وہ صرف عقل ہی کو مطمئن نہیں کرتے (ممکن ہے کہ بڑی حد تک وہ غیر عقلی بھی ہوں) بلکہ وہ کسی ایسی ضرورت کے جواب میں ہوتے ہیں جو شعوری تفکر کی پہنچ سے بھی باہر ہو۔ اُن (تیقنات) کو قایم کرنے یا اُن میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ایک جذباتی ترتیب **Adjustment** کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحث و مباحثے کے ذریعے قدیم اعتقادات کا چھڑانا، یا نئے اعتقادات کا قبول کرانا بہت مشکل کام ہے، چونکہ اس صورت میں ہر شخص کو اپنے سابقہ تجربے کی قدر و قیمت کا نئے سرے سے تعین کرنا پڑتا ہے۔ کوڑ دماغ شخص وہ ہے جس میں قدر و قیمت پہچاننے کی قوت مردہ ہو چکی ہے، یا اب تک جگائی ہی نہیں گئی۔ اس کی تعلیم ضرور کہیں کچھ غلط ہوئی ہے ـــ شاید گھر پر، مدرسے میں شریک ہونے سے بہت قبل۔ اور وہ اب تک بھی اپنی شخصیت کو جبراً توڑنے کی کسی ابتدائی کوشش کے خلاف جہاد کر رہا ہے ـــ یعنے اس کی مرضی کے خلاف جبراً قدر و قیمت تسلیم کرانے کی کوشش کے خلاف۔ یہ بالعموم ایک خراب رفیق نا فرماں بردار ماتحت، یا خود رائے افسر ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ جمہوری جماعت کا ایک بہت کمزور رکن ہوتا ہے۔ چند لوگ تیقنات قایم کرنے کے ناقابل معلوم ہوتے ہیں، شاید اس لیے کہ انھیں کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ وقت گذر گیا۔ وہ عام طور پر اپنی صاف گوئی پر فخر کرتے ہیں۔ ان کا ذہن آزادی کے ساتھ حرکت کرتا ہے لیکن ان کے جذبات اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ اکثر محدود و مخصوص تعصبات سے بھرے رہتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ رائے قایم کرلی ہے وہی درست ہے۔ ایسے لوگ بھی نہایت ادنیٰ قسم کے جمہوری ہوتے ہیں۔

جمہوریت کی تعلیم کا اہم ترین مقصد، یا "فرض" ایسی شخصیت کی تعمیر ہے جس کے بغیر جمہوریت چل ہی نہ سکتی ہو ـــ یعنے حریت پسند، روادار، اعانت کن شخصیت۔ چند طبائع بہ نسبت دوسروں کے بہت آسانی کے ساتھ جمہوری خوبیوں کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت پر لازم ہے کہ وہ انسانی طبائع کی گوناگونیت کو تسلیم کرے اور اس کی قدر کرے اور مختلف استعدادوں کے لیے میدان مہیا کرے۔ ہر اچھا استاد اپنا فرض سمجھتا ہے کہ طالب علموں کو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے، نیز ایک جماعت کے رکن کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا سیکھنے میں مدد دے ـــ اور انھیں ایسے اشخاص میں رہنے اور کام کرنے کے لیے تیار کرے جنھیں ضروری نہیں کہ وہ پسند بھی کرتے ہوں اور اگر سچ پوچھا جائے تو اپنے ضمیر کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اُن میں سے "تمام" کو وہ پسند کر بھی نہیں سکتے اور نہ ہی سب کو مساوی طور پر پسند کر سکتے ہیں۔ اب اگر ہم کوئی بات پسند نہیں کرتے تو اس کے نو وجوہ ہوتے ہیں لیکن جب ہم نفرت کرتے ہیں تو یہ اکثر

غیر عقلی ہوتا ہے، بجز اس کے کہ ہم ذاتی نقصان کو مفادِ عامہ پر ترجیح دیں "سماج کے دشمن" اکثر اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ خراب گھروں اور خراب مدرسوں کی وجہ سے، یعنی ایسے گھروں اور مدرسوں کی وجہ سے جنھوں نے ان کی غلط طریقے پر تربیت کی ہے۔ بعض لوگ اپنی شخصی شکایتوں کو رنگ دے کر ان کو سماجی اصلاح کا بہانہ قرار دے لیتے ہیں۔ سماج ان میں سے بہترین افراد کی بہت کچھ ممنون احسان ہے لیکن سماجی مصلحین پیدا کرنے کا یہ ایک خطرناک طریقہ ہے اور شاذ ہی کامیاب ہوتا ہے۔

بلاشبہ جمہوریوں کو اس سماج کے متعلق معلومات حاصل رہنی چاہئیں جس کے آیندہ چل کر وہ شہری بننے والے ہیں اور اگر ممکن ہو تو انھیں اس کی حُبِّ آزادی کا حصہ دار ہونا چاہیئے اور اس کے لیے ذمہ داری محسوس کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ آزادی سے بہ خوبی محبت نہیں کر سکتے تاوقتیکہ اسے نہ سمجھیں اور اس کے صحیح معنے کے متعلق انھیں کوئی حقیقی تجربہ نہ ہو۔ ایسے کئی طریقے ہیں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کم و بیش کامیابی کے ساتھ مدرسوں میں استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر مفید ثابت ہوتے ہیں بہ شرطیکہ صدر مدرسہ اور اساتذہ فی الحقیقت حریّت پر یقین رکھتے ہوں اور خود بھی مستعد شہری ہوں لیکن حکومت خود اختیاری کا منصوبہ یا شہریت سے متعلق نصاب بہت کم مفید ہوتے ہیں، اگر انھیں ایسی درسگاہی زندگی کے ساتھ منسلک کر دیا جائے جو عملاً غیر آزاد ہو۔ یعنے جس میں حریّت فکر و کردار کی حوصلہ افزائی نہ کی جاتی ہو یا جہاں "ایک نمونہ" پر سب کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ بہترین منصوبے۔ مدرسے کے کام اور مشاغل ہی سے فطری طور پر نشو و نما پاتے ہیں، اور انھیں اختیار کر لیا جاتا ہے، چونکہ ذمہ دار ہستیوں کا تجربہ ہے کہ ان کے تعلیمی مقاصد کے حاصل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہیں۔ بعد میں تجربے میں وسعت کے ساتھ ساتھ اُن میں ترمیمات کر لی جاتی ہیں۔

لڑکے اور لڑکیاں اور بالخصوص بالغ اپنے سے زیادہ عمر والے ایسے لوگوں کی دلچسپیوں میں بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں جن کی وہ قدر کرتے ہوں۔ اس میں خطرہ یہ ہے کہ وہ اکثر نہ صرف ان کا شوق بلکہ ان کی رائے اور ان کے ذوق کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ بہترین اساتذہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے لیکن اس سے کلیتاً نجات پانا بھی آسان کام نہیں۔ ایک خفیف درجے کا "سہارا" انسانی کے ساتھ حد سے بڑھ جاتا ہے لیکن کئی اشخاص اپنی زندگی بھر ایسے تیقنات کے حامل ہوتے ہیں جو انھوں نے اپنے والدین، اساتذہ یا اپنے سے زیادہ عمر والے دوستوں سے بلا تامل و غور حاصل کر لیا ہے۔ مدرسے میں بچوں کے یہ ذہن نشین کرا دینا چاہیئے کہ اچھے آدمی اکثر اپنے نظریوں میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں، کیوں کہ جدید دُنیا ان لوگوں کے لیے بہت پریشان کن ہے جو پہلے سے متضاد تیقنات اور وفاداریوں کے لیے تیار نہیں کیے گئے ہیں۔

انسان کی سماجی جبلتیں خود پسندانہ جبلتوں کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑی ہوئی ہیں۔ وہ بے انتہا زیادہ قدیم ہیں جب جماعت خطرہ میں ہوتی ہے (مثلاً جنگ کے زمانے میں) تو جماعتی وفاداری بہ آسانی خود صیانتی جذبات پر غالب آجاتی ہے۔ مفکر سماج اخلاق کرتے ہیں ضرور ہیں لیکن فرد پر سماجی دباؤ بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے ایک اعتبار سے قوم پرستی فطری جذبہ ہے اس کے سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کی تربیت کی ضرورت ہے جبلت میں جڑ پکڑے ہوئے تمام قسم کی تحریکات کی طرح اس کی قوت بھی شاید بڑھائی گھٹائی نہیں جا سکتی، لیکن اس کی رہنمائی کی جا سکتی ہے۔ ہم میں سے اکثر ذیلی جماعتوں کے مطالبات کا فوری جواب دیتے ہیں (مثلاً ہمارا خاندان ہمارا اپنا یارانہ شاید ہماری جماعت، یا فرقہ۔ ہم آداب یا لباس کی غیر اہم تفصیلات میں بھی تقلید کرتے ہیں (مثلاً ٹائی کالی ہے یا سفید) اکثر مدرسے اس ایقان پر عمل کرتے ہیں کہ مدارسی مشاغل کے ذریعے وفاداری اور جماعتی اسپرٹ (Team spirit) کی تربیت کی جا سکتی ہے اور پھر انھیں حسب مرضی اُن گروہوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے جن سے کہ بالغ متعلق ہیں۔ مجھے اس میں شُبہ ہے۔ اگر بچوں کو اچھے شہری بننا ہے تو انھیں اس جماعت کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیئے جو ان کی وفاداری اور ان کی محبت کی خواستگار ہے۔ انھیں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ جماعت اُن سے نہ صرف وفاداری چاہتی ہے، بلکہ "تعمیری تنقید" بھی! اور یہ کہ ذیلی جماعتوں کے مطالبات کی مخالفت کی جانی چاہیئے جبکہ وہ وسیع تر وفاداریوں سے آکر ٹکرائیں۔

شہریت کی تعلیم کا جذبات کے ساتھ ساتھ ذہن (عقل) سے بھی تعلق ہونا چاہیئے۔ ہم جذبات کی تربیت ضرور کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات جو تربیت ہم دیتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جذبات کو اُن مقاصد (Ideals) اور ادارہ جات کا ہمنوا بنایا جائے جن کو ہم خود قابلِ قدر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جائز یہ ہوگا کہ ہم اپنے تجربات کو طلباء کے سامنے رکھ دیں اور انھیں یہ صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے نزدیک ان کی کیا قدر و قیمت ہے لیکن ہمیں یہ سیکھنا چاہیئے کہ انھیں بہ طور خود قدر و قیمت کا تعین کرنے سے روکے بغیر یہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت ہمیں انھیں یہ تعلیم دینی چاہیئے کہ ایسا کرنا اُن کا اپنا فرض ہے لیکن دوسرے معنی میں تعلیم میں رجحان ناگزیر ہے، چونکہ مدرسہ ایک سیرت دار سماج Society in miniature ہے (جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) حکومتی منصوبوں کے ذریعے قائدین کے انتخاب اور ان کے اتباع اور اخلاقی مسائل کے حل کرنے کے متعلق مفید تجربہ حاصل ہو سکتا ہے نیز ہم عصر سماج کا مطالبہ ہمدردی اور شوق کو جگانے اور عملی شہریت کے لیے تیار کرنے میں ممد ہو سکتا ہے۔ ہمارا حقیقی مقصد اس قسم کی تعلیم ہونا چاہیئے کہ ہمارے طلباء حریت پسند اور ذمہ دار بالغوں میں نشو و نما پائیں ـــ یہ عقل اور جذباتی ترقی میں مکمل طور پر بالغ ہوں اور ایسے مختلف قسم کے فیصلہ جات کرنے کے قابل جن کی جمہوری شہریت میں ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مدرسے کی سیرت درست ہے تو طلباء میں آزادانہ اور تحقیق پسندانہ اسپرٹ پیدا کرنا آسان ہوگا، لیکن جذبات کی اس طرح تربیت کرنا کہ یہ مسلمہ معیاراتِ قدر و قیمت سے بے نیاز ہو جائیں، کچھ آسان کام نہیں۔ لیکن جب تک ہم یہاں بھی کامیابی حاصل نہ کر لیں "فکر" خود اس وقت تک حقیقی طور پر آزاد نہیں ہو سکتی۔

مترجمہ محمد علی

روئیداد نمائش ملکی مصنوعات سلطنت آصفیہ

اس حقیقت سے خواہ وہ کیسی ہی ناقابل یقین کیوں نہ ہو، اکثر ہمدرد احباب مطلع ہو چکے ہیں کہ معاشی کمیٹی انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی گرہ میں صرف ڈھائی روپیہ تھا اور محض نو دن کی مدت باقی تھی جبکہ نمائش ملکی مصنوعات کے انعقاد کا عملی اقدام کیا گیا۔ ذیل میں بالاجمال اس کی روئیداد قلمبند کی جارہی ہے تاکہ اہل ملک کو عام طور پر اس کی اطلاع ہوجائے :۔

کانفرنس طیلسانئین عثمانیہ میں بے روزگار طیلسانئین عثمانیہ کے مسئلے پر غور کے ضمن میں ملک کی عام خوش حالی کے اضافے کو ہی سب سے بہترین ذریعہ فراہمی روزگار تصور کیا گیا، اور اس کے لیے ایک مستقل ادارہ بنام "معاشی کمیٹی" قایم کیا گیا۔ مولوی محمود علی صاحب لکچرار سٹی کالج اس کے صدر اور عبدالرحیم صاحب بی۔ اے معتمد منتخب ہوئے۔ اس معاشی کمیٹی نے جہاں ملک کی معاشی سروے وغیرہ کے متعلق تجاویز مرتب کیں وہاں یہ بھی قرار دیا گیا کہ ملک کی مصنوعات اور صناعوں سے اہل ملک کو روشناس کرنے کے لیے ایک نمائش کا انعقاد ضروری ہے، اور اس کے افتتاح کے لیے پیشی ہز اکسلنسی نواب سر صدر اعظم بہادر میں یہ استدعا کی کہ آں جناب نمائش کے افتتاح کو قبول فرمائیں نمائش کی کامیابی متیقن ہوگئی کہ جب معاشی کمیٹی کو یہ جواب وصول ہوا کہ ہز اکسلنسی نے کمیٹی کی استدعا کو بہ طیب خاطر و بہ مسرت تمام قبول کرلیا ہے معاشی کمیٹی کا دوسرا کام نمائش کے لیے ایک ورکنگ کمیٹی کی تشکیل تھا۔ حسن اتفاق سے اس میں محمد فاروق صاحب بی ملے۔ ایچ سی یس مددگار ناظم بلدیہ۔ پریم لال جی صاحب رکن بلدیہ اور عبدالوہاب صاحب بی اے انجینیر اسٹیٹ راجہ شیوراج بہادر نے شرکت قبول کرلی مسٹر شنکر جی اس کے معتمد مقرر ہوئے۔

نمائش کے لیے اولاً ڈپارٹمنٹل پروگرس پاویلین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جناب مہر علی فاضل صاحب قابل شکریہ ہیں کہ انھوں نے بہ عجلت ممکنہ شہزادہ والاشان معظم جاہ بہادر صدر مجلس آرائش بلدہ سے اس کے اجازتی احکام حاصل کیے۔ نہ صرف اس پاویلین کی اجازت بلکہ باغ عامہ سے اور دیگر مراعات کے حصول کے لیے جناب مہر علی فاضل صاحب

اور جناب جمال الدین صاحب ناظم باغات نے بہ ہمہ وجوہ امداد دی ہے۔

پراسپکٹس کی ترتیب اور طباعت دوسرا مرحلہ تھا۔ خواجہ حمید احمد صاحب بی اے منتظم نظامت صنعت وحرفت نے اسکو مرتب کیا۔ مسٹر مشتاق احمد پرسنل مددگار جنرل منیجر ریلوے نے اس ضمن میں مفید مشورے دیے تھے۔ طباعت پراسپکٹس کا مرحلہ مبادلتاً رقم دے کر طے کیا گیا اور پھر جناب محمد علی صاحب ام اے مددگار مدرسہ فوقانیہ چادر گھاٹ عبدالرحیم صاحب بی اے اور محمد علی خاں صاحب بی اے نایب معتمد معاشی کمیٹی نے کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رکھا کہ مختلف کارخانوں اور صناعوں کے ہاں جاکر ان کو آمادہ کیا جائے کہ نمائش میں شریک ہوں۔ روزآنہ جو صناع اور کارخانے شریک ہوتے ان کی فیس شرکت اور بعض کے پیشگی کرایوں سے ٹیکسی موٹر کے کرایے ادا ہوتے تھے جشن سال نو کے دوران میں نمائش کے انعقاد سے متعلق تشہیر کا موقع ہاتھ آیا، یہ اشتہارات بھی مبادلتاً رقم دے کر طبع کرائے گئے تھے۔

جشن سال نو کے عشائیہ میں صدر معاشی کمیٹی اور نواب مہدی نواز جنگ بہادر کی گفتگو رہی کہ نواب صاحب نمائش کے انعقاد میں اپنی امداد و اشتراک سے ممنون فرمائیں نواب صاحب نے کمی وقت پر متوجہ کیا کہ مبادا یہ نمائش کی کامیابی کو متاثر نہ کردے۔ دوسرے روز نواب صاحب دفتر کمیٹی پر تشریف بھی لائے اور کافی مباحثہ رہا کہ نمائش کو فروردی میں کیوں نہ ملتوی کر دیا جائے خواجہ حمید احمد صاحب اس پر مصر تھے کہ نمائش کو ملتوی نہ کیا جائے۔ رائے مدن موہن لعل صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد ایک اعلان لکھا گیا کہ بہ لحاظ توقع بارش و کمی وقت نمائش یکم فروردی تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔

اس کے بعد میں جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر تشریف لے گئے، لیکن ابھی اعلان کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی ہوگی کہ ارکان معاشی کمیٹی نے ایک طرح کی پستی محسوس کرنی شروع کی اور ایسا محسوس کیا گیا کہ یہ ردعمل بہت زیادہ مہلک ہوگا خواجہ حمید احمد صاحب نے از سر نو اپنا نکتہ خیال پیش کیا۔ رائے موہن لال صاحب نے تائید کی میر محمود علی صاحب صدر نے بھی کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ بالآخر یہی طے ہوا، اور اس بار ۱۲ بجے رات تک جملہ مبادیات پروگرام طے ہوئے، مگر صبح پھر موسلا دھار بارش میں التوا کی مناسبت پر غور کیا گیا۔ محکمہ ہائے نظامت صنعت وحرفت اور معتمدی صدر اعظم بہادر سے بہ ذریعہ فون گفتگو کی گئی، اور محض اس لیے کہ ہز اکسلنسی سر صدر اعظم بہادر تک التوا کی اطلاع پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ کارکنوں نے اس تاخیر سے شگون لیا کہ اب التوا کا خیال قطعاً ترک کر دیا جائے۔ اس روز شام میں نواب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی اور از سر نو مبادیات پر غور کیا جا کر تقسیم کار کی تکمیل کی گئی۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں بی اے، ال ال بی کیبل کو شعبۂ تفریحات

سپرد کیا گیا۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے کمال آمادگی سے اپنے عملے کی رضاکارانہ خدمات نمایش کے لیے عطا کر دیں۔ بلدیہ کا برقی آب دار خانہ بھی نصب کیا گیا۔ ناممکن تھا کہ نواب صاحب کے اس اشتراک کے بغیر نمایش کامیاب ہوتی۔

ڈپارٹمنٹل پروگرس پاویلین میں اسٹال قایم کرنے میں مشکلات نظر آئیں تو عجایب خانہ سرکار عالی سے متصل عمارت تیار کردہ محکمۂ صنعت و حرفت کا انتخاب بہت ہی موزوں ثابت ہوا، اور ساتھ ہی مولوی احمد محی الدین صاحب ناظم صنعت و حرفت سے جو وہاں رفتار کار دیکھنے آئے تھے اس کی اجازت کی بابت عرض کر دیا گیا اس عمارت کا صحن کئی فٹ جھاڑی سے بھرا ہوا تھا، اور صفائی و آہک پاشی کی شدید ضرورت تھی جس کا سلسلہ شروع کرا دیا گیا تھا کہ دکن ماربل لایم کمپنی نے ملکی سنگ مرمر کے چونے سے ساری عمارت کی اپنی گرہ سے آہک پاشی کر دی۔

نواب زین یار جنگ بہادر نے اس موقع پر اسٹالس کی ترتیب اور عام سجاوٹ سے متعلق بہت ہی مفید مشورے دیے جن کو عبدالوہاب صاحب انجینیر نمایش نے بہت ہی اچھی طرح پر تکمیل کو پہنچایا۔ سامان تعمیر جوبلی پاویلین بھی مستعار عطا کیا گیا۔ نواب زین یار جنگ بہادر نے علاوہ ازیں عطائے اسناد کی کمیٹی میں عملی شرکت کی غرض سے بھی اپنا بہت وقت دیا حضور والاشان شہزادہ برار اور شہزادی برار کی نمایش میں رونق افروزی میں نواب زین یار جنگ بہادر کے توسط کو بڑا دخل تھا، اور ان کے ملاحظہ نمایش کے وقت بھی وہ موجود تھے۔

نمایش گاہ میں عارضی ٹیلیفون قایم ہونے سے بڑی سہولت رہی اور یوم خواتین کو اس کی ایک شاخ باہر مردانے میں قایم ہوئی۔ جناب مرزا مصطفےٰ بیگ صاحب مہتمم محکمۂ ٹیلیفون نے اس میں بڑی دلچسپی لی اسی طرح سے نل کی بھی عارضی طور پر احاطۂ نمایش میں کئی شاخیں قایم ہوئیں مسٹر فریدون سہراب جی چینائی نے اس خصوص میں بڑی مدد کی۔ نمایش کے افتتاح سے ایک روز پہلے سے ہی کوتوالی کا پہرہ مامور کر دیا گیا۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر نے ہر جہتی طور پر بڑی امداد فرمائی راہ رو نیز داخلے کے انتظامات میں کوتوالی کے اشتراک عمل سے بڑی آسانی ہوئی۔ نواب رحمت یار جنگ بہادر نے دو دن کے لیے کوتوالی کا بینڈ بھی عطا فرمایا، اور عہدہ داران کوتوالی بلدہ کے علاوہ حامد الدین صاحب صدر امین سمت نے بھی بڑے ہی تعاون سے کام کیا۔

محکمۂ ریلوے نے ریل کے کرایے میں اور نیز ریلوے بسوں کی حد تک رعایتی ٹکٹ جاری کیے۔ نمایش میں، ان کا ایک پبلسٹی اسٹال بھی قایم ہوا تھا جسے خاص طور پر باب الدخلہ میں جگہ دی گئی تھی اس ضمن میں میجر سلاٹر اور

مسٹر مشتاق احمد کی کمیٹی خاص طور پر مشکور ہے۔ نمایش گاہ میں مسرس کیو برادرس کے غازی نے اپنا ایک ریڈیو اسٹال قایم کیا تھا کہ جہاں سے وقت بہ وقت کمیٹی نمایش کی طرف سے محمد فاروق صاحب کیمپ افسر اطلاعات نشر کرتے تھے۔

پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر سے ایک ہاتھی معہ ہودج اور کئی اونٹ مستعار ملے۔ اسی طرح جناب شمشیر نواز جنگ بہادر کے علاقے سے بھی ایک ہاتھی اور اونٹ مستعار ملا کہ جو بازیچے میں نمایش کو آنے والوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث رہے۔ مسٹر سری دھر نایک نے دو کشتیاں دیں کہ جو یکساں طور پر باعث دلچسپی۔ ایک ہاتھی کا ہودج نواب بہادر یار جنگ کے ہاں سے ملا۔

ناظم صاحب آثار قدیمہ اور مولوی محمد احمد صاحب مہتمم عجایب خانہ کو اوقات نمایش کے موافق کرکے نیز عجایب خانے کے سامان کو نمایش گاہ سے جلد منتقل کرکے بڑا تعاون کیا۔ نصیر الدین حیدر صاحب مہتمم فراش خانہ عامرہ سے بھی بڑی مدد ملی۔

نمایش میں مختلف صناعوں نے شرکت کی۔ جملہ (۸۵) اسٹال قایم ہوئے تھے۔ اس نمایش میں چرمی سامان۔ صابون۔ روغن۔ ظروف۔ بیدری صنعت۔ فرنیچر و چوبی کام۔ ادویات سگریٹ۔ کھلونے کاغذ سازی و صنعت کاغذ۔ دست کاری۔ ملبوسات اور پارچہ جات۔ نقاشی تصویر کشی۔ ڈرائنگ۔ خطاطی اور طباعت۔ برش۔ آہنی اشیاء۔ چاندی و سونے کے زیورات شیشہ و چینی کی اشیاء جلد سازی۔ بید بافی۔ ٹوپیاں بکری کے علاوہ قدیم مصنوعات کے بھی شعبہ جات قایم کیے گئے تھے۔ معاشی کمیٹی کی جانب سے بھی ایک اسٹال قایم کیا گیا تھا جس میں خواتین اور طلباء کے تیار کردہ مصنوعات اور گھریلو صنعتیں رکھے گئے تھے۔ اس میں خصوصیت سے محترمہ صغرا ہمایون مرزا، اور مس سعیدہ ضمیر الدین صاحب کا نام قابلِ تذکرہ ہے۔ بہ لحاظ تعداد فروخت اشیاء یہ کوشش بہت کامیاب رہی۔ خواجہ حمید احمد صاحب اور سید علیم اللہ صاحب قادری متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ نے اس اسٹال میں رضاکارانہ طور پر کام کیا۔ علاوہ ازیں محکمہ ہائے صنعت و حرفت۔ محابس جنگلات نے نمایش میں اپنی جانب سے اسٹال قایم کیے تھے۔

ناظم صاحب آبکاری نے اندرون نمایش گاہ جو درخت تاڑیوں کے تھے ان کے قطع کرنے کی منظوری دی اور نارا بن گوڑہ ڈسٹلری سے تیار کردہ سامان کو بھی نمایش میں روانہ کرنے کا حکم دیا جو عدم گنجایش مسرس عبدالرزاق کے اسٹال ہی میں رکھا گیا۔ محکمہ صنعت و حرفت کے ٹکسٹائیل اکسپرٹ مسٹر ناگنا تھ نے شروع سے ہی نمایش سے دلچسپی لی۔ اور اس کا بڑا افسوس ہے کہ عین یوم افتتاح کو ان پر فالج کا اثر ہو گیا

خدا کرے کہ ان کو صحت کلی حاصل ہو۔ نمایش کے افتتاح سے ایک روز پہلے تک بھی ایک طرف یہ حال تھا کہ مزید درخواستیں وصول ہو رہی تھیں اور ان کے لیے اندرون عمارت صحن پر عارضی سائبان تیار ہو رہے تھے۔ دوسری طرف بعض اسٹال جن کو مختلف صناع صاحبان کے حوالے کر دیا گیا تھا، ابھی سجائے نہیں گئے تھے دراصل یہ اس لیے تھا کہ ان کو اس کے لیے صرف چند گھنٹے درکار تھے بر ایں ہم محمد علی خاں صاحب نایب معتمد نے موٹر میں شہر بھر کی ایک چکر کر لی ان کے واپس ہونے تک ہر اسٹال میں سجاوٹ شروع ہو چکی تھی۔

نمایش کے افتتاح کی پہلی رات کو نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے جملہ رضاکاروں کو نمایش گاہ میں ضیافت ڈنر پر مدعو کیا کیونکہ ان کو پھر ساری رات مصروف رہنا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس رات کو تمام شب روشنی رہی اور رہر ہر اسٹال میں سامان لایا جاتا رہا۔

افتتاح کا وقت ۹ر آذر ۱۳۳۵ف کو دن کے ۹ بجے سے مقرر تھا، بحمد اللہ اس وقت تک جملہ انتظامات کی تکمیل ہو چکی تھی اور ایک ممتاز مجمع کے سامنے ہز اکسلنسی سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر نے مسٹر تاراچند کی پیش کردہ نقروی چابی سے نمایش کا افتتاح کیا اور پوری تفصیل کے ساتھ ملاحظہ بھی کیا۔ یہاں سے نواب صاحب ٹاون ہال تشریف لے گئے اور کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے نمایش سے متعلق اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کیا۔ ممدوح الشان کی اس تقریر کا ابتدائی حصہ قابل ملاحظہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:-

> "میں آپ کی نمایش کے نہایت اچھے نقوش اپنے ساتھ لایا ہوں۔
> جس کوشش سے ملکی صنعتوں کے نمونے خواہ وہ صنعتیں دستی ہوں یا بڑے
> پیمانے کی، قدیم ہوں یا جدید فراہم کیے گئے ہیں، اور جس سلیقے سے
> انھیں ترتیب دیا گیا ہے اور ان کی نمایش کی گئی ہے اس کے لیے
> بانیانِ نمایش قابلِ مبارک باد ہیں وہ جملہ کارخانہ دار وصناع بھی
> جنھوں نے اس نمایش کی کامیابی میں حصہ لیا ہے لایقِ ستایش ہیں۔"

کمیٹی نمایش نے بعض بہی خواہ احباب کے اصرار کے باوجود بہ خیال افادہ عوام داخلہ صرف ایک آنہ رکھا تھا۔ فی الجملہ اس کی وجہ تیس ہزار مرد اور پانچ ہزار سے زاید خواتین نے نمایش دیکھی اور اور اس کی وجہ مصنوعات کی تشہیر و سرپرستی میں بڑی مدد ملی۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب رکن بلدیہ اور

سید شہاب الدین صاحب ید اللہی نے رضا کارانہ طور پر نمائش کی تشہیر کا کام اپنے ذمے لیا تھا۔

زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر نمائش کے ٹکٹ ہائے داخلہ میں سے بہ ذریعہ قرعہ اندازی تین تین ٹکٹوں پر انعامات دیے گئے، وہ اس طرح کہ رقم انعام سے مصنوعات خرید کر دی جاتی تھیں۔

علاوہ کوتوالی بلدہ کے علاقہ فوج بے قاعدہ کا بیانڈ کمانڈر نواب قدرت نواز جنگ بہادر کی مہربانی سے چار دن آتا رہا۔ علاقۂ فوج کا ایک روز آیا، اور علاقۂ کوتوالی کا بیانڈ ایک روز تھا۔ کشافہ لڑکوں نے بھی ایک روز مظاہرہ کیا۔ اس ضمن میں نواب صمد یار جنگ بہادر بر گیڈیر۔ قادر یار جنگ بہادر مسٹر ہالنس مولوی سید محمد حسین جعفری صاحب اور سید محمد ہادی صاحب کا شکریہ واجب ہے۔ یوم اطفال کے موقعے پر کہ جب داخلہ صرف تین فلوس کر دیا گیا تھا اکثر مدارس سرکار عالی نے جلد برخاست کیا تھا نمائش میں بہت سارے امدادی مدارس کے طلبا کا بغیر اوقات میں مفت داخلہ رہا۔ ہر رات نمائش کے ختم ہونے کا اعلان ملکی آتش بازی سے کیا جاتا تھا۔ ابتدا میں نمائش آٹھ بجے ختم ہوتی تھی مگر بعد میں معروضہ پیش ہونے پر اجازت ملی کہ دس بجے تک نمائش رکھی جائے۔ اور نیز دیوالی کی تعطیلات میں بھی اس کو جاری رکھنے کی اجازت عطا ہوئی۔ ان امور کے لیے نیز یوم خواتین کے انعقاد کی اجازت کے حصول میں عالیجناب نواب کاظم یار جنگ بہادر کی توجہات کو بڑا دخل رہا۔

نمائش میں حضور والا شان ولی عہد بہادر اور حضرتہ شہزادی برار کے علاوہ مہاراجہ یمین السلطنت بہادر نواب کمال یار جنگ بہادر۔ نواب مہدی جنگ بہادر امرائے عظام میں، اور وزرائے سلطنت میں نواب سر عقیل جنگ بہادر۔ نواب فخر یار جنگ بہادر۔ نواب مرزا یار جنگ بہادر اور مسٹر گرافٹن کی تشریف آوری قابل تذکرہ ہے۔ نواب کمال یار جنگ بہادر نے نو دو سو روپیے کا عطیہ بھی نمائش کمیٹی کو مرحمت فرمایا۔

فروخت ٹکٹ داخلہ کی حد تک محمد علی خاں صاحب عبد الرحیم صاحب جھندرجی صاحب کلیم الدین صاحب انصاری محمد غوث صاحب معتمد انجمن طیلسانئین عثمانیہ اور رام راؤ صاحب نے خاص طور پر بڑی محنت اٹھائی۔ اسی طرح تفریحات کے ٹکٹوں کی فروخت پر عبد الہادی صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ اور قاضی شمس الدین صاحب نے بڑا وقت دیا۔ دفتر نمائش میں سالمین بن عمر صاحب نے بہت کام کیا۔ ایام نمائش میں رضا کاروں کے رفرشمنٹ کا انتظام محمد علی صاحب ام اے کے ذمے تھا۔

مصنوعات پر عطائے اسناد کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی گئی تھی جس میں مسٹر گرافٹن۔ راجہ بہادر

بشیشر ناتھ۔ نواب زین یار جنگ بہادر۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر۔ مولوی سید فضل اللہ صاحب پی سی ایس۔ نواب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب شریک تھے، اور بہت ہی تفصیل سے غور و خوض کیا جاکر یہ امر طے ہوا اس کا علحدہ اعلان کیا جا چکا ہے۔

نمایش کا انعقاد، بجائے خود کتنا ہی سودمند کیوں نہ ہو عملاً رائیگاں ہوتا اگر صناعوں کے اجتماع اور مصنوعات کے مظاہرے سے کچھ ٹھوس علمی اور تحقیقی کام کی ابتدا نہ کی جاتی چنانچہ اس کے لیے خواجہ حمید احمد صاحب بی اے نے ڈائرکٹری کی ترتیب کا ذمہ لیا ہے اور اس کے لیے ہر ہر صنعت سے متعلق تفصیلی اعداد فراہم کر لیے گئے ہیں اس کے لیے ہر ہر اسٹال کا فوٹو بھی لیا گیا ہے۔

ہر ہر صناع کی مشکلات اور دقتوں نیز ان کے مال کی نکاسی وغیرہ سے متعلق تفصیلات کی فراہمی کے لیے مرزا عبدالباسط بیگ صاحب سیول سروس کلاس نے ایک سوال نامہ بھی مرتب کیا تھا اور مسرت کا مقام ہے کہ باوجود نمایش کی مصروفیت کے ہر ہر صناع نے اس کے جوابات دیے ہیں ان سب کو مرتب کیا جا رہا ہے تاکہ ان پر مناسب کارروائی ہوسکے۔

ان سب کے سوا صناعوں کی اور نیز کارکنانِ نمایش اور عہدہ دارانِ محکمۂ صنعت و حرفت کی ایک کانفرنس بھی بہ تاریخ ۱۸ آذر ۱۳۴۸ف شام میں اندرون احاطہ نمایش گاہ زیر صدارت میر محمود علی صاحب صدر معاشی کمیٹی منعقد کی گئی اور اس میں جتنی بھی تقاریر کی گئیں ان میں اس امر پر اتفاق رائے رہا کہ صناعوں اور کاری گروں کا کسی مرکزی ادارے سے متعلق رہنا مناسب ہے تاکہ اجتماعی طور پر ان کی مشکلات کا اظہار ہو اور نیز علمی تحقیق کی رو سے ان کی صنعت کی ترقی کے وسایل فراہم ہوں اور اس غرض کے لیے معاشی کمیٹی کو موزوں قرار دیا گیا چنانچہ کئی اصحاب معاشی کمیٹی میں شریک ہو چکے ہیں۔

اس جلسے کا مقصد ملکی صنعتی ترقی میں جو رکاوٹیں حایل ہیں انھیں معلوم کر کے مناسب تجاویز پر غور کرنا تھا۔ جلسے کی کارروائی کا آغاز محمد فاروق صاحب پی سی ایس کی تقریر سے ہوا موصوف نے نمایش کے انعقاد کی ضرورت اس کی اہمیت اور کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں امیر علی خاں صاحب مارکٹنگ آفیسر سرکارِ عالی نے ایک مختصر اور جامع تقریر کی۔ صاحب موصوف نے کہا کہ سرکارِ عالی ہمیشہ صنعتوں کی امداد کے لیے آمادہ رہتی ہے، ضرورت ہے کہ عوام بھی اس طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اضلاع کے صناعوں کے لیے ایک مرکزیت کی ضرورت ہے، اور خواہش ظاہر کی کہ جملہ صناع معاشی کمیٹی کے رکن ہو جائیں۔

خواجہ حمید احمد صاحب بی اے نے معاشی کمیٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ صناع جامعہ عثمانیہ کے طلباء کو تحقیقات کا موقع دیں اور معاشی پیمایش (سروے) میں ان کی اعانت کریں۔ اس کے بعد تجمل حسین صاحب یم یس سی مالک کارخانہ کلے ورکس نے معاشی کمیٹی کی جد و جہد کی ستایش کرتے ہوئے ملک کی عام حالت کا ذکر کیا اور ہر طرح کمیٹی کی مدد پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ جناب غلام غفار صاحب نے کہا کہ نمایش سے صناعوں کا فایدہ ہوتا ہے۔ موصوف نے بیان کیا کہ بیدری صنعت کی بہتری کے سلسلے میں بعض کام کی باتیں انھیں اس نمایش میں مل گئیں۔ اس کے بعد ممتاز الدین صاحب نمایندہ امیر سوپ فیاکٹری نے اپنے کارخانے کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ شہرِ فنہ صناعوں کے لیے اس نمایش کی بہ دولت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے صناعوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انعقاد نمایش کے سلسلے میں صناعوں اور کارخانہ داروں کو جو زحمت ہوئی اس کا مقصد یہ تھا کہ آیندہ ان صنعتوں کی بہتری کے لیے کوئی تدبیر ہو سکے۔

خواتین کے اصرار پر نہایت تامل کے بعد جمعہ ۱۶ر آذر کو پردہ دن رکھا گیا تھا جس دن اندرون حدود نمایش گاہ تمام انتظامات بالکلیہ خواتین ہی کے ذمے تھے مسرت اور اطمینان کی بات ہے کہ یہ دن خیر و خوبی کے ساتھ گزرا۔ باوجودیکہ خواتین ہزاروں کی تعداد میں نمایش دیکھنے آئی تھیں خواتین رضا کاروں کے حسنِ انتظام کی وجہ سے کوئی حادثہ پیش نہ آیا، اور نو بجے سے قبل ہی تمام اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔ بیگم مہدی نواز جنگ کی سرکردگی میں خواتین رضا کاروں نے ٹکٹ فروشی تنقیح ٹکٹ، اسٹالوں کی نگرانی و فروخت اشیاء و تفریحات کا جس حُسن و خوبی کے ساتھ انتظام فرمایا وہ بہت قابلِ قدر و لایقِ ستایش تھا اور شاید ان کے اشتراکِ عمل اور احساسِ تعاون کی عدم موجودگی میں نمایش ہرگز کامیاب نہ ہو سکتی۔

نمایش میں ٹکٹوں کی فروخت و تنقیح وغیرہ مس پلومن، مس نندی، مس بہروچہ سے متعلق تھی جنھوں نے اپنی گرل گائیڈز اور طالبات کی مدد سے قابلِ تعریف طریقے پر اپنے فرایض کو بلا رو و رعایت انجام دیا۔ مس پلومن نے دفتر میں اپنے کام کو نہایت سلیقہ و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اسٹالوں کی نگرانی اور رفرشمنٹ کا انتظام مسز پلے کے ذمے تھا جسے انھوں نے اپنی رضا کار خواتین کے ساتھ بہ حُسن و خوبی پورا کیا۔ سینما، کشتی رانی و دیگر تفریحات کا انتظام مسز دادابھائی اور ان کی رضا کار خواتین کے سپرد تھا جس عمدگی کے ساتھ وہ اپنے نازک فرایض سے سبک دوش ہوئی ہیں وہ نہایت لایقِ ستایش تھا۔ اس تمام

انتظام میں گرل گائیڈز اور طالبات کلیۂ اُناث کے علاوہ دوسری خواتین نے رضا کارانہ خدمات انجام دے کر اپنے احساسِ شہریت کا ثبوت دیا ہے جن خواتین کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ مسز حسین علی خاں مسز آمنہ پوپ۔ مسز فاروق۔ مسز ڈاکٹر مقبول علی مس مہدی یار جنگ اور مس حیدر علی خاں اور مسز پلوسن سے بھی انتظام میں بڑی مدد ملی بیگم مہدی نواز جنگ نے جس دلچسپی، انہماک۔ ایثار اور حسنِ انتظام کا ثبوت دیا ہے اس سے خواتینِ دکن کا مستقبل نہایت خوش آیند نظر آتا ہے۔

۱۸ آذر ۱۳۴۷ف کو نمایش بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ افتتاح رایٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر کے ہاتھوں ہوا تو ختم ہونے والی رات ہز ہائینس والاشان شہزادہ برار و ہز ہائینس شہزادی برار کی رونق افروزی یادگار رہی اس روز شب میں نواب علی یاور جنگ معتمد اُمور دستوری نے پروفیسر اسد انصاری اور ان کے ساتھیوں اور بعض رضا کاروں کو انعامات تقسیم کیے۔

دوسرے روز صبح میں مظاہرہ کنندگان کی طرف سے کارکنانِ نمایش کو چاہ نوشی پر مدعو کیا گیا تھا اور اس موقعے کی مناسبت سے نواب رئیس جنگ بہادر معتمد صنعت و حرفت کو عطائے اسناد کے لیے زحمت دی گئی تھی مظاہرہ کنندگان کی طرف سے کارکنانِ نمایش کا شکریہ ہو چکنے کے بعد نواب اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ان کی تشریف آوری کے لیے نواب رئیس جنگ بہادر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے عطائے اسناد کی خواہش کی اور نواب صاحب نے اسناد تقسیم کرنے کے بعد اپنے تاثرات کا مختصر طور پر اظہار فرمایا کہ نمایش بہت ہی کامیاب رہی ہے اور اس کا مقابلہ بہت اچھی طرح سے لکھنؤ۔ لاہور کی نمایشوں سے کیا جا سکتا تھا، اور یہ توقع کی کہ ہر سال معاشی کمیٹی نمایش کا انعقاد کیا کرے گی۔

آخر پر ایک گروپ فوٹو بھی کارکنانِ نمایش اور مظاہرہ کنندگان کا لیا گیا۔ اختتام پر نمایش کے متعلق بعض حضرات کی رائے قابلِ ذکر ہے:۔

۱ اپنی نوعیت کی کامیاب نمایش	ہز اکسلنسی سر صدر اعظم بہادر سرکار عالی
۲۔ ایسی ہی کوششیں مُلک کی ترقی کے لیے کرنی چاہئیں۔	حضرتہ شہزادی دُرِ شہوار بیگم صاحبہ
۳۔ آپ نوجوانوں سے ہی مُلک کی ترقی کی توقع ہو سکتی ہے۔	ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر

۴۔ نمائش کا ہر شعبہ قابلِ تعریف ہے، دعا کرتی ہوں کہ یہ ترقی عروج پر رہے۔	مسز خدیجہ شفیع طیب جی
۵۔ بہت اچھا مظاہرہ۔	نواب سر عقیل جنگ بہادر
۶۔ نہایت کامیاب کوشش	مسٹر گرافٹن صدر المہام مال و پولیس
۷۔ نمائش بلاشبہ کامیاب رہی لیکن اس کے بعد کا کام اور زیادہ اہم ہے۔	نواب ناظر یار جنگ بہادر
۸۔ توقع سے زیادہ نمائش کامیاب رہی۔	نواب مہدی نواز جنگ بہادر
۹۔ نمائش بہ آسانی لکھنؤ و لاہور کی آل انڈیا نمائش کا مقابلہ کر سکتی ہے۔	نواب زین یار جنگ بہادر
۱۰۔ نمائش کی بہ دولت بعض صنعتوں کے وجود کا پہلی مرتبہ علم ہوا۔	مولوی سید فضل اللہ صاحب ناظم امداد باہمی
۱۱۔ گذشتہ پندرہ سال میں ملک نے جو صنعتی ترقی کی ہے اس کا مکمل مظاہرہ۔	مولوی محمد بیگ صاحب اول تعلقدار باغات
۱۲۔ جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی زندگی کا بہترین ثبوت۔	پروفیسر الیاس برنی ناظم دار الترجمہ
۱۳۔ سرکار عالی اور رعایا برایا کے تعاون عمل اور اشتراک کا بہ درجہ تم مفید ثمرہ۔	نواب میر اکبر علی خاں بار ایٹ لا
۱۴۔ حیدر آباد کے نوجوانوں نے اپنی کوشش و محنت سے بہت اچھی نمائش کی۔	صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ

اسی طرح پر نمائش کا کامیاب انعقاد بلاشبہ اس کا اظہار ہے کہ ملک بہ درجہ اتم اس کے لیے آمادہ تھا۔ محکمہ ہائے سرکاری کا خاطر خواہ تعاون نمائش کی کامیابی کا دوسرا سبب ہے کہ جس کے لیے نواب میر اکبر علی خاں بیرسٹر ایٹ لا اور مولوی سید احمد محی الدین صاحب ناظم سررشتۂ صنعت و حرفت کی سرگرم اور موفور مساعی قابلِ تشکر ہیں یہاں یہ امر قابلِ اظہار ہے کہ انڈسٹریل ٹرسٹ فنڈ سے نمائش کو ایک ہزار روپیے کی گراں قدر امداد ملی جو معاشی کمیٹی کے

کاروبار میں قابلِ اطمینان سرگرمی پیدا کرنے کا باعث ہوا۔

ان دو اسباب سے قطع نظر کارکنانِ نمائش کارضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو شبانہ روز نمائش کے لیے اس طرح وقف کر دینا بھی کہ نہ گھر بار کی فکر تھی نہ ہی کھانے پینے کی سدھ رہی تھی، نمائش کی کامیابی کا ذمہ دار رہا۔

---

(۱) محمد عبدالرحیم بی اے (عثمانیہ) معتمد (۲) شنکر جی بی اے (عثمانیہ) معتمد نمائش (۳) محمد شرف الدین بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی حیدرآباد

۸۶

مرکز مصنوعاتِ ملکی معاشی کمیٹی حیدرآباد امداد باہمی محدود

معاشی کمیٹی کے زیر اہتمام مرکز مصنوعاتِ ملکی کا قیام عمل میں آیا ہے اور انجمن ہائے امداد باہمی سرکار عالی کے تحت اس کی رجسٹری کرائی گئی ہے۔

اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اراکین ادارہ ہذا کو باہمی اتفاق و اتحاد سے کام کرنے کا عادی بنانا (۲) معاشی کمیٹی حیدرآباد کے قیام کے اغراض کو عملی جامہ پہنانا۔ (۳) ملکی مصنوعات کو ترقی دینا اور ان کی مانگ اندرون و بیرونِ ملک پیدا کرنا (۴) دکان ملکی مصنوعات معظم جاہی مارکٹ کے انتظامی و مالی اُمور کو اپنے ذمے لینا اور انجام دینا (۵) صناعوں کی امداد کے لیے اتحادی اصول پر بنک کا قیام (۶) ایسے معاشی ادب (لٹریچر) کا شایع کرنا جس سے ملک کے قدرتی وسایل کا علم ہو سکے اور ان سے استفادہ اور ان کا وسیع استعمال (۷) باشندگانِ ملک کو مصنوعاتِ ملکی کے استعمال کی ترغیب دلانا، اور ارکانِ ادارہ کو حتی الوسع اس کے استعمال پر پابند کرنا۔

ہر وہ شخص جو معاشی کمیٹی کا رکن ہو ادارۂ ہذا کا حصہ دار ہو سکے گا۔

ادارۂ ہذا کا سرمایہ ۲۵ ہزار روپیے سکۂ عثمانیہ کے (۲۵۰۰) حصص پر مشتمل ہے۔ فی حصہ دس روپیے سکۂ عثمانیہ کا ہے۔
تفصیلی قواعد اور حصص کے فارم معظم جاہی مارکٹ (دکان نمبر ۸) یا دفتر معاشی کمیٹی عابد روڈ سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

ششماہی رپورٹ انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد دکن

آذر تا اردی بہشت ۱۳۴۸ف

"انجمن طیلسانین عثمانیہ نے اپنی جدوجہد کے اور چھ ماہ کامیابی کے ساتھ ختم کر لیے ہیں،
ان چھے مہینوں میں جو کام انجام دیا گیا ہے اس کی مختصر روئیداد پیش کی جاتی ہے۔"

کابینہ کی تشکیل میں اس مدت کے دوران میں کوئی تغیر عمل میں نہیں آیا، اس کی تشکیل حسب ذیل ہے:۔

نام	عہدہ	نام	عہدہ
۱۔ ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی۔	صدر	۷۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب جاگیردار	رکن
۲ مولوی سید محمد احسن صاحب	نایب صدر	۸۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر	"
۳۔ مولوی محمد غوث صاحب	معتمد	۹۔ رائے مہندر راج صاحب سکسینہ	"
۴۔ رائے شنکرجی صاحب بی اے	نایب معتمد	۱۰۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب	"
۵۔ مولوی محمد علی صاحب یم اے	خازن	۱۱۔ راجہ رائے گردداس صاحب جاگیردار	"
۶ مولوی محمد عبدالمجید صاحب صدیقی	رکن	۱۲۔ رائے شنکر موہن لال صاحب ماتھر	"

اس ششماہی میں کابینہ کے (۹) اجلاس ہوئے اور اس نے (۶۵) اُمور پر غور کیا حسب سابق انجمن کے کاروبار کو دو بڑی نوعیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو وہ اُمور جن کے متعلق خود انجمن کی جانب سے عملی طور پر کام کیا جاتا ہے، اور دوسرے وہ اُمور جن کے متعلق انجمن سرکار عالی اور دوسرے عام اداروں کو مفاد ملک کے مسایل میں توجہ دلانے کا فرض انجام دیتی ہے۔

انجمن کا اندرونی کام مستقل طور سے چند ملحقہ جماعتوں میں تقسیم کر دینے کا تجربہ اب عملاً بہت کامیاب ہو چکا ہے

اس قسم کی ملحقہ جماعتوں میں مجلس علمیہ عثمانیہ بلدی جماعت اور معاشی کمیٹی مستقل طور سے موجود ہیں اور اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

عثمانیہ بلدی جماعت | عثمانیہ بلدی جماعت کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب مددگار باب حکومت صدر
۲۔ مولوی محمد کرامت علی صاحب بی اے معتمد
۳۔ مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب یم اے شریک معتمد
۴۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی رکن
۵۔ پنڈت پریم جی لال جی صاحب رکن
۶۔ پنڈت گنڈے راؤ صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن
۷۔ مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے۔ رکن
۸۔ پنڈت سری دھر نایک صاحب بی اے۔ رکن
۹۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۰۔ رائے مدن موہن لال صاحب بی اے۔ ال ال بی رکن
۱۱۔ مولوی محمد غوث صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۲۔ مولوی ابوالخیر صاحب صدیقی بی یس سی۔ رکن
۱۳۔ صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن
۱۴۔ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب جاگیردار۔ رکن
۱۵۔ مولوی سمیع احمد صاحب رکن
۱۶۔ راجہ رائے گردداس صاحب بی اے۔ ال ال بی جاگیردار۔ رکن
۱۷۔ حکیم دوارکا پرشاد صاحب جاگیردار۔ رکن
۱۸۔ مولوی میر محمد علی خاں صاحب منصب دار۔ رکن

عثمانیہ بلدی جماعت کی جانب سے بلدیہ میں جو ارکان موجود ہیں وہ بلدی سود و بہبود کے کاروبار میں پوری سرگرمی سے منہمک ہیں۔ جماعت کی مجلسِ عاملہ نے طے کیا ہے کہ بلدیے کے کام کے سلسلے میں جماعت کے ارکان

بلدیہ سے یکجہتی اور نظم کا زیادہ بہ زیادہ اظہار ہو، اس غرض سے مجلس عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ بجز ان مسایل کے جن کے متعلق مجلس عاملہ عثمانیہ بلدی جماعت خود تصفیہ کرے دیگر تمام مسایل متعلقہ بلدیہ کا تصفیہ مجلس بلدیہ کے ان ارکان کی کمیٹی کرے گی جو جماعت ہذا کے رکن ہوں، اس کمیٹی کے تصفیہ کے وہ تمام ارکان بلدیہ پابند ہوں گے جو جماعت ہذا کے رکن ہیں مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے رکن مجلس بلدیہ اس کے معتمد قرار دیے گئے ہیں۔ اس جدید انتظام سے زیادہ بہتر نتایج پیدا ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مجلس عاملہ نے طے کیا ہے کہ بلدیہ کے اندر اراکین عثمانیہ بلدی جماعت میں ڈسپلن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ قواعد مدون کیے جائیں اس غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے جو توقع ہے کہ جلد اپنا کام ختم کر دے گی۔

سال حال بھی ایک بلدی کانفرنس زیر صدارت نواب مرزا یار جنگ بہادر بہ مقام باغ عامہ منعقد ہوئی۔

معاشی کمیٹی | معاشی کمیٹی نے اپنے اہتمام سے مصنوعات ملکی کی نمائش منعقد کی، ارکان کمیٹی دیگر ارباب کار اور رضاکاران نے جس سرگرمی محنت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے آیندہ کے لیے بہت ہمت افزا اور ایک فال نیک ہے اس نمائش سے ثابت ہو گیا ہے کہ طیلسانی برادری میں عمل کی کیا کیا قوتیں پنہاں ہیں ہاں ضرور یہ کہ استقلال اور اخلاص عمل کے لیے کامیابی کے ابھی بہت سارے میدان موجود ہیں کمیٹی نے مصنوعات ملکی کی نکاسی کے مواقع پیدا کرنے اور صناعوں کی سہولت کے مد نظر ایک دکان معظم جاہی مارکٹ میں کھولی ہے۔ قانون انجمن ہائے امداد باہمی کے تحت اس کو بطور ایک علیحدہ ادارہ کے رجسٹر کیا جا رہا ہے ہرچند ابھی اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے لیکن توقع ہے کہ بہت جلد کام کا ایک مضبوط سلسلہ قایم ہو جائے گا۔

معاشی کمیٹی کی مجلس عاملہ کی تشکیل حسب ذیل ہے :-

۱۔ مولوی میر محمود علی صاحب ام اے۔ صدر

۲۔ مولوی محمد شرف الدین صاحب بی اے۔ معتمد

۳۔ مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے۔ شریک معتمد

۴۔ مولوی محمد فاروق صاحب ایچ سی یس۔ رکن

۵۔ مولوی محمد علی صاحب یم اے۔ رکن

۶۔ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے۔ رکن

۷۔ مولوی محمد غوث صاحب یم اے۔ ال ال بی۔ رکن

۸۔ مسٹر نرسنگ راؤ اڈیٹر رعیت۔ رکن

۹۔ رائے شنکر جی صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن

۱۰۔ رائے مہندر راج صاحب یم یس سی۔ رکن

۱۱۔ مولوی سید محمد احسن صاحب بی اے۔ ال ال بی۔ رکن

مجلس علمیہ کابینہ نے طے کیا ہے کہ مجلس علمیہ کے لیے بھی علٰحدہ قواعد مرتب ہوں اور اُس کے کام کو بھی انجمن کے ایک مستقل شعبے کے طور پر چلایا جائے، اب تک مجلہ طیلسانئین اس مجلس کے اہتمام میں شایع ہوتا تھا چنانچہ اب تک اس کی دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں جن کے ذریعے یم اے کے امتحان کے لیے لکھے ہوئے تین مقالے مجلس علمیہ نے شایع کر دیے۔

انجمن طلبائے قدیم انجمن کی کابینہ نے انجمن سے ملحق ایک انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی جانب سے قواعد کا جو مسودہ پیش ہوا، اس کو جلسۂ عام میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قرارداد کابینہ نے ملک کے موجودہ حالات کے مدِنظر ایک قرارداد بھی منظور کی جو حسب ذیل ہے:۔

"انجمن طیلسانئین عثمانیہ خانوادۂ آصفیہ کے زیر سایۂ عاطفت ملک کی دستوری اصلاح و ترقی میں یقین رکھتی ہے، لیکن جو غیر دستوری طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں اُن کو ناپسند کرتی ہے۔ انجمن ان دہشت ناک واقعات کو جو چند روز سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں نہایت شرم ناک تصور کرتی ہے اور اہل ملک و حکومت سے مستدعی ہے کہ ان دہشت ناک امور کے کامل طور سے دفع کرنے کے ممکنہ تدابیر اختیار کیے جائیں تا کہ ملک میں امن و سکون قایم رہے جو ہر قسم کی ترقی کے لیے شرطِ ابتدائی ہے۔"

زبان سرکاری کابینہ نے ایک تحریک پر غور کیا کہ دفاترِ سرکاری میں زبان سرکاری کے استعمال میں بہت غفلت برتی جاتی ہے، یہ امر مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں کافی جد و جہد کی جائے اس غرض سے کہ اس سلسلے میں مواد فراہم کیا جائے اور جد و جہد کی نوعیت تعین کی جائے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، اس نے جو رپورٹ پیش کی ہے

وہ یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے اس بارے میں کافی جد وجہد کرنی چاہیئے حسب ذیل اُمور طے کیے گئے۔

۱۔ زبان سرکاری کے متعلق احکام جمع کیے جائیں۔

۲۔ اس امر کی نسبت تا بہ حد امکان مواد فراہم کیا جائے کہ کن دفاتر میں انگریزی زبان مستقل ہے۔

۳۔ حکومت کو توجہ دلائی جائے کہ آیندہ مردم شماری کے موقعے پر تختہ جات اعداد شمار میں اُردو بولنے والوں کے تعداد کی صراحت کی جانی ضروری ہے۔

۴۔ حکومت کو توجہ دلائی جائے کہ سیول سروس جماعت کے جملہ پرچہ جات بہ استثنائے پرچہ جات انگریزی و ترجمہ زبان اُردو میں مرتب ہوا کرے اور منجملہ تین سوالات زبانی کے دو سوالات اُردو میں کیے جائیں۔ زبان انگریزی کو قطعاً ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے۔

۵۔ زبان کی پرچار کے سلسلے میں معتمدین سرکار عالی و معتمد باب حکومت کے پاس وفود بھیجے جائیں۔

۶۔ اعلحضرت، اور صدر اعظم بہادر کے پاس رعایا کی جانب سے محضر روانہ کیے جائیں۔

۷۔ صدر المہام بہادر فینانس کو زبان اُردو کی نسبت توجہ دلائی جائے۔

۸۔ مدیران جراید کے پاس وفود روانہ کیے جائیں۔

۹۔ اخبارات میں اطلاعات و مقالات مسلسل روانہ کیے جائیں۔

کابینہ نے یہ سفارشات منظور کر لیے ہیں اور ذیلی کمیٹی ان کو روبہ عمل لانے میں مصروف ہے۔

کانفرنس | ۱۳۴۲ف کی کانفرنس طیلسانین عثمانیہ بہت کامیاب ثابت ہوئی، گو ڈرامے کے متعلق توقعات پورے نہیں ہوئے لیکن بہ حیثیت عمومی کانفرنس نے اچھا اثر قایم کیا ہے۔ کابینہ نے قرار دیا ہے کہ آیندہ کانفرنس طیلسانین عثمانیہ اورنگ آباد میں منعقد کی جائے، چنانچہ وہاں اس کے لیے کام ہو رہا ہے، توقع ہے کہ کانفرنس بہت کامیاب ثابت ہوگی۔

کتب خانہ | انجمن کے کتب خانے میں سرکاری مطبوعات کا کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ کابینہ نے مناسب متصور کیا کہ کتابوں سے استفادہ کے لیے قواعد مرتب کئے جائیں، چنانچہ یہ قواعد بعد ترتیب منظور ہو چکے ہیں کتب خانے کا انتظام صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔

انجمن کے لیے کوپریٹو انشورنس سوسائٹی کی ایجنسی حاصل کی گئی ہے، چنانچہ محمد کلیم الدین صاحب انصاری، افضل علی صاحب۔ شیخ حسین محرر انجمن۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب صدر انجمن نے انجمن کے توسط سے بیمہ کرایا ہے

محسوس ہوئی ہے کہ اس کام کو خوب پھیلایا جائے کہ اس سے انجمن کو آمدنی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ اس کے کاروبار جناب رائے شنکرجی صاحب بی اے، ال ال بی کے سپرد کیے گئے ہیں۔

متفرق | اس ششماہی میں جدید (۱۴) ارکان نے شرکت کی اور اب انجمن کے جملہ ارکان کی تعداد (۵۰۲) ہے۔ سال حال ایک رکن دوامی کا اضافہ ہوا ہے۔ جناب صدر صاحب انجمن ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے جن کے ساتھ کام کرنے میں حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے اور جو اپنی سرگرمیوں اور انجمن کے کاروبار میں انہماک سے طیلسانی برادری کے لیے ایک مثال قایم کر رہے ہیں، سب سے اول (ص۵۰) روپیے عنایت فرمائے اور رکنیت دوامی قبول فرمائی ہے۔

حسابات کی تنقیح کے لیے کابینہ نے مولوی ذکی الدین صاحب صدیقی بی اے کو مقرر کیا ہے، موصوف تنقیح میں مصروف ہیں۔

کابینہ نے سال حال دفتر کے انتظام کو بدل دیا ہے، جز وقتی اہلکار برخواست کر دیے گئے ہیں اور ایک ہمہ وقتی محرر مقرر کر لیا گیا ہے اور نیز ایک ہمہ وقتی ملازم مقرر کرنے کی گنجایش موجود ہے، توقع ہے کہ اس انتظام سے انجمن کے کاروبار میں مزید وسعت اور خوبی پیدا ہوگی، اس عملہ سے معاشی کمیٹی اور عثمانیہ بلدی جماعت بھی اگر کام لینا چاہیں تو لے سکیں گے، یہ انتظام کیا گیا ہے کہ مذکورہ جماعتوں سے عملہ کے مد میں رقمی امداد بھی حاصل ہو سکے۔ کابینہ نے بہتر کارکردگی کے مدنظر ملازموں کی رخصت کے متعلق مستقل قواعد منظور کیے ہیں تاکہ کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔ دفتر کے لیے ایک ٹایپ رائٹر کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

کابینہ نے کام کے بہ عجلت انجام پانے کے مدنظر مدات صادر طباعت ٹکٹ ٹپہ کے اندر خرچ کرنے کا اختیار معتمد کے سپرد کر دیا ہے۔

سرکار میں جو تحریکات زیر دوران ہیں ان کے متعلق مراسلت جاری ہے۔ سال حال جامعہ عثمانیہ نے ریسرچ کی ڈگری کے قواعد منظور کر لیے ہیں جس کے متعلق کانفرنس میں تحریک منظور ہوئی تھی۔ طیلسانئین جامعہ عثمانیہ کو مجلس رفقا میں راست حق انتخاب ملنے کے لیے عرصے سے کارروائی جاری ہے۔ اب اطلاع ملی ہے کہ جامعہ کے لیے جدید دستور زیر منظوری ہے اس کی تکمیل پر یہ حق حاصل ہو سکے گا۔

دفاتر سرکاری میں ابتدائی گریڈ پر طیلسانئین کے تقرر کی صورت میں زاید ابتدائی یافت جو مقرر کی گئی ہے اس میں مزید توسیع عمل میں لانے کی نسبت کارروائی جاری ہے۔

"انجمن طیلسانئین عثمانیہ ہمارے قابلِ فخر جامعہ کے فرزندوں کو ایک جا جمع کرنے کی مبارک سعی میں مصروف ہے۔ . . . . فرزندانِ جامعہ کو اپنی اس انجمن کے ذریعے ایک جگہ جمع ہو کر ملک کی ترقی اور ملک کی خدمت کے مسایل سوچنے اور ان پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ . . . . . گو آپ کی انجمن قایم ہوئے چند ہی سال ہوئے ہیں لیکن اس نے اب تک بہت کچھ ٹھوس تعمیری کام انجام دیا ہے۔ . . . . . آپ کی کانفرنس ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی نمایندگی کرتی ہے جس سے ملک کو بڑی بڑی توقعات جائز طور پر وابستہ ہیں۔"

یہ وہ ہمت آفریں الفاظ ہیں جو عالی جناب نواب سر صدر اعظم بہادر نے طیلسانئین عثمانیہ کی چھٹی کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے ارشاد فرمائے۔ انجمن ابتدائے قیام سے جس طرح بھی بن آیا ملک کی ترقی کے لیے ہمہ تن کوشاں اور طیلسانئین کی برادری میں جذبۂ خدمت پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔ اور اب یہ کہنا خود ستائی نہیں ہے کہ ملک کے عام قومی اداروں کی صف میں انجمن کے لیے مناسب جگہ حاصل ہوگئی ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی کہنا ایک حقیقت ہے کہ ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ آج دنیا کے ہر حصے میں ایک برق آسا سرگرمی نمایاں ہے۔ قومیں ترقی کے منازل اس سرعت سے طے کر رہی ہیں کہ پیش روی کی ساری روئیدادیں افسانہ ہوتی جارہی ہیں حیدرآباد میں کام کرنے اور اس سے اچھے نتایج حاصل کرنے کے بیسوں مواقع حاصل ہیں۔ کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں نظر کے سامنے موجود ہیں، ضرورت ہے کہ طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور دام اور قدم کی اعانت میں ذرا تیز روی دکھائے ع

"کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں"

سالِ حال یہ اندیشہ ہے کہ مثل سال ہائے گذشتہ انجمن کا مالیہ متوازن نہ رہے گا حالانکہ متعدد امور کی انجام دہی پیشِ نظر ہے۔ سالِ حال اگر انجمن کی برادری صرف اپنا سالانہ چندہ اور گذشتہ بقایا ادا فرمائے تو انجمن کی ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ نیز یہ کہ ہر رکن انجمن صرف مزید ایک رکن کے اضافے کی کوشش عمل میں لائے۔

خاتمہ ۔ انجمن کے کاروبار کے چھ ماہ کی یہ ایک مختصر روئیداد ہے، اس چھ ماہ کے عرصے میں دفتری طور سے جو کام انجام پایا ہے اور جو مراسلت ہوئی ہے اور کابینہ نے کئی کئی گھنٹے جو کام کیا اس کی تفصیلات بہت طویل ہو جائیں گی۔

مختصر یہ ہے کہ کام کرنے اور اس سے اچھے نتایج حاصل کرنے کا ایک سنہری موقع ہمیں حاصل ہے۔ کامیابی کی بڑی بڑی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے پڑی ہیں، ضرورت صرف یہ ہے کہ ہماری طیلسانی برادری اپنی توجہ بڑھائے اور درم وقدم کی اعانت میں ذرا تیزی بتائے۔

محمد غوث معتمد انجمن

رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت

بابتہ سنہ ١٣٤٧ ف

عثمانیہ بلدی جماعت انجمن طیلسانئین عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ایک ملحقہ نظام ہے جس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز موجودہ قانونِ بلدیہ کے نفاذ سے قبل ہی سے کردیا تھا۔ قانونِ بلدیہ کے نفاذ سے دکن میں پہلی بار عام انتخابات کے اصول پر ارکان منتخب کیے جانے لگے۔

عثمانیہ بلدی جماعت کی ابتدا، آواخر سال ١٣٤٦ ف میں ہوئی۔ اس جماعت کے ابتداء ہی سے یہ اساسی اصول پیش نظر تھا کہ جماعت بندی کے اصول پر کام کیا جائے۔ اس جماعت نے اپنے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار دیے:-

الف۔ جو رقبہ حدود بلدیہ حیدرآباد میں شامل ہے اس کی بہبودی کی ہر جہتی کوشش کرنا۔

ب۔ اس رقبے کے حفظانِ صحت کے لیے ہر قسم کی ممکنہ جد و جہد کرنا۔

ج۔ اس امر کی کوشش کرنا کہ بلدیے کا مالیہ مستحکم ہو، اور غیر ضروری محاصل کا بار عاید نہ ہو۔

د۔ حتی الامکان بلدہ فرخندہ بنیاد کی صفائی، آب رسانی، روشنی، ڈرینج اور محلوں اور سڑکوں کی ترتیب، تنظیم اور اسی قسم کے دوسرے بلدی معاملات میں حیدرآباد کو اعلیٰ ترین معیار پر لانے کی کوشش کرنا۔

ھ۔ حیدرآباد کے شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس و شعور پیدا کرنا۔

و۔ بلدی انتخابات میں حصہ لینا۔

حیدرآبادی پبلک خصوصاً نوجوانانِ ملک میں بلدی فرائض کا احساس جس سرعت سے ترقی پذیر رفتار پر ہے [illegible] چند سال قبل بلدی امور سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا جاتا تھا، مگر

آج حالات کی رفتار بدلی ہوئی ہے۔ ملک میں ایک عام بیداری کی روح موجزن ہے۔ بلدی اُمور اور بلدی معاملات سے پبلک کو ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور یقیناً عثمانیہ بلدی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ ہے عثمانیہ بلدی جماعت ہی حیدرآباد دکن کا وہ واحد ادارہ ہے جو شہریوں کی خدمت گزاری اور شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس کی ساری بلدی کارگزاریوں کی تفصیل بیان کی جائے، لیکن مختصراً کارگزاریوں کی رپورٹ حسب ذیل ہے:۔

عثمانیہ بلدی کانفرنس بابتہ ۱۳۴۲ف

عثمانیہ بلدی جماعت کی دوسری سالانہ کانفرنس بہ صدارت عالی جناب راجہ بہادر بشیشرناتھ صاحب رکن عدالت عالیہ بہ مقام ریڈی ودیالہ ہاسٹل بتواریخ ۲۸ ر ۲۹ ر ۳۰ ر ذیحجہ ۱۳۴۲ف منعقد ہوئی۔ کانفرنس ہال پبلک اور مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ارکان بلدیہ اور دیگر ممتاز اصحاب نے شرکت کی جناب راجہ گرو داس صاحب بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) صدر استقبالیہ نے اپنا خطبہ سُنایا اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔

خطبۂ صدارت کے اختتام پر تحریک اظہارِ عقیدت بالاتفاق کھڑے ہو کر منظور کی گئی، اس کے بعد رائٹ آنریبل عالی جناب نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت۔ ہز اکسلنسی عالی جناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین سلطنت۔ نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) بار ایٹ لا مسٹر رنگا ریڈی صاحب رکن مجلس وضع قوانین۔ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی اے۔ ال ال بی صدر انجمن طیلسانئین عثمانیہ مسٹر ایل۔ این گپتا صاحب کے بیانات پڑھ کر سُنانے کے بعد مولوی عبدالحلیم بیگ صاحب معتمد عثمانیہ بلدی جماعت نے اپنی مطبوعہ دلچسپ رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت کی کارگزاریوں کی نسبت سامعین کے گوش گذار کی۔

رپورٹ کے ختم ہونے پر مولوی محمد فاروق صاحب بی اے (عثمانیہ) بی سی ایس مددگار ناظم بلدیہ نے "بلدیہ اور سالِ رواں" پر ایک تقریر کی جس میں موجودہ ناظم صاحب بلدیہ کے حُسنِ انتظام کا ذکر کیا گیا اور مختلف اسکیمیں جو اس وقت بلدیے کے زیرِ غور ہیں ان پر کافی روشنی ڈالی۔

اس تقریر کے اختتام پر ڈاکٹر مرزا حسن بیگ صاحب مددگار پبلک ہیلتھ آفیسر بلدہ نے بہ ذریعہ طلسمی فانوس تقریر کی، اس کے بعد پہلا اجلاس ختم ہوا۔

دوسرے دن یعنے ۲۹ ر ذیحجہ ۱۳۴۲ف کو مطاہرہ جاروب کشی کوچہ گلباغ میں ہوا، اور (۸) بجے صبح سے کانفرنس کے دوسرے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ چند تحریکات پیش ہوئیں اور ڈاکٹر مقبول علی صاحب بی اے (عثمانیہ)

سیول سرجن بلدہ نے فرسٹ اڈ پر اور مولوی عبدالغفار بیگ صاحب ڈسٹرکٹ سرجن نے غذا اور صحت عامہ پر اپنی پرُ از معلومات تقاریر کیں۔ اس دوران میں نمائش سواری ہائے کرایہ و جانوران بھی انجام کو پہنچی۔

تیسرا اجلاس ۲۹ رنبیر ۱۹۴۲ء کو شام کے پانچ بجے منعقد ہوا بنفیہ تحریکات پیش ہوئیں اور جناب پنڈت بی۔ین چوبے صاحب بی اے ال ال بی وکیل "بلدیہ اور بلدی جماعت" پر اور مولوی لئیق احمد صاحب نعمانی معتمد انجمن طلبہ طبیہ نے "طب یونانی" پر بسیط تقاریر کیں اور ملیریا آفیسر صاحب نے میجک لنٹرن کے ذریعے مرض ملیریا کے متعلق حفظانی تدابیر اختیار کرنے کے لیے معلومات بہم پہنچائے۔

چوتھا اور آخری اجلاس تیسرے دن ۳۰ رنبیر ۱۹۴۲ء کو شام میں (۴ ½) بجے شروع ہوا نمائش اطفال اور فوٹو ہوئی۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر ناظم بلدیہ نے شہری اخلاق و فرائض وغیرہ پر، مولوی سید عسکری حسن صاحب اسیسر بلدیہ نے بلدی ٹکس پر، مولوی عبدالحلیم بیگ صاحب معتمد عثمانیہ بلدی جماعت نے کچھ ہمارے اور کچھ بلدیے کے فرائض پر، اور مسز ہمایوں مرزا صاحبہ نے صفائی پر تقاریر کیں۔

اس کے بعد طوطیٔ ہند مسز سروجنی نایڈو نے باوجود ناسازیٔ طبع کے بلدی امور سے متعلق اپنی شیریں زبان میں تقریر کی اور شہریوں کو بلدی اغراض و مقاصد اور ذمہ داریوں سے واقف کراتے ہوئے نصیحت دی۔

بعد اختتام تقریر مسز سروجنی نے انعامات تقسیم فرمائے۔ پس کانفرنس کا یہ آخری اجلاس صدر کی اختتامی تقریر اور معتمد کانفرنس کے شکریے کے بعد اختتام کو پہنچا۔

ضروری امور جو کانفرنس میں رکھے گئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

نمائش | نمائش مصنوعات بلدہ، آرائش بلدہ، مصنوعات محبس، محکمۂ برقی، کارخانہ بید بافی، ریاض اسلام فیاکٹری، کارخانہ صندل، سگریٹ فیاکٹری، دکن بٹن فیاکٹری، دکن سن شیڈ کمپنی، مصنوعات کارخانہ پریم جی لال جی صاحب حیدرآباد آئرن اینڈ اسٹیل ورکس کمپنی، انٹرنیشنل ریڈیو کمپنی، سینیٹری انجینیرس وغیرہ۔

اس نمائش کی غرض و غایت یہ تھی کہ شہریوں کو حفظانِ صحت سے متعلق نہ صرف معلومات بہم پہنچائے جائیں بلکہ ان کی معاشی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے چنانچہ حفظانِ صحت سے متعلق نمائش کے ذریعے جہاں عوام کو کافی معلومات ہوئیں وہاں مصنوعات سے متعلق اداروں کو نہ صرف فائدہ ہوا بلکہ عوام بھی ایک خاص قسم کے خیالات ان صنعتوں کے متعلق اپنے ساتھ لے گئے۔

نمائش سواری ہائے کرایہ و جانوران | اس نمائش کی کامیابی کا انحصار محکمۂ بلدیہ پر ہے اور کانفرنس نے

(۱۹) انعامات تقسیم کیے۔

نمائش اطفال | اس کے انتظامات جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب و جناب پنڈت شنکر جی صاحب بی اے کے سپرد تھے جس کو صاحبان موصوف نے اچھے پیمانے پر کیا۔ کانفرنس کی جانب سے بچوں کو (۱۱) انعامات کے علاوہ تو ال۔ صابون اور کھلونے بھی دیے گئے اور فوٹو بھی لی گئی۔

مظاہرۂ جاروب کشی | اس کانفرنس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس تقریب کے موقع پر مظاہرۂ جاروب کشی ترتیب دیا گیا جس میں ارکانِ بلدیہ منجانب جماعت ہذا جناب ناظم صاحب بلدیہ اور ارکان عثمانیہ بلدی جماعت نے عملاً حصہ لیا جس کا عوام پر ایک اچھا اثر مترتب ہوا۔

ڈنر | دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس تقریب میں شہریوں کا ایک پُر تکلف ڈنر ترتیب دیا گیا جس میں ہندو مسلم دونوں اصحاب نے شرکت کی۔ اس ڈنر کی کامیابی کا سہرا مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے رکن بلدیہ کے سر ہے۔

عثمانیہ بلدی جماعت اور ۱۳۴۸ف | ختم سال ۱۳۴۷ف پر انتخابات سال حال کے لیے ایک کاروباری جلسۂ عام بہ تاریخ ۳۰ ر آبان ۱۳۴۷ف منعقد ہوا جس میں خفیہ رائے دہی کے ذریعے حسب ذیل مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی۔

صدر۔ جناب مولوی غلام مصطفیٰ خاں صاحب مددگار رباب حکومت سرکار عالی و رکن بلدیہ

معتمد۔ محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ)

شریک معتمد۔ جناب مولوی قدرت اللہ بیگ صاحب ایم اے (عثمانیہ)

ارکان جناب نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ بار اٹ لا۔ رکن بلدیہ

۲۔ جناب نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۳۔ جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب۔ رکن بلدیہ

۴۔ جناب مولوی غلام محمد خاں صاحب یم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۵۔ جناب پنڈت گنڈے راؤ صاحب ہروالکر بی اے ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ

۶۔ جناب پنڈت سریدھر وامن نایک صاحب بار اٹ لا۔ رکن بلدیہ

۷۔ جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

۸۔ جناب نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب جاگیردار

۹۔ جناب مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

۱۰۔ جناب مولوی ابوالخیر صاحب صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ)

۱۱۔ جناب مولوی عبدالسمیع احمد صاحب

۱۲۔ جناب رائے مدن موہن لال صاحب بی اے۔ ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

۱۳۔ جناب مولوی میر محمود علی خاں صاحب میر محلہ اعزازی

۱۴۔ جناب حکیم رائے دوارکا پرشاد صاحب میر محلہ اعزازی

قواعد جماعت ہذا کے دفعہ ۵ میں حسب ذیل ضمن ۵ کا اضافہ یہ الفاظ ذیل کیا گیا کہ جماعت :۔

سال گذشتہ کا صدر اگر وہ عام انتخابات میں کسی عہدہ کے لیے منتخب نہ ہوسکے تو

سال آیندہ کے لیے وہ خود بہ خود رکن مجلس عاملہ متصور ہوگا۔"

اس ترمیم کے بعد جناب رائے راجہ گرو داس صاحب بی اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) سابق صدر جماعت ہذا کا اضافہ عمل میں آیا۔

مسئلۂ انتخاب نایب صدرات بلدیہ | سال حال مجلس عاملہ نے یہ تصفیہ کیا کہ اس مسئلے کو جماعتی سوال پارٹی کویسشن) نہ بنایا جائے اس لیے جماعت ہذا نے اپنا کوئی امیدوار پیش نہیں کیا۔

سہ سالہ نظام نامہ | عثمانیہ بلدی جماعت کی جانب سے جو امیدوار صاحبان مجلس بلدیہ کی رکنیت کے لیے پیش کیے گئے تھے انھوں نے ایک خاص سہ سالہ نظام نامہ پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ فرمایا تھا۔ سہ سالہ نظام نامہ عثمانیہ بلدی جماعت میں ہماری ایک نمایاں تحریک منجانب بلدیہ مدارس شبینہ کے قیام کے متعلق تھی۔ گذشتہ رپورٹ میں بتلایا گیا تھا کہ مجلس بلدیہ نے اس مسئلے کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر کیا تھا۔ اس دوران میں کمیٹی نے جناب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کے فراہم کردہ مواد کو پیش نظر رکھ کر مجلس بلدیہ میں قیام مدارس شبینہ کی ایک اسکیم پیش کی۔ مجلس بلدیہ نے اس اسکیم کو منظور کرتے ہوئے ہر حلقے میں فی الحال ایک ایک شبینہ مدرسہ قایم کرنے کی منظوری دی، اور انتظامات کے لیے نایب میر مجلس بلدیہ، ناظم صاحب بلدیہ، رکن حلقہ و ناظم صاحب تعلیمات پر مشتمل ایک بورڈ قایم کر دیا گیا ہے۔ رقم ۱۳۴۶ف کے موازنے میں شریک ہو چکی ہے اور مدارس کا قیام عنقریب عمل میں آجائے گا۔

تحریک نمبر (۲) یعنے بلدی حلقوں کی ترتیب جدید کے متعلق تحریک ناظم صاحب بلدیہ کی رپورٹ

توسط سب کمیٹی مشاورتی ابھی مجلس بلدیہ میں پیش نہیں ہوئی ہے۔ کارروائی میں عجلت کے لیے توجہ دلائی
ا رہی ہے۔

تحریک نمبر۳۔ انسداد امراض سے متعلق صحت کمیٹی پورے انہماک کے ساتھ کام کر رہی ہے اور
مررشتۂ طبابت سرکار عالی کا اتحاد عمل بھی صحت کمیٹی کے پیش نظر ہے۔

تحریک نمبر۴۔ اس سلسلے میں امراض کی رُوک تھام کے لیے نشر و اشاعت کی ضرورت مجلسِ بلدیہ نے محسوس
ر کے نشر و اشاعت کے لیے موازنۂ سال حال میں رقم محفوظ کی ہے۔

تحریک نمبر۵۔ یونانی اور ویدک دواؤں کے استعمال کے سلسلے میں صحت کمیٹی نے ایک تفصیلی
کیم مجلسِ بلدیہ میں پیش کی ہے۔ مجلس نے اسکیم کو منظور کر لیا ہے، موازنۂ سال حال میں گنجایش نہ نکل سکنے کی
جہ سے فی الحال اس کا نفاذ معرض التوا میں ہے۔

تحریک نمبر۶۔ بلدیے کے ملازمین ادنیٰ کے حالات کو بہتر بنانے میں بلدیہ ممکنہ کوشش کر رہی ہے ان کی تنخواہوں میں
ضافے کی تجویز زیر غور ہے۔ ان کے لیے بہتر امکنہ اور دیگر سہولتوں کے متعلق بھی ضروری کارروائی جاری ہے۔

تحریک نمبر۷۔ مجلس بلدیہ کی قانونی کمیٹی نے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے متعلق ضروری قواعد
رتب کر دیے ہیں اور مجلسِ بلدیہ نے ان کو منظور بھی کر لیا ہے، یہ قواعد زیر منظوریٔ سرکار عالی ہیں۔

تحریک نمبر۸۔ کرایہ کی سواریوں کی دیکھ بھال اور ان کی خاطر خواہ اصلاح کے متعلق جناب
اظم صاحب بلدیہ کو مناسب انتظام عمل میں لانے کے لیے بلدیہ نے توجہ دلائی تھی لیکن ابھی ان میں کوئی
صلاح نہیں ہوئی اور نہ کافی طور پر دیکھ بھال ہوتی ہے۔ ناظم صاحب بلدیہ اس کے متعلق خاص دلچسپی لیں تو
یک دیرینہ شکایت رفع ہو گی۔

تحریک نمبر۹۔ دفتری کاروبار میں غیر ضروری تعویق نہ پیدا ہونے کے متعلق ناظم صاحب بلدیہ کی
زید توجہ کی ضرورت ہے۔

تحریک نمبر۱۰۔ انسداد گداگری کے متعلق ناظم صاحب بلدیہ کی تجاویز کو بلدیے نے منظور کر لیا ہے
ن میں لاٹری یا پائی فنڈ وغیرہ داخل ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب اس کے متعلق ضروری کارروائی شروع
و جائے گی۔

تحریک نمبر۱۱۔ ضروریاتِ بلدیہ میں مصنوعاتِ مُلکی کے استعمال سے متعلق بلدیے کی توجہ مبذول ہے

لیکن سختی سے اس کی پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں مزید توجہ کی جائے۔

تحریک نمبر ۱۲۔انتخابی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کے انسداد کے متعلق قانونی کمیٹی کی رائے مجلس بلدیہ نے طلب کی تھی جو ابھی وصول نہیں ہوئی۔

تحریک نمبر ۱۳۔قابلیت رائے دہندگی میں توسیع کے مسئلے میں قانونی کمیٹی کی رائے بھی عدم وصول ہے

تحریک نمبر ۱۴۔مجلسِ قایمہ میں الونس کی مسدودی کو مجلسِ بلدیہ نے منظور کر لیا ہے۔یہ مسئلہ ابھی سرکار عالی کے زیرِ منظوری ہے۔

تحریک نمبر ۱۵۔ٹیکس تفریحات کے قیام کے متعلق قانونی کمیٹی کی رپورٹ وصول ہونے پر مجلسِ بلدیہ نے متعدد تفریحی ٹیکسوں کی منظوری دی ہے جو ابھی زیرِ منظوریٔ سرکار عالی ہے۔

تحریک نمبر ۱۶۔قانون میر محلگان کے متعلق ابھی قانونی کمیٹی کی رائے مجلسِ بلدیہ میں وصول نہیں ہوئی ہے۔

تحریک نمبر ۱۷۔تعمیر مکانات کی اجازتی چھٹی سابق کی طرح غیر معمولی تعویق سے تو نہیں مل رہی ہے مگر پھر بھی اس میں غیر ضروری تاخیر ہو جایا کرتی ہے۔مزید عجلت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

سہ سالہ نظام نامے کے علاوہ اراکین بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت نے حسب ذیل مفید و اہم تحریکات اپنے اپنے متعلقہ حلقہ جات کی اصلاح اور دیگر شہری ضرورتوں میں پیش فرمائیں:۔

۱۔تحریکات نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ال ال بی (عثمانیہ) رکن بلدیہ حلقۂ دوم اندرون:۔

۱۔نسبت تعمیر موری کوچۂ الیفٹونٹ راؤ اندرون لال دروازہ

۲۔تنصیب جالیاں بر موری کوچۂ اندھیری باؤلی

۳۔تہہ اندازی کوچۂ اندھیری باؤلی

۴۔مورم اندازی سڑک ہائے سلطان شاہی

۵۔تعمیری موری احاطۂ مبارز الدولہ

۶۔تعمیری موری پولاکوٹم لال دروازہ

۷۔تعمیر موری مسجد شکر سلطان شاہی

۸۔تنصیب برقی روشنی فٹنگ مغربی دایرہ حضرت میر مومن صاحب قبلہؒ

۹۔ نسبت تنصیب جالیاں بر موریاں سلطان شاہی

۱۰۔ نسبت تکمیل موری بما بد یار جنگ مرحوم مغل پورہ

۱۱۔ تنصیب جالیاں موریاں سڑک ہائے مسجد مولوی مظہر صاحب

۱۲۔ تعمیر پیشاب خانہ مدرسہ تحتانیہ سلطان شاہی

۱۳۔ درستی و اصلاح پلے گراؤنڈ سلطان شاہی وغیرہ

۱۴۔ تعمیر موری مرّاد محلہ

۱۵۔ نسبت تنصیب برقی روشنی رام بخش بنڈہ

۲۔ تحریکات مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ حلقۂ اول بیرون :۔

۱۔ نسبت تبدیلی نام النقسٹ برج

۲۔ اجرائی رسالہ ماہوار موسوم بہ بلدیہ

۳۔ سینما وغیرہ کے بورڈ آف سنسر میں بلدیے کے نمائندے کی شرکت

۴۔ حوالگی محکمہ جات برقی و ٹیلیفون و آب رسانی بہ محکمہ بلدیہ

۵۔ نسبت توسیع نیا پل

۶۔ انتظام کشتی رانی بہ رود موسیٰ

۷۔ نسبت مسدودی بیبی شو۔

۸۔ انتظام برقی روشنی حلقۂ اول بیرون

۹۔ نسبت انسداد وصول کم فی صد ٹنڈر

۱۰۔ حدود بلدیہ میں پبلک فون کے مراکز کا قیام

۱۱۔ بلدیہ کے صدر کے لیے ایک مخصوص گون کا استعمال ضروری ہے

۱۲۔ آرائش بلدہ کی نئی آبادیوں میں تقریب گھر کی

۱۳۔ حدود بلدیہ سے گولیوں کی اور بیرون بلدہ دودھ گھروں کا قیام

۱۴۔ دھوبیوں کو موریوں کے پانی کے استعمال سے بچایا جائے

۱۵۔ شہر کی سڑکوں گلی کوچوں اور پارک وغیرہ کو اکابر ملک کے نام سے موسوم کیا جائے

۱۶۔ نسبت انہدام فصیل قدیم شہر

۳۔ تحریک پنڈت گنڈے راؤ صاحب ہروالکر بی اے۔ ال ال بی۔ رکن بلدیہ حلقۂ دوم بیرون

۱۔ نسبت رفع خرابیاں سمت دوم بیرون

۴۔ تحریک مولوی سید محمد علی صاحب موسوی رکن حلقۂ اول اندرون

۱۔ نسبت اصلاح مسالخ وغیرہ

۵۔ تحریک مولوی شاہ عالم خاں صاحب رکن حلقۂ چہارم اندرون

۱۔ اضافہ تنخواہ عملہ کنسروینسی

۶۔ تحریک پنڈت سریدھر نایک صاحب رکن بلدیہ

۱۔ نسبت قیام نل جدید عقب کٹلمنڈی

۷۔ تحریکات مولوی غلام مصطفےٰ صاحب رکن حلقۂ (الف)

۱۔ تعمیر سڑک ہائے اعظم جاہی و معظم جاہی وغیرہ و تعمیر بدررو چلکل گوڑہ وغیرہ

۲۔ نسبت شکستگی کنٹہ چلکل گوڑہ

۳۔ تنصیب درختان ہر دو جانب سڑک ہائے حلقۂ (الف)

۴۔ نسبت تیاری سڑک عنبرپیٹھ تا حد صفائی بہ ذریعۂ سمنٹ و تعمیر بدررو ہائے محلہ کاچی گوڑہ وغیرہ

۵۔ نسبت اضافہ تنخواہ مزدور و مزدورنیاں

تنظیم حلقہ جات عثمانیہ بلدی جماعت کی کامیابی اور طاقت کا انحصار شاخہائے حلقہ جات کی تنظیم و کارکردگی پر منحصر ہے، اس لیے ابتدا ہی سے مجلس عاملہ کے زیر غور شاخوں کی تنظیم جدید کا مسئلہ رہا ہے مجلس عاملہ کے ایک دیرینہ و نہایت سرگرم عمل رکن جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی کو اس سلسلے میں رپورٹ پیش کرنے کا مجاز گردانا گیا تھا موصوف کی رپورٹ پر غور کرنے کے بعد مجلس عاملہ نے تمام حلقہ جات کی شاخوں کی تشکیل جدید کر دی ہے۔ اول بیرون دوم اندرون میں جماعت ہذا کا کام پورے انہماک و سرگرمی سے جاری ہے۔ امید ہے کہ دیگر حلقہ جات کے معتمدین و منتخب شدہ مجالس عاملہ اپنے اپنے حلقہ جات کے صدر صاحبان کے ساتھ اشتراک عمل کر کے جماعت کے مقاصد کو آگے

بڑھائیں گے اس کے علاوہ آئندہ ہر ماہ کی کسی خاص تاریخ کو جملہ شاخوں کے معتمد صاحبان کی ایک میٹنگ مقرر کیے جانے کے انتظامات کیے گئے ہیں تاکہ اس سلسلے میں مفید مشورے ملتے رہیں اور باہمی تبادلہ خیال عمل میں آتا رہے۔

تعداد ارکان ہر جماعت کی قوت کا انحصار اس کے اراکین کی عددی قوت اور اس کے مالی استحکام پر مبنی ہے، ہمیشہ سے یہ اصول جماعت کے پیش نظر رہا ہے اور ہر سال اراکین کی تعداد (۷۰۰) سے زائد ہے، اور گذشتہ کانفرنس کے بعد سے تقریباً (۲۵۰) اراکین کا اضافہ عمل میں آیا ہے، آیندہ اس کام میں مزید توجہ مبذول کی جائے گی اس موقع پر حلقۂ دوم اندرون کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے، جہاں کافی اراکین کا اضافہ عمل میں آیا۔

نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے ال ال بی رکن بلدیہ وصدر حلقہ نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب معتمد حلقہ، مولوی خواجہ سیف الدین صاحب شریک معتمد، مولوی عبد السمیع احمد صاحب معتمد حلقۂ سوم مولوی شیخ محمد صاحب قریشی معتمد حصۂ چہارم کی کوششیں خاص طور پر قابل داد ہیں اس کے علاوہ حلقۂ اول اندرون میں مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن بلدیہ وصدر حلقہ اور مولوی سید شہاب الدین صاحب معتمد حلقہ نے اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائی اور ان حلقہ جات میں اپنی مسلسل کوشش وسرگرمی سے اراکین کی تعداد قابل لحاظ حد تک ترقی کر گئی مگر اس سلسلے میں بہت کچھ کام باقی ہے، بقیہ حلقہ جات کے صدر ومعتمد صاحبان سے توقع ہے کہ آیندہ اس سلسلے میں کامیاب قدم اٹھایا جائے گا۔

سب کمیٹی برائے تشکیل قواعد پارٹی ڈسپلن در مجلس بلدیہ یوں تو انتخابات کے بعد ہی سے اراکین بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت نے جماعت ہذا کے سہ سالہ نظام نامے کی تکمیل میں سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن بلدیے کے اندر کام پارٹی سسٹم (Party System) پر نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمزوری محسوس کی جارہی تھی ابتدائے سال ہی سے مجلس عاملہ نے اس جانب خاص توجہ کی اور مولوی محمد غوث صاحب ایم اے ال ال بی کی تحریک پر ایک سب کمیٹی جو حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہے پارٹی کے اصول وقواعد کو منضبط کرنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے:۔

۱۔ جناب مولوی غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر جماعت ورکن بلدیہ

۲۔ جناب نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی رکن بلدیہ

۳۔ جناب پنڈت پریم جی لال جی صاحب رکن بلدیہ

۴۔ جناب صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی

۵۔ مولوی محمد غوث صاحب ایم اے۔ ال ال بی

یہ کمیٹی مصروفِ عمل ہے اور عنقریب اس کی رپورٹ مجلس عاملہ میں بہ غرض منظوری پیش کردی جائے گی۔

کمیٹی ارکان بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت منظوریٔ قواعد تک فی الحال ایک کمیٹی اراکینِ بلدیہ منجانب عثمانیہ بلدی جماعت تشکیل دی گئی ہے جس کے معتمد مولوی غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) اور شریک معتمد نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی (عثمانیہ) مقرر کیے گئے ہیں۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ بلدیے کے اندر اراکین جماعت ہذا میں ڈسپلن وہم آہنگی قایم رہے۔

یہ کمیٹی اچھے اصول پر کام کر رہی ہے۔ اب عام طور پر بلدیے کے ہر ایک مسئلے کو جماعتی اصول کی حیثیت دی جاتی ہے جس پر تمام ارکان مشترکہ غور کے بعد بلدیے کے اندر متفقہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

عطیہ سال حال نواب میر احمد علی خاں صاحب ایم اے۔ ال ال بی رکن بلدیہ نے مبلغ (عہ) روپیے کا عطیہ مرحمت فرمایا جس کی جماعت ہذا مشکور ہے۔

رپورٹ ختم کرنے سے پہلے میں اپنے معاونین خصوصاً نواب میر احمد علی خاں صاحب و نواب خواجہ سردار اللہ خاں صاحب و صاحبزادہ میر وزیر علی خاں صاحب و مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب و مولوی عبدالسمیع احمد صاحب اراکین مجلس عاملہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان حضرات نے اپنے مفید و پُرخلوص مشوروں سے میری ہر وقت مدد فرمائی۔

دعا اب میں آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ بارگاہِ رب العزت میں اعلیحضرت بندگان عالی کی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ترقی عمر و اقبال کے لیے دعا فرمائیں کہ ذات والاصفات کے دورِ ہمایونی میں بلا قید مذہب و ملت ہم نہایت ہی امن و آسایش کی زندگی بسر کرتے ہوئے یہ تیسری سالانہ بلدی کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔

محمد کرامت علی بی اے (عثمانیہ) معتمد عثمانیہ بلدی جماعت

دوسری نمائش مصنوعات ملکی ممالک محروسہ سرکار عالی کی تیاریاں

منجانب

معاشی کمیٹی انجمن طیلسائین عثمانیہ حیدرآباد دکن

گذشتہ ماہ آذر ۱۳۴۸ف کی کامیاب نمائش مصنوعات ملکی کے مد نظر یہ تصفیہ کیا گیا ہے کہ اس مرتبہ نمائش ماہ بہمن ۱۳۴۹ف میں عظیم الشان طریقے پر منعقد کی جائے اس کے لیے ابھی سے شایانِ شان انتظامات عمل میں لائے جا رہے ہیں ۔ —

۱۔ حیدرآباد کے موسمی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موسم سرما یعنی ماہ بہمن کی ایسی تاریخوں میں اس کا انعقاد کیا جائے جبکہ ملک کے ہر گوشے سے کثیر تعداد میں صناع و نمائش میں شریک ہو سکیں اور انھیں بارش وغیرہ کی تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ آئندہ ماہ بہمن ۱۳۴۹ف میں حیدرآباد میں جو متعدد آل انڈیا نوعیت کی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور ہندوستان کے مشاہیر و علماء اور دیگر نمایندے شرکت کی غرض سے آ رہے ہیں ان کو بھی حیدرآباد کی صنعتی ترقی اور مصنوعات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔

۲۔ اس مرتبہ نمائش میں ایسی اشیاء کا خاص طور پر مظاہرہ کیا جائے گا جو خاص اہتمام کے ساتھ نمائش کی غرض سے تیار کی جائیں یا جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی جدید ایجادات و اختراعات سے متعلق ہوں اس ضمن میں صناعان ملک کو ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ وہ اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کر کے انعامات حاصل کریں۔

۳۔جدید اور پیمانۂ کبیر کی صنعتوں کیلئے بھی علٰحدہ علٰحدہ شعبے مخصوص کیے جائینگے۔ پارچہ بافی۔ کوئلہ۔ لوہا۔ سمنٹ۔ شکر

کاغذ اور روغنیات کی ترقیات کیلئے علٰحدہ اسٹال قایم کیے جائینگے۔

۴۔صنعتی مظاہروں کا بھی بطور خاص انتظام کیا جائیگا۔ صنعتی کیمیا کی اہمیت و ترقی اور سائنس کے تجربوں سے عوام کو واقفیت پیدا کرانے

کیلئے کالجوں کے پروفیسر صاحبان اور سرکار عالی کے تجربہ خانوں کے افسروں سے تعاون حاصل کیا جائیگا۔ سائنس کے ایسے

تجربات کا مظاہرہ کیا جائیگا جن سے عوام اپنی صنعتی ترقی میں اس سے مستفید ہوسکیں۔

۵۔عملی تجربوں کے علاوہ ماہرانِ فن کی عام فہم تقاریر کا بھی انتظام کیا جائیگا۔

۶۔ملکی مصنوعات کو بیرون ملک کے افراد سے روشناس کرانے کیلئے ایسی تدابیر و سہولتیں بہم پہنچائی جائینگی جن کے ذریعے

بیرونِ ممالک محروسہ سرکار عالی کے تجار اور صناعوں کو بھی اس میں شرکت کی ترغیب ہوسکے، وہ یہاں کی مصنوعات

خرید کر ہندوستان میں ان کیلئے بازار فراہم کرسکیں۔

۷۔نمائش کے انعقاد سے قبل معاشی کمیٹی کیجانب سے بزبان اردو و انگریزی ایک نہایت شاندار صنعتی و تجارتی ڈائرکٹری شایع

کیجارہی ہے جو اپنی نوعیت کی پہلی اور جامع ڈائرکٹری ہوگی۔ اس ڈائرکٹری کا کتابچہ دس ہزار کی تعداد میں شایع کیا جائیگا جو

عوام کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔ تین چار ماہ کے اندر ڈائرکٹری طبع ہوجائیگی جو آیندہ نمائش کیلئے بطور گائیڈ کام دیگی۔

۸۔اس نمائش کا پراسپکٹس اور دیگر تفصیلات زیر طبع ہیں۔ سر دست اعلان کا منشا یہ ہے کہ گذشتہ مرتبہ جن صناعوں نے اس میں حصہ لیا تھا وہ اور

دیگر صناع ابھی سے اس میں شرکت کیلئے مصنوعات کی تیاری شروع کردیں۔ ارباب حکومت اور عوام سے اس کی قوی

امید ہے کہ وہ گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی معاشی کمیٹی کے ساتھ تعاون سے نمائش کو کامیاب بنائینگے۔

رپورٹ عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون بابتہ ۱۳۴۷ف

عثمانیہ بلدی جماعت حیدرآباد کا وہ واحد ادارہ ہے جو شہریوں کی خدمت گذاری اور شہریوں میں اپنے بلدی حقوق اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ اس کی ساری بلدی کارگذاریوں کی تفصیل کا اظہار کیا جائے لیکن آپ سب حضرات یہ جانتے ہیں کہ اس کی کامیابی کا بڑا انحصار اس کی حلقہ واری اور حصہ واری شاخوں کی کارگذاری اور مستعدی پر ہے۔ اس موقع پر اس کی شاخ دوم اندرون کی کارگذاری کی مختصر کیفیت پیش کی جاتی ہے:۔

عہدہ داران و مجلس عاملہ

جماعت ہذا کی صدارت کے فرائض حسب دفعہ ۲۴ ضمن د قواعد عثمانیہ بلدی جماعت بہ حیثیت رکن بلدیہ حلقۂ ہذا نواب میر احمد علی خاں صاحب یم اے۔ ال ال بی جاگیردار نے انجام دیے اور دفعۂ مذکورکے ضمن ب کے تحت صدر مجلس عاملہ نے معتمدی کے لیے میرا تقرر فرمایا۔ جماعت ہذا کے جلسۂ عام بہ موجب ضمن ج مجلسِ عاملہ کی رکنیت کے لیے مولوی خواجہ سیف الدین صاحب۔ مولوی عبدالحلیم بیگ صاحب اور رائے رگھوبیر بلی صاحب بی اے (عثمانیہ) کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور مولوی محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور رائے مانک راؤ صاحب کی نامزدگی مرکزی مجلسِ عاملہ کی جانب سے عمل میں آئی۔

جلسہ ہائے مجلسِ عاملہ

سالِ حال مجلسِ عاملہ کے جلسوں کی تعداد (۴) رہی جن میں جماعت ہذا کے کاروبار سے متعلق متعدد اُمور طے پائے۔

جلسہ ہائے عام

سال حال جماعت کے دو جلسہ ہائے عام منعقد ہوئے ایک اوائل سال میں ترتیب موازنے سے متعلق اور دوسرا آج کا جلسہ (۲۶ر آبان ۱۳۴۷ف) رپورٹ کارگذاری کی سماعت اور انتخابات سال آیندہ سے متعلق۔

تعداد ارکان

ختم ۱۳۴۶ف پر جماعت ہذا کے ارکان کی تعداد (۶۸) تھی اور اب (۲۲۸) ہے۔ یہ امر ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ عثمانیہ بلدی جماعت کے کُل ارکان کا تہائی سے زاید حصہ ہمارے حلقے کے ساکنین پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں عموماً حلقۂ ہذا کے ان تمام ساکنین کا میں تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے توسیع رکنیت کے لیے کوشش فرمائی ہے اور خصوصاً مولوی شیخ محمد صاحب قریشی۔ مولوی کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور مولوی نوازش عمر صاحب کا ممنون ہوں۔

حصہ واری شاخیں

حسب دفعہ ۲۵ قواعد عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ ہذا کے چاروں حصوں میں حصہ واری شاخیں قایم ہیں۔ ۱۳۴۷ف میں حصۂ اول کے صدر جناب بابوراؤ صاحب والوجکر معتمد جناب مانک راؤ صاحب اور ارکان مجلس عاملہ جناب وینکٹ سوامی صاحب۔ جناب ہنمنت راؤ صاحب جناب سید خواجہ معین الدین صاحب۔ جناب ایس۔ کے پانڈو صاحب۔ جناب رگھو ویرراؤ صاحب وکیل ہائیکورٹ رہے۔

حصۂ دوم کے صدر جناب ڈاکٹر ست نارائن صاحب میر محلہ۔ معتمد جناب محمد غوث صاحب اور ارکان مجلس عاملہ جناب سوہن لال صاحب وکیل۔ جناب نوازش عمر صاحب۔ جناب نواب فخرالدین خاں صاحب۔ جناب محمد حسین خاں صاحب اور جناب بالکشن صاحب رہے۔

حصۂ سوم کے صدر جناب احمد سعدی صاحب میر محلہ معتمد جناب محمد کرامت علی صاحب بی اے (عثمانیہ) اور ارکان مجلس عاملہ جناب فضل الدین خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ نواب خواجہ احمد اللہ خاں صاحب جاگیردار۔ جناب عبدالسمیع احمد صاحب۔ جناب خواجہ معین الدین صاحب اور جناب مجید اللہ خاں صاحب رہے۔

حصۂ چہارم کے صدر، جناب محمود علی خاں صاحب میر محلہ، معتمد جناب شیخ محمد صاحب قریشی اور ارکان مجلس عاملہ جناب ہند کشور صاحب ماتھر بی اے. ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ. جناب بندھیا چند صاحب بی اے (عثمانیہ) جناب محمد سبحان صاحب جناب سید رضا صاحب اور جناب پریم راج صاحب رہے۔

ان حصہ واری شاخوں کی سالانہ رپورٹ تاحال وصول نہ ہونے کی وجہ سے شریک رپوٹ ہذا نہ کی جاسکیں۔

دورہ ہائے معمولی

مجلس عاملہ جماعت ہذا نے ابتدائے سال ہی میں یہ طے کیا تھا کہ ہر جمعہ کو سہ پہر میں حلقے کا دورہ کیا جائے اور یہ اصول بنایا گیا تھا کہ ہر مہینے کا پہلا جمعہ حصۂ اول کے، دوسرا جمعہ حصۂ دوم کے، تیسرا جمعہ حصۂ سوم کے اور چوتھا جمعہ حصۂ چہارم کے دورہ کے لیے مختص کیا جائے جس کی تعمیل میں سال حال (۳۶) معمولی دورے کیے گئے۔ اِن دوروں میں جس قدر اصلاح طلب اُمور بلدیہ سے متعلق پائے گئے ان کے لیے صدر جماعت ہذا کے ذریعے مجلس بلدیہ میں تحریکات پیش کی گئیں یا عہدہ داران و ملازمین بلدیہ سے ارتفاع شکایت کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اُس سے بہت زیادہ ابھی انجام پانا ہے۔ ان دوروں میں صدر و معتمد اور ارکان مجلس عاملہ کے علاوہ حصہ واری شاخوں کے عہدہ داران و ارکان مجالس عاملہ گہری دلچسپی کے ساتھ شرکت فرماتے رہے۔ حصۂ دوم کے اُمور اصلاح طلب مثلاً تعمیر بدررو، انتظام روشنی اور نرخ اندازی وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر ستیہ نارائن صاحب جناب محمد غوث صاحب اور جناب یم بالکشن صاحب کی توجہ سے مکمل فہرستیں تیار ہو چکیں۔ اسی طرح حصۂ چہارم کے متعلق بھی جناب شیخ محمد صاحب قریشی کی توجہ سے مکمل مواد فراہم ہو چکا ہے۔ حضرات متذکرۂ صدر جماعت کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ حصۂ اول اور حصۂ سوم کے مواد کی فراہمی کی کوشش بھی جاری ہے۔

دورہ ہائے غیر معمولی

معمولی دوروں کے علاوہ صدر جماعت ہذا نے بہ حیثیت رکن بلدیہ حلقۂ دوم اندرون محفوظ،

درخواستوں اور زبانی شکایتوں کی بنا پر متعدد غیر معمولی دورے موقعوں کے معاینہ کے لیے کیے۔

مالیہ

سال حال آج کی تاریخ تک جماعت ہذا کی نہ کوئی آمدنی ہوئی اور نہ کوئی خرچ۔ جماعت ہذا کے ذرایع آمدنی دو ہیں، عطیات اور مرکزی جماعت کی امداد۔ جماعت ہذا نے کوئی عطیات وصول نہیں کیے اور نہ مرکزی جماعت سے کوئی امداد تا حال حاصل ہوئی، اس لیے آمدنی میں کوئی رقم شریک نہیں ہے۔ ممکن ہے مرکزی مجلس عاملہ کے ایک تصفیہ کے بموجب ارکان عثمانیہ بلدی جماعت مقیم حلقۂ ہذا کے وصول شدہ چندہ کا ربع حصہ ہیں ختم سال سے قبل وصول ہو جائے۔ خرچ کی رقم اس لیے شریک نہیں ہے کہ تا اگزیر اخراجات مثلاً تنخواہ اہلکار و چپراسی وغیرہ بھی جماعت کو برداشت نہیں کرنے پڑے بلکہ صدر جماعت ہذا نے بہ کمال ہمدردی دفتری اور تقسیم لفافہ جات وغیرہ کے کام کو اپنے ذاتی آدمیوں کے ذریعے انجام دلوایا۔ جو کام جماعت ہذا کے آیندہ پیش نظر ہے مثلاً مدارس شبینہ۔ کتب خانہ جات اور کلبس وغیرہ کے قیام کے لیے جماعت کو قمی ضرورتیں پیش آئیں گی۔ مرکزی جماعت کی امداد کے علاوہ کاموں کی وسعت کے لحاظ سے عطیات کا وصول کرنا بھی ضروری ہو جائے گا۔

اُمورِ بلدیہ

صدر جماعت ہذا نے بہ حیثیت رکن بلدیہ جو فرائض انجام دیے ان کی مختصر کیفیت بھی ذیل میں درج کر دی جاتی ہے:۔

اجلاس ہائے مجلس بلدیہ | سال حال مجلس بلدیہ کے معمولی ملتویہ اور خاص (۵۴) اجلاس ہوئے جن میں سے ہر ایک میں معزز رکن نے شرکت فرمائی۔

اجلاس و دورہ ہائے صحت کمیٹی | بلدیہ میں بلدہ حیدرآباد کی صحت و عافیت کی نگرانی کے لیے سات ارکان کی ایک سب کمیٹی بنام "صحت کمیٹی" قایم ہے جو اپنے دوروں اور اجلاسوں میں بلدہ حیدرآباد کی صحت سے متعلق ضروری امور پر غور کرتی اور ان کے متعلق تصفیہ کر کے مجلس بلدیہ میں پیش کرتی ہے۔ ہر ہفتہ میں اس کمیٹی کا ایک دورہ اور ایک اجلاس ہوا کرتا ہے۔ صدر جماعت ہذا کا بھی اس کمیٹی کی رکنیت کے لیے انتخاب ہوا، اور انھوں نے اس کے سال حال کے (۲۲) دوروں اور (۹) اجلاسوں میں سے ہر ایک میں شرکت کی۔

اجلاس ہائے سب کمیٹی متعلق قیام مدارس شبینہ | نظام نامہ عثمانیہ بلدی جماعت کی جو تحریکات سال حال مجلس بلدیہ میں

پیش ہوئی تھیں ان میں سے ایک قیام مدارس شبینہ کے لیے بھی تھی مجلس بلدیہ نے اس تحریک کو منظور کر کے اس کے متعلق ایک سب کمیٹی قایم کی ہے جس میں صدر جماعت ہذا کا نام بھی شریک ہے۔ اب تک اس کے دو اجلاس ہوئے اور دونوں میں انھوں نے شرکت کی۔

اجلاس ہائے سب کمیٹی متعلق قرضہ بلدیہ | مذکورہ بالا سب کمیٹیوں کے علاوہ حصول قرضہ سے متعلق ایک ہنگامی سب کمیٹی بھی صدر جماعت ہذا کا انتخاب عمل میں آیا تھا، اس کے (۵) اجلاسوں میں سے وہ صرف ایک میں شرکت کر سکے۔

کارہائے تعمیری حلقۂ ہذا | سال حال کا موازنہ مجلس بلدیہ نے ۱۳۴۶ف ہی میں منظور کر دیا تھا، اس وقت مجلس بلدیہ میں جماعت ہذا کی کوئی نمایندگی نہیں ہو رہی تھی۔ حلقۂ ہذا کے تعمیری کاموں کے لیے کچھ زیادہ رقم شریک موازنہ نہ ہو سکی۔ سال حال ایک موری (کوچۂ مسجد جعفری و احاطہ بہرام الدولہ) اور دوسری موری اندرون دروازہ علی آباد تعمیر ہو سکی۔ اور اول الذکر موری کی بچت کی رقم سے اسی کوچہ میں دو مکانات حاصل کر کے سواریوں کی آمد و رفت کا راستہ قایم کیا گیا۔ ان کے علاوہ ایک پیشاب خانہ اور ایک حوض آب نوشیدنی برائے جانوران بھی حلقۂ ہذا میں قایم ہوا۔

روشنی | البتہ سال حال حلقۂ ہذا میں برقی روشنی کی کافی توسیع ہوئی محلہ جات اندرون لال دروازہ۔ کوٹلۂ عالی جاہ۔ کوچۂ مسجد جعفری۔ راستہ ڈیوڑھی مہاراجہ بہادر۔ کٹہ تالاب میر جملہ اور مغلپورہ میں (۸۰۰) برقی چراغوں کا اضافہ ہوا۔ محلہ جات سلطان شاہی، اندرون دروازہ گولی پورہ، بیلۂ مہاراجہ چندولال، کوچۂ نانا کا ماٹی، احاطۂ میر پاشا، کوچۂ گڑے کاری گوڑہ، اور کوچۂ نعیم الدین خاں میں بھی انشاء اللہ عنقریب برقی روشنی آجائے گی۔ آخر الذکر دو کوچوں کے علاوہ برقی روشنی کے ستون نصب ہیں۔ مجلس بلدیہ کے ایک حالیہ تصفیہ کے بموجب توقع ہے کہ ہمارے حلقہ کے چھوٹے چھوٹے کوچہ جات بھی اوائل ۴۸ف میں کم از کم مٹی کے تیل کی قنادیل سے منور ہو جائیں گے۔

کٹہ یان خاشاک | حلقۂ ہذا میں (۱۸۵) آہنی کنڈیاں اور (۲۰) خاشاک اندازی کے خام گڑھے تھے۔ سال حال (۲۵) جدید آہنی کنڈیوں کا اضافہ کیا گیا۔

تحریکات مجلس بلدیہ | ضروریات حلقہ کے سلسلے میں تعمیر موری چھوٹا بازار سلطان شاہی (۲) نصب جالیاں بر موری ہری باؤلی (۳) تعمیر موری کوچۂ اشونت راؤ (۴) تنصیب جالیاں بر موری کوچہ اندھیری باؤلی (۵) تہ اندازی کوچۂ اندھیری باؤلی (۶) مرمت اندازی سڑک ہائے سلطان شاہی (۷) تعمیر موری احاطۂ مبارز الدولہ

(۸) تعمیر موری پلاٹنم واقع لال دروازہ (۹) تعمیر موری عقب مسجد شکر سلطان شاہی کے متعلق مجلس بلدیہ میں تحریکات پیش کی گئیں جن میں سے تحریک (۱) منظور ہوئی اور باقی تحریکات زیر غور ہیں۔

دیگر امور | نظامت بلدیہ کے بارہ آدمیوں کا ایک زاید عملہ ۱۶ ار فرد دی ۴۸ ف سے حلقہ ہذا میں متعین ہے جس کے ذریعے حلقہ کی متعدد ایسی موریوں کی کل براری کی گئی جو سالہائے سال سے غیر چالو اور بند تھیں اور چند گلیوں اور راستوں کی مٹی وغیرہ کی ہمواری کا کام بھی اس عملہ سے لیا گیا۔ یہ عملہ اس وقت حلقہ ہذا ہی میں کارگذار ہے اور توقع ہے کہ سال آیندہ حلقہ ہذا کی جملہ موریاں صاف ہو جائیں گی اور مزید راستوں کی ہمواری کا کام بھی انجام پائے گا۔

انتظام مسجد احاطۂ قبہ اللہ دام مرحوم واقع اندرون دریچہ رنگ علی شاہ | مسجد مذکور کی بے حرمتی سے متعلق محلہ سے جو شکایت پیش ہوئی تھی اس کے سلسلے میں نظامت امور مذہبی کو توجہ دلائی گئی، جواب وصول ہوا کہ کارروائی جاری ہے۔

تنازعہ موری مکان عالیہ بیگم صاحبہ ساکن پنج محلہ | موری کے تنازعہ سے متعلق صاحبۂ موصوفہ کی درخواست پیش ہونے پر نظامت بلدیہ کے توسط سے عہدہ داران صرف خاص مبارک کو توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جواب آیا ہے کہ کارروائی زیر تصفیہ ہے۔

تبدیلی نل اسٹانڈ ہوئی واڑہ سلطان شاہی | تنصیب جدید نل ہوئی واڑہ کے سلسلے میں اہالیان ہوئی واڑہ کا ایک محضر پیش ہونے پر بہ ذریعۂ محکمۂ آب رسانی حسب خواہش اہالیان محلہ نل اسٹانڈ کا مقام تبدیل کر دیا گیا۔

یوم ترک مسکرات | یوم ترک مسکرات کے سلسلے میں جماعت ہذا نے جو حصہ لیا اس کی رپورٹ منسلک ہذا ہے۔

دکانات گوشت واقع شاہ علی بنڈہ | دکانات گوشت واقع شاہ علی بنڈہ کے متعلق ایک شکایتی محضر پیش ہونے پر کہ وہ لوگ کھلی جالیاں رکھ کر گوشت فروخت کیا کرتے ہیں، اگذر کے جوان کے علاوہ ایک خاص جوان کو اس کی نگرانی کے لیے متعین کر دیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ شکایت رفع ہو جائے گی۔

انتظام آب رسانی بہ زمانۂ عیدین و تہوارات | جناب میر محلہ صاحب اعزازی حصۂ دوم کی تحریک کی بنا پر عیدین و تہوارات میں پابندی کے ساتھ نلوں کے کھلے رکھنے کے متعلق توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جواب آیا کہ آیندہ سے عیدین و تہوارات کے موقع پر نلوں کے کھلے رکھنے کی پابندی کی جائے گی۔

اصلاح کوچہ بن شاہ | اہالیان کوچہ بن شاہ کے ایک محضر کی بنا پر کوچۂ مذکور کی رفع شکایت کے متعلق بہ توسط

نظامت بلدیہ عہدہ داران صرف خاص مبارک کو توجہ دلائی گئی ہے۔ ابھی کارروائی جاری ہے۔

پری باؤلی مسجد جالی مصلیان مسجد مذکور اور اہالیان محلۂ مذکور کی خواہش کی بنا، پر مسجد مذکور کی باؤلی کی پری سے متعلق بہ توسط نظامت بلدیہ محکمۂ امور مذہبی سے کارروائی جاری ہے چونکہ اس باؤلی تک خاشاک کے بنڈیوں کو جانے کے لیے مسجد کی دیوار کو توڑنے کی ضرورت ہے اس لیے محکمۂ امور مذہبی کی اجازت کی ضرورت ہے۔

فسادات بلدۂ حیدر آباد بلدۂ حیدر آباد میں اوائل خورداد سنہ ۴۷ف میں جو منحوس فسادات چھوٹ پڑے اُن سے حلقۂ دوم اندرون بہ فضل خدا محفوظ رہا حلقۂ ہذا میں امن و امان قایم رکھنے میں مولوی میر مظہر علی صاحب کامل وکیل ہائیکورٹ سابق رکن بلدیہ کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون نے بھی امن و امان قایم رکھنے میں امکانی جد و جہد کی اِس سلسلے میں نواب میر احمد علی خاں صاحب رکن بلدیہ۔ مولوی محمود علی خاں صاحب میر محلہ اور ڈاکٹر ست نارائن صاحب میر محلہ کی کوششیں بھی قابلِ ستائش رہیں۔ پنڈت گنپت راؤ صاحب دیشپانڈے وکیل ہائیکورٹ اور مولوی خواجہ معین الدین صاحب جاگیردار بھی اپنے حلقۂ اثر میں کوشش فرماتے رہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب امین کوتوالی کی مستعدی اور اپنے فرایض میں انہماک بھی قابلِ تعریف رہا اس رپورٹ کو مرکزی جماعت میں پیش کرنے پر وہاں سے ذریعۂ مراسلہ ہم کو مطلع کیا گیا کہ حضراتِ مذکور کا منجانب جماعت شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ حسبہٗ عمل کیا گیا۔

شکریہ حضرات ناشکر گذاری ہوگی اگر اس موقع پر صدر جماعت ہذا نواب میر احمد علی خاں صاحب کے متعلق بہ طور خاص کچھ عرض نہ کروں۔ اس سال مجلس بلدیہ کا کوئی ایسا اجلاس نہ ہوا جس میں ممدوح نے شرکت نہ کی ہو۔ بلدیہ کی دوسری ذیلی کمیٹیوں میں بھی وہ عموماً شریک رہے۔ ممدوح کی بلدی معروفیات کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں بلا خوفِ تردید عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا اور سُنا وہ یہی تھا کہ روزانہ ان کے اوقات کا بیشتر حصہ محکمۂ بلدیہ وغیرہ سے مراسلت کرنے، بلدیہ ہی سے متعلق سوچنے اور بلدیہ ہی سے متعلق کچھ کرنے میں گذرتا تھا۔ جماعت ہذا کے اخراجات ممدوح نے خود برداشت کیے غرض جماعت اور حلقۂ ہذا کے لیے انھوں نے عملاً وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے اس سلسلے میں خود جماعتِ ہذا بھی قابلِ مبارک باد ہے کہ اس نے اپنی نمایندگی اور حلقہ کی اصلاح کے لیے ایسے موزوں ترین فرد کا انتخاب کیا۔

حضرات، ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی ادارہ اور کوئی کام کامیاب نہ ہوتا اگر ہمارے بادشاہ ذیجاہ خلد اللہ ملکہٗ کی عطوفت شاہانہ شہریوں اور بلدیہ کی اصلاح کی جانب مبذول نہ ہوتی ہم سب بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اعلیحضرت بندگان عالی معہ شہزادگان و شہزادیان بلند اقبال تا دیر ہم پر حکمراں رہیں (آمین)۔

۲۶ر آبان ۱۳۴۷ف

خواجہ سردار اللہ خاں جاگیردار

معتمد عثمانیہ بلدی جماعت حلقۂ دوم اندرون

مجلس علمیہ (انجمن طیلسانئین عثمانیہ) اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ اور بالخصوص طیلسانئین کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اردو زبان کی خدمت اور اعلیٰ علمی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس سلسلے میں محققانہ مقالے جو جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ سے لکھائے گئے ان کو انجمن کے ترجمان مجلہ طیلسانئین میں طبع کرنے کے علاوہ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے:—

۱۔ **اردو ادب بیسویں صدی میں**۔ تالیف سید علی حسنین صاحب زیبا یم اے (عثمانیہ) موجودہ صدی کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل تنقیدی مقالہ۔ قیمت ۱۲ر آنے۔

۲۔ **عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست**۔ تالیف سید علی محسن صاحب یم اے (عثمانیہ) عادل شاہی ریاست کے دور تولیت کی بسیط اور محققانہ تاریخ۔ قیمت ۲ روپیہ۔

۳۔ **سلطان احمد شاہ ولی بہمنی**۔ تالیف ظہیر الدین یم اے (عثمانیہ)۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کی مفصل محققانہ اور مستند تاریخ۔ قیمت ۱ روپیہ۔

دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ، مرکز مصنوعات ملکی معظم جاہی مارکٹ، شہر حیدرآباد دکن اور بلدہ کے ہر کتب فروش سے دستیاب ہو سکتی ہیں

قواعد جماعت اتحاد و ترقی

منظورہ جلسہ عام انجمن طیلسانیین عثمانیہ

منعقدہ

۲ خورداد ۱۳۴۸ف فصلی

نام

۱ ۔ اس جماعت کا نام "جماعت اتحاد و ترقی حیدرآباد" ہو گا۔

الحاق

۲ ۔ یہ جماعت انجمن طیلسانیین عثمانیہ سے ملحق ہو گی اور اس جماعت کے قواعد و ضوابط کے لیے انجمن طیلسانیین عثمانیہ کی منظوری لازمی ہو گی۔

ترمیم قواعد

۳ ۔ قواعد ہذا میں ترمیم کرنے کے لیے حسب ذیل طریقہ عمل میں لایا جائے گا۔ ترمیم خواہ رکن اپنی تحریک معتمد کے پاس بھیجے گا، معتمد اس تحریک کو مجلس عاملہ کے معمولی اجلاس میں پیش کرے گا۔ بہ صورت منظوری مجوزہ ترمیم معتمد انجمن طیلسانیین عثمانیہ کے پاس کارروائی کی غرض سے بھیجدی جائے گی۔

اغراض و مقاصد

۴ ۔ یہ جماعت کامل طور سے غیر فرقہ واری ہو گی اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے:۔

الف ۔ خانوادۂ آصف جاہی اور پرچم آصفی کے بقا اور استحکام کی کوشش عمل میں لانا اور ان کے ساتھ جذباتِ وفاداری و احترام کو مستحکم کرنا۔

ب ۔ پُرامن اور دستوری ذرایع سے اس امر کی کوشش کرنا کہ خانوادۂ آصفیہ کے زیر سایۂ عاطفت ممالک محروسہ سرکار عالی میں دستور و سیاست، ارتقاء کے ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ جو ملک و اہلِ ملک کے حقیقی مفاد کے تحت رائے عامہ کا صحیح مظہر ہو، اور ایک فرقہ دوسرے فرقے پر فرقہ واری بنیاد پر غلبہ حاصل نہ کرسکے۔

ج ۔ حیدر آباد کے مشترکہ تہذیبی عناصر اور روایاتِ ملک کے بقا و استحکام کی کوشش۔

د ۔ رعایائے مملکت آصفیہ میں اپنے دستوری حقوق اور ذمہ داریوں کا صحیح احساس اور خدمتِ ملک کا جذبہ پیدا کرنا۔

ھ ۔ مملکتِ آصفیہ کی مجالسِ مقننہ اور ان سے متعلقہ اداروں کے انتخابات میں حصہ لینا۔

و ۔ قانون سازی میں بہ لحاظ حالات مقننہ کی صحیح رہنمائی کے ذرایع اختیار کرنا۔

ز ۔ وہ تمام ذرایع اختیار کرنا جو مقاصد مندرجۂ بالا کے حصول میں ممد و معاون ہوں۔

رکنیت

۵ اس جماعت میں حسب ذیل اصحاب شریک ہوسکیں گے :-

الف ۔ ارکان انجمن طیلسانئین عثمانیہ۔

ب ۔ مجالس مقننہ سرکار عالی اور ممالک محروسہ سرکار عالی کی بلدی مجالس کے ارکان۔

ج ۔ وہ اصحاب جن کے نام جماعت کی مجلس عاملہ میں پیش ہو کر ۳/۴ ارکان حاضر کی تائید سے منظور ہوئے ہوں اور اس کی منظوری کا بینۂ انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ سے حاصل کی گئی ہو۔

ذرایع آمدنی

۶ ۔ جماعت کے ہر رکن کو سالانہ دو روپیے چندہ ادا کرنا ضروری ہوگا، لیکن انجمن طیلسانئین عثمانیہ کے ارکان سے جو اس جماعت کے رکن ہوں سالانہ ایک روپیہ چندہ لیا جائے گا، اور انجمن ایسے ارکان کے چندے کا ۱/۲ حصہ جماعت کو دے گی جو جماعت کے رکن ہوں۔

۷ ۔ جماعت کو اختیار رہے گا کہ حسب ضرورت بہ اغراض جماعت عطیات فراہم کرے۔

اقرار پابندئ قواعد

ف۸ ۔ کوئی شخص اس وقت تک اس جماعت کا رکن متصور نہ ہوگا، اور نہ اس کی کارروائی میں حصہ لے سکے گا تاوقتیکہ اس نے اقرار نامۂ منسلکہ قواعد ہذا پر اپنے دستخط نہ کردیے ہوں کسی فرقہ واری جماعت کا رکن، جماعت ہذا کا رکن نہ ہوسکے گا۔ فرقہ داری جماعتوں کا تعین کابینۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کرے گی۔

عہدہ داران

ف۹ ۔ اس جماعت کے حسب ذیل عہدہ دار ہوں گے:۔

۱۔ صدر۔ ۲۔ نایب صدر۔ ۳۔ معتمد۔ ۴۔ شریک معتمد۔ ۵۔ خازن۔

ف۱۰ ۔ ان عہدہ داروں کا انتخاب ہر سال بہ ماہ آبان جماعت کے جلسۂ عام میں ہوگا۔

مجلسِ عاملہ

ف۱۱ ۔ اس جماعت کی مجلسِ عاملہ علاوہ عہدہ داران مندرجہ ف۹ کے حسب ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی:۔

الف ۔ چار ارکان مجلسِ مقننہ جو جماعت کے رکن ہوں، ان کا انتخاب خود ایسے ارکان مجلسِ مقننہ کریں گے جو جماعت کے رکن ہوں۔

ب ۔ چار ارکان جن کو کابینۂ انجمنِ طیلسانئین عثمانیہ مقرر کرے گی۔

ج ۔ چار ارکان جن کو جماعت کے جلسۂ عام میں ہر سال بہ ماہ آبان منتخب کیا جائے گا۔

انتخاب عہدہ داران دارکان مجلسِ عاملہ

ف۱۲ ۔ الف۔ جماعت کے جملہ عہدہ داران اور حسب ف۱۱ ضمن ج مجلسِ عاملہ کے چار ارکان کا انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعے بہ ماہ آبان جلسۂ عام میں ہوا کرے گا جس کے انعقاد کی اطلاع معتمد جماعت کم از کم ایک ہفتہ قبل ارکان جماعت کو دے گا۔

ب ۔ کوئی رکن نہ تو انتخاب میں امیدوار ہوسکے گا، اور نہ رائے دے سکے گا تاوقتیکہ اس نے اپنے ذمے کے جملہ مطالبات رقمی ادا نہ کردیے ہوں۔

ج ۔ جماعت کے صدر کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کا رکن ہو۔

فرائض و اختیارات عہدہ داران

دفعہ ۱۳ ۔ صدر، جماعت کا اعلیٰ عہدہ دار ہوگا، اور اس کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔

الف ۔ جماعت کے عام مفاد کی نگرانی کرے گا۔

ب ۔ مجلسِ عاملہ اور جلسۂ عام کی صدارت کرے گا ۔

ج ۔ ہر جلسے میں اسی نوع کے جلسۂ ماقبل کی روئیداد سُن کر ارکانِ حاضر کے حسب صواب دید توثیق کرے گا ۔

د ۔ جن جلسوں میں وہ صدر ہو، ان کی ترتیب و تنظیم پر نگرانی رکھے گا، اور قواعد کی توجیہ و تاویل کا مجاز ہوگا ۔

ھ ۔ بہ صورت تساوی آرا اس کو فیصلہ کن رائے بھی دینے کا اختیار ہوگا ۔

و ۔ جماعت کے کاروبار کی اجرائی میں قواعدِ جماعت کے بہ موجب مختلف عہدہ داروں اور ارکانِ جماعت کو مناسب ہدایات دے گا۔

نایب صدر

دفعہ ۱۴ ۔ نایب صدر، صدر کے غیاب میں فرائض صدارت انجام دے گا، اور ان اُمور کی تکمیل کا ذمہ دار ہوگا جو صدر اس کے تفویض کرے ۔

معتمد

دفعہ ۱۵ ۔ معتمد کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :۔

الف ۔ جماعت کے تمام مملوکات ۔ رجسٹرات ۔ روئیداد ۔ کاروبار تنظیم اور دیگر متعلقہ اُمور کی نگرانی ۔

ب ۔ صدر کے مشورے سے مجلسِ عاملہ کے جلسوں کا انعقاد ۔

ج ۔ صدر کی منظوری سے ایسے ملازمین کا تقرر جن کی ماہوار پندرہ روپیے سے زیادہ نہ ہو ۔

د ۔ جماعت کی رکنیت کے امیدواروں کے نام بہ موجب دفعہ ۵ ضمن ج منظوری کی غرض سے مجلس عاملہ میں پیش کرنا، اور بہ موجب دفعہ ۵ ضمن الف و ب ارکان کے ناموں سے

مطلع کرنا، اور ارکان سے چندہ وصول کرنا۔

ھ۔ عہدہ داروں اور ارکان مجلس عاملہ کے انتخابات کا کم از کم پندرہ روز قبل اعلان کرے گا اور مجلس عاملہ کی منظوری سے جملہ انتظامات عمل میں لائے گا۔

و۔ جماعت کے ارکان کا رجسٹر اور مجالسِ مقننہ سرکار عالی کے ارکان کا رجسٹر صحیح اور درست حالت میں رکھے گا۔

شریکِ معتمد

۱۶۔ شریکِ معتمد، جماعت کے معتمد کا شریکِ کار اور معاون ہوگا، اور معتمد کی عدم موجودگی میں اس کے جملہ فرائض ادا کرے گا۔ مجلسِ عاملہ معتمد کے بعض فرائض شریکِ معتمد کے سپرد کر سکے گی۔

خازن

۱۷۔ خازن کے فرائض حسب ذیل ہوں گے :—

الف۔ جماعت کے حسابات کا ذمہ دار رہنا۔

ب۔ ہر ماہ مجلسِ عاملہ میں آمد و خرچ کا گوشوارہ پیش کرنا۔

ج۔ ہر سال تمام حسابات کی تنقیح مجلس عاملہ کے مقرر کردہ تنقیح سازوں سے کرانا، اور اس کی رپورٹ مجلسِ عاملہ میں پیش کرنا۔

مالیات

۱۸۔ جماعت کے مالیات کا انتظام حسب ذیل طریقے پر ہوگا :—

الف۔ ہر سال انتخابِ عہدہ داران کے بعد خازن اور معتمد، آمدنی اور خرچ کا موازنہ مرتب کر کے مجلسِ عاملہ میں پیش کریں گے۔ یہ موازنہ مجلسِ عاملہ کی رائے کے ساتھ جماعت کے جلسۂ عام میں بہ غرض منظوری پیش کیا جائے گا۔

ب۔ موازنۂ منظورہ کے اندر رقم خرچ کرنے کا اختیار معتمد کو بہ منظوریٔ صدر حاصل ہوگا۔

ج۔ خازن کو اختیار نہ ہوگا کہ جماعت کی کوئی رقم زاید از پندرہ روپیے اپنے پاس رکھے۔

د۔ جماعت کی رقم کسی بنک میں بہ منظوریٔ مجلسِ عاملہ رکھی جائے گی۔

ھ۔ بنک سے رقم کی داد و ستد صدر کی دستخط سے ہوا کرے گی۔

مجلسِ عاملہ کے فرائض و اختیارات

۱۹۔ مجلسِ عاملہ کے فرائض و اختیارات حسب ذیل ہوں گے:۔

الف۔ خازن و معتمد کے پیش کردہ موازنہ پر جلسۂ عام میں پیش کرنے سے قبل غور کرنا۔

ب۔ ان ارکان کی شرکت جماعت کی منظوری جن کے نام بہ موجب ۵ ضمن ج پیش ہوں۔

ج۔ جماعت کی شاخوں کا قیام۔

د۔ جماعت کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے کاروبار کے طریقے سوچنا، اور ان کے عمل میں لانے کے ذریعے اختیار کرنا۔

ھ۔ ملازمین جماعت کی عام نگرانی کرنا، اور بہ صورتِ عدم کارگذاری تنزل یا برطرفی عمل میں لانا۔

و۔ حساباتِ جماعت کی تنقیح کے لیے سالانہ تنقیح سازوں کو مقرر کرنا۔

ز۔ کاروباری اور عام جلسوں کے انعقاد کی تاریخ مقرر کرنا، اور ان کے انتظامات کی بابت معتمد کو ہدایت دینا۔

۲۰۔ اگر جماعت کا کوئی عہدہ دار یا مجلسِ عاملہ کا کوئی رکن تحریری اطلاع کے بغیر مجلسِ عاملہ کے تین جلسوں میں موجود نہ رہے تو اس کو جماعت کے عہدہ یا مجلس عاملہ کی رکنیت سے مستعفی سمجھا جائے گا، اور مجلسِ عاملہ باقی ماندہ مدت کے لیے دوسرا انتخاب عمل میں لائے گی۔

۲۱۔ قواعدِ ہذا کی مناسب تعمیل کے لیے مجلسِ عاملہ جماعت کے جلسۂ عام کی منظوری سے ذیلی قواعد مرتب کرے گی۔ ان قواعد کی منظوری کا بینۂ انجمنِ طلبسانئین عثمانیہ سے عمل میں آنا ضروری ہوگا۔

عام جلسے

۲۲۔ جلسۂ عام سال میں کم از کم ایک مرتبہ انتخاب عہدہ داران اور سالِ ماسبق کی کارروائیوں پر بحث و تمحیص کے لیے ماہ آبان میں منعقد ہوگا، اور پہلی شش ماہی کے ختم پر جماعت کے عام کاروبار پر غور کرنے کے لیے بھی ایک جلسۂ عام منعقد ہوگا۔ لیکن مجلسِ عاملہ اگر چاہے تو کسی ضروری امر کے

تصفیہ کے لیے غیر معمولی عام جلسے منعقد کر سکے گی۔ نیز اگر جماعت کے (۱۵) ارکان معتمد سے کسی خاص کارروائی کے لیے غیر معمولی جلسۂ عام کے انعقاد کی تحریری خواہش کریں تو معتمد کا فرض ہوگا کہ بہ اطلاع مجلسِ عاملہ دو ہفتے کے اندر ایسا جلسہ طلب کرے۔

۲۳۔ الف۔ کوئی عہدہ دارِ جماعت، یا رکن مجلسِ عاملہ اپنے فرائض کی ادائی میں ایسا تساہل یا غفلت کرے جس سے ہرج کار واقع ہو تو وہ جلسۂ عام ⅔ آراء سے اپنے عہدے یا رکنیت سے سُبک دوش ہو جائے گا۔

ب۔ اگر کوئی رکنِ جماعت اپنے اقرار نامہ یا پابندئی قواعد کی خلاف ورزی کرے تو مجلسِ عاملہ کے ارکان حاضر کی ¾ اکثریت سے رکنیتِ جماعت سے خارج کر دیا جائے گا، اور آیندہ چھ مہینے کے اندر اس کی شرکتِ مکرر کی درخواست پر غور نہ ہوگا۔

جلسوں کا نصاب

۲۴۔ جماعت کے مختلف جلسوں کا نصاب حسب ذیل ہوگا:۔

جلسۂ عام ۔۔۔۔۔۔ ۱۵ ارکان

مجلسِ عاملہ ۔۔۔۔۔۔ ۵ ارکان

نصاب کے مکمل نہ ہونے سے ہر نوعیت کا جلسہ ملتوی ہو جائے گا۔ اگر دوبارہ جلسہ منعقد ہو تو اس صورت میں جلسۂ عام کے لیے (۷) ارکان اور مجلسِ عاملہ کے لیے تین ارکان کا موجود ہونا ضرور ہوگا۔

جلسوں کی اطلاع

۲۵۔ معتمد کا فرض ہوگا کہ جلسوں کی تاریخ سے اتنی مدت قبل جو ہر جلسے کے محاذی ذیل میں درج ہے ارکانِ متعلقہ کو اطلاع دے:۔

ماہانہ جلسۂ مجلسِ عاملہ ۔۔۔۔ ۴ روز

غیر معمولی جلسۂ مجلسِ عاملہ ۔۔۔۔ ۲۴ گھنٹے

معمولی جلسۂ عام ۔۔۔۔ ۷ روز

غیر معمولی جلسۂ عام ۔۔۔۔ ۲ روز

۲۶ - اگر مجلسِ عاملہ ضرورت سمجھے تو علاوہ سالانہ جلسۂ عام کے جماعت کی ایک عام کانفرنس سال کے کسی زمانے میں منعقد کرسکے گی اور اس کی صدارت کے لیے علاوہ جماعت کے صدر کے کسی اور ممتاز شخص کو منتخب کرسکے گی۔

عارضی انتظام

۲۷ - جماعت کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل ہونے اور ارکان مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آنے تک جماعت کے عاملانہ کاروبار ایک ایسی مجلس انجام دے گی جس کا انتخاب کابینۂ انجمن طیلسانیئن عثمانیہ کرے گی۔

اقرار نامہ حسب دفعہ ۸

میں جماعت اتحاد و ترقی حیدرآباد کا رکن بننا چاہتا ہوں اور عہد واثق کرتا ہوں کہ تاریخ شرکت سے جماعت مذکور کے قواعد کی ہر طرح پابندی اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کروں گا۔

تبصرے

تحریک ترقی مملکت آصفیہ ۔ از خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

عہد حاضر میں مملکت آصفیہ اپنی ترقی کے ایک خاص مرتبہ پر فائز ہے۔ اعلیحضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ کی اورنگ نشینی کے جشنِ سیمیں کے موقع پر نواب سہراب نواز جنگ بہادر آنجہانی کے ورثا نے "ممالک محروسہ سرکار عالی کے ایک باعزت اور خوش حال مستقبل کی تدابیر اور مسایل" کے موضوع پر مسابقتی مقالے لکھوائے عثمانیہ طیلسانی برادری کے رکن رکین جناب خواجہ حمید احمد صاحب کا مقالہ اول اور قابلِ انعام (صمایہ) قرار پایا۔ یہ اسی مقالے کی کتابی صورت ہے اس کتاب میں ملک کے خوش حال اور باعزت مستقبل کے اساسی اصول پر بحث کے بعد ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں کے مسایل، ان کی ترقی کے مواقع اور امکانات، ذخائر اور وسائل پر جامعیت کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ملکی صنعت وحرفت کی ترقی کے امکانات اور ملکی سرمایہ کے استعمال کے ذرایع سے متعلق ابواب کو ہم نے خصوصی توجہ کا مستحق پایا۔

ہمارے ملک میں مختلف مسایل کے تعلق سے اعداد وشمار کی فراہمی کا کام متمدن مغربی ممالک کے مقابلے میں نہایت ابتدائی منزلوں میں ہے۔ ایسے مسایل پر ایک سنجیدہ، محققانہ اور عالمانہ تنقید اور تبصرے کے لیے ایسا مواد لابد ہے اس سلسلے میں بڑی محنت اور کاوش سے مصنف نے متعلقہ منتشر مواد فراہم کیا ہے اور اسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔

ابواب کے مندرجہ اعداد وشمار کے علاوہ کتاب کے آخر میں چند تقابلی گراف و اعداد وشمار کے تختے ملیں گے جنھیں بڑی محنت اور خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔

اب حیدرآباد میں تعلیم یافتہ لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد خاصی ہوگئی ہے لیکن ابھی تک اکثر

صاحبانِ قلم خاص ادبی موضوعات یا صرف افسانوں پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ ہماری بڑی کمزوری ہے، اور ہماری زبان اور ادب کی بڑی محرومی ہے۔ ہمیں زندگی کے اہم اور روزمرّہ کے مسایل پر علمی روشنی ڈالنی چاہیئے، اس سے نیا اور ترقی پذیر ادب پیدا ہوگا۔ جناب خواجہ حمید احمد صاحب نے اس باب میں رہنمائی کے فرائض انجام دیے ہیں۔

بیان اور زبان دونوں موضوعِ بحث کے مناسب حال ہیں۔ اُردو کو یہ اسالیب زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ اصحاب کی بدولت نصیب ہوئے ہیں کہیں کہیں کوئی جملہ مزید سُلجھے ہوئے پیرایہ میں ادا کیا جا سکتا ہے، امید ہے کہ آیندہ اشاعت کے موقع پر یہ اصلاح ہو جائے گی۔

کتابت جلی اور واضح۔ طباعت روشن، سرِورق مجلا اور مصوّر ہے۔ کاغذ سفید اور ستھرا۔ اعلیحضرت بندگانِ عالی کی تصویر سے بھی کتاب مُزیّن ہے۔

مصنف سے قرب بازار سابق عمارت دفاتر صرفِ خاص مبارک حیدرآباد دکن کے پتے پر یا دیگر مشہور کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

اُردو ادب بیسویں صدی میں۔ تالیف مولوی سید علی حسنین صاحب زیبا ام۔اے (عثمانیہ)۔

طیلسانئین عثمانیہ کی مجلسِ علمیہ نے اپنے ذمے ایک خدمت یہ بھی لی تھی کہ ام اے کی جماعتوں کے لیے جو تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں، ان میں سے اچھے مقالے منتخب کرکے پہلے تو قسط وار مجلہ طیلسانئین میں شایع کیے جائیں، پھر کتابی صورت میں ان کی اشاعت ہو۔ زیرِ نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"یہ مقالہ ۱۸۵۷ء کے قریب سے شروع ہو کر ۱۹۳۳ء کے ادبی ہنگاموں پر ختم ہوتا ہے اس کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے نظم و نثر" اس میں مصنف نے عہدِ انقلاب اور عہدِ اضطراب کے ادبی انقلاب، اس کے اسباب اور آثار کا ذکر کیا ہے۔ اُردو ادب و شعر کے مختلف شعبوں اور اصناف کی تبدیلی اور ترقی دکھائی ہے۔

ہماری زندگی اور خیالات کے ساتھ ساتھ ہمارا ادب بھی چلتا اور بدلتا رہا۔ عہد بہ عہد کے مشاہیرِ نظم و نثر اور ان کی خصوصیات پر اجمالی نظرِ تنقید ڈالی گئی ہے۔ یہ ہمارے جدید ادب کا ایک آئینہ ہے۔

تحقیق کی ابتدائی منزل میں ہر شخص سے کچھ نہ کچھ لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں، ایسی بعض مثالیں اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن فی الجملہ کتاب نہایت مفید ہے۔

زبان صاف، سلیس اور بیان دلچسپ ہے۔
قیمت صرف (۱۲؍) ہے۔ دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ یا مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے۔

قواعد عربی حصہ اول ۔ تالیف حکیم مولوی صبغتہ اللہ صاحب لکچرار سٹی کالج۔
عربی زبان دُنیا کی مستند اور مسلّمہ زبانوں میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے ایشیا میں وسیع ترین زبان ہے۔ وہ دُنیا کے سب سے زیادہ آدمیوں کی مادری زبان ہے۔ غیر یورپی زبانوں میں بہ قول آقبالؔ سب سے زیادہ تابناک مستقبل رکھتی ہے۔ دُنیا کے ساٹھ ستر کروڑ انسانوں کی واحد مذہبی زبان ہے۔
اس کی قواعد وسیع اور نہایت مرتب و مدوّن ہے۔ پُرانا طریقِ تعلیم و تفہیم طلبا پر شاق گذرتا تھا وہ زیادہ وقت میں کم سیکھتے تھے۔
ادھر کئی سال سے مسلسل کوشش ہو رہی ہے کہ اس کے قواعد (گرامر) کو سہل اور آسان طرز میں مرتب کیا جائے تاکہ سیکھنے والے جلد اور آسانی سے سیکھ لیں۔
جناب حکیم صبغتہ اللہ صاحب یہاں عربی زبان کے کامیاب اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں! اس سلسلے میں ان کی کوشش امتیازی شان رکھتی ہے! اپنے تجربے اور خیال کی مدد سے انھوں نے یہ کام کیا ہے۔ طلبا کے ماحول مدرسہ اور روزمرّہ کا اس میں خاص لحاظ کیا گیا ہے۔ ہر قسم کی مشقیں دی ہیں عربی کے مبتدیوں کو اس سے خاص فایدہ اُٹھانا چاہیئے۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔
ملنے کا پتا:۔ صحن منزلِ حسینی علم، بارہ گلی۔ قیمت صرف (۶؍) حالی۔

"س"

تحریک ترقی مملکت آصفیہ

مصنفہ مولوی خواجہ حمید احمد صاحب بی اے (عثمانیہ)

قیمت مجلد (۳) روپیہ سکہ عثمانیہ

اس کتاب میں مملکت آصفیہ کی ہر جہتی ترقی کے لیے نہایت جامع اور منضبط لائحہ عمل اہل ملک کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے مملکت آصفیہ کے شاندار قرون ماضیہ اور دور عثمانی کے زرین کارناموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیندہ ترقی کے امکانات پر وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔

مملکت آصفیہ کے قدرتی وسایل زرعی ترقی کے مواقع، دیہی تنظیم، صنعت و حرفت کی ترقی کے امکانات، معدنی ذخایر، تجارتی وسایل، ملکی سرمایہ کے استعمال کے ذرایع اور حکومت کے نظم و نسق کے متعلق کافی معلومات فراہم کیے گئے ہیں۔

اردو زبان میں مملکت آصفیہ کے متعلق اس قدر جامع اور مفید کتاب اب تک شایع نہیں ہوئی اس کی اشاعت میں معنوی خوبیوں کے ساتھ حسن طباعت کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے نقشوں اور تختہ جات کے ذریعے ملک کے دقیق مسایل کو نہایت سہل بنا کر پیش کیا گیا ہے، اور جگہ جگہ برطانوی ہند اور دیگر ریاستوں سے یہاں کے حالات کا مقابلہ کرکے دکھایا گیا ہے۔

یہ کتاب اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے سرکاری محکمہ جات و دیگر حلقوں میں بہت مقبول ہو رہی ہے اور قابل مصنف کو اس کے صلہ میں پانچ سو روپیے کا انعام بھی عطا کیا گیا ہے یہاں کے اور برطانوی ہند کے اخبارات میں اس پر بہت اچھے تبصرے کیے گئے ہیں۔

ملنے کے پتے۔ ۱۔ نور احمد مہتمم دفتر اشاعت تحریک ترقی مملکت آصفیہ
و جملہ مطبوعات حیدرآباد۔ دہلی۔ لکھنؤ و لاہور مقابل زنانہ اسکول نامپلی حیدرآباد دکن

۲۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

۳۔ مکتبہ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن

۴۔ دفتر مجلہ طیلسانین ״

سلسلۂ انجمن اصلاح العشیرہ

۱۔ ریاض النسوان، اُردو تالیف قاضی بدر الدولہ۔ فقہ شافعی کی مستند کتاب۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ اور زکوٰۃ وغیرہ مسایل روزمرّہ۔ کاغذ چکنا، رائل سائز (۱۵۶) صفحات قیمت ایک روپیہ دو آنے۔

۲۔ تفسیر فیض الکریم تالیف قاضی بدر الدولہ و مفتی محمد سعید خاں، عربی مستند تفاسیر کا خلاصہ اُردو، (۸) جزو۔ قیمت چار روپیے۔

۳۔ تحفۃ الخلان، تالیف مولوی خلیل اللہ صاحب سابق مددگار معتمد مالگزاری، فقہ شافعی معاملات بیع و شریٰ و ترکہ وغیرہ کے مسایل۔ کاغذ چکنا۔ رائل سائز (۷۶) صفحات قیمت ۱۲؍

۴۔ فوایدِ بدریہ، اردو، تالیف قاضی بدر الدولہ، پیغمبر اسلامؐ کی سیرت میں مستند کتاب، عربی مستند کتابوں کا بہترین اردو خلاصہ، رائل سائز ۶۰ پونڈی چکنا کاغذ (۴۴۴) صفحات، لکھائی و چھپائی بہتر قیمت مجلد ۴ روپیے غیر مجلد تین روپیے۔

۵۔ عہدِ سلف، تالیف مولوی محمد مرتضیٰ، ۱۳ سو سال کی تاریخ سلطنت اسلامی پر دقت نظر کے ساتھ دلچسپ اسلوب میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ رائل سائز (۱۲۰) صفحات قیمت عہ۔

۶۔ خواتین عہدِ عثمانی، تالیف نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ عہد آصف سابع میں خواتین دکن کی ترقی کا تذکرہ قیمت عہ۔

۷۔ زراعت دکن۔ تالیف مولوی قادر مرتضیٰ حسین صاحب۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مختلف موسموں کی کاشت کا احوال قیمت ۸؍۔

۸۔ طبِ قدیم و طبِ جدید۔ تالیف حکیم محمد اسمٰعیل صاحب۔ طب یونانی سے عصری طب کا تقابل قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ

حافظ عبد العظیم صاحب معتمد کتب خانہ سعیدیہ جام باغ سربازار حیدرآباد دکن

رسید کتب

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی کی حالیہ شایع شدہ (۳۷) کتابیں دفتر انجمن میں موصول ہوئی ہیں جن کی نسبت ہم جناب مولوی محمد الیاس برنی صاحب ناظم سررشتہ کے ممنون ہیں یہ کتابیں کتب خانۂ انجمن طیلسانئین عثمانیہ میں شریک ہیں اور ان سے تحت قواعد کتب خانہ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ طبیعیات حصہ ششم برق (ڈنکن اسٹارلنگ) ترجمہ مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب
۲۔ محکم کنکریٹ کی تجویز جلد اول نظری (قیبر پلووی) ترجمہ مولوی محمد ضیاء الدین صاحب
۳۔ اصول نفسیات جلد اول (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب
۴۔ تاریخ انگلستان حصہ اول (سیرل رانسم) ترجمہ مولوی سید ہاشمی صاحب
۵۔ تاریخ یونان جلد چہارم (اڈولف ہوم) ترجمہ پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی
۶۔ اصول و طریق محصول (آرمیتیج سمتھ) ترجمہ پروفیسر محمد حبیب الرحمٰن صاحب
۷۔ علم ہندسہ نظری (جی۔ بیچ۔ اسکوتھ) ترجمہ مولوی محمد نذیر الدین صاحب
۸۔ حکومت ہائے یورپ حصہ دوم (یف۔ اے۔ آگ) ترجمہ مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب
۹۔ طب قانونی و سمومیات حصہ اول (ڈکسن میان۔ ڈبلیو۔ اے برنڈ) ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب
۱۰۔ اصول معاشیات جلد اول (ٹاسگ) ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب
۱۱۔ فلسفہ نتائجیت (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی
۱۲۔ ہندسی مخروطات، تالیف مولوی شیخ برکت علی صاحب و خواجہ محی الدین صاحب
۱۳۔ مٹی کا کام (سلسلۂ اشاعت رڑکی) ترجمہ مولوی سید منظور حسین صاحب
۱۴۔ علم الولادت حصہ اول (دس اساتذہ) ترجمہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب

۱۵۔ عمل طب حصہ اول (ٹیلر) ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب
۱۶۔ جراحی اطلاقی تشریح حصہ اول (سرریف۔ ٹریوز) ترجمہ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب
۱۷۔ جراحی اطلاقی تشریح حصہ دوم (سرریف۔ ٹریوز) ترجمہ ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب
۱۸۔ طب قانونی وسمومیات حصہ دوم (جے۔ ڈکسن میان۔ ڈبلیو۔ اے برنڈ) ترجمہ ڈاکٹر محمد حسین صاحب
۱۹۔ اصول نفسیات جلد دوم (ولیم جیمس) ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب
۲۰۔ نظریہ مبادلات خارجہ (رائٹ آنریبل وائکونٹ گاسچین) ترجمہ پروفیسر محمد حبیب الرحمٰن صاحب
۲۱۔ یورپ سولھویں صدی میں (اے۔ یچ۔ جانسن) ترجمہ مولوی رحیم الدین صاحب
۲۲۔ زر اور ذرائع مبادلہ (ڈبلیو۔ یس۔ جیونس) ترجمہ مولوی احمد محی الدین صاحب
۲۳۔ تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) ترجمہ مولوی فدا علی صاحب طالب
۲۴۔ تاریخ دولت عثمانیہ جلد اول (ڈی لا، جانکیو یری) ترجمہ مسٹر ایم پکھتال و مولوی سید احمد صاحب و مولوی سید حمید الدین صاحب
۲۵۔ نظریہ خیر و شر کی پہلی کتاب (یچ۔ راشڈل) ترجمہ مولوی خواجہ عبد القدوس صاحب
۲۶۔ تاریخ الکامل عہد بنی عباس حصہ اول ترجمہ مولوی سید ابو الخیر صاحب مودودی
۲۷۔ ہند کے سیاسی مسلک کا نشو و نما (جی۔ اینڈرسن۔ یچ صوبیدار) ترجمہ مولوی محمد عبد الستار صاحب
۲۸۔ آئین اکبری حصہ اول ترجمہ مولوی فدا علی صاحب طالب
۲۹۔ اصول معاشیات جلد دوم (ٹاسگ) ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب
۳۰۔ مبادی نباتیات حصہ اول (لوسن ۔ ساہنی) ترجمہ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب
۳۱۔ نظری علم الحیل (جے۔ یچ۔ جیمس) ترجمہ مولوی محمد نذیر الدین صاحب
۳۲۔ ذرہ اور استوار اجسام کا علم حرکت (یس۔ یل۔ لونی) ترجمہ مولوی شیخ برکت علی صاحب
۳۳۔ عملی نباتیات (آر۔ بی۔ کے۔ رنگاچاری) ترجمہ مولوی عبد الباری صاحب
۳۴۔ نسیجیات حصہ اول (سرای۔ شارپے۔ شافر) ترجمہ ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب
۳۵۔ تاریخ ہند برائے فوقانیہ تالیف مولوی سید ہاشمی صاحب (بار ششم)
۳۶۔ انڈیا ان پرتگیز لٹریچر تالیف مس آمنہ پوپ صاحبہ
۳۷۔ پیمائش حصہ دوم (سلسلہ اشاعت رڑکی) ترجمہ مولوی رضاء اللہ صاحب

ہے عقل کا نمائش قدرت میں امتحاں
اے آنکھ دیکھ پتلی میں پھرتا ہے آسماں

ہماری یہاں آنکھوں کا طبی امتحان کرنے کے بعد

بہت احتیاط سے عینکیں دیجاتی ہیں پتھر کی اور دوسری

جدید طرز و وضع کی عینکیں اور عمدہ سلسلہ و سونا چاندی کی

کمانیں بھی فروخت کیجاتی ہیں۔

گھڑی کے توڑے بجلی کے فینسی ہر قسم کے جیبی لمپ اور ان کا

مسالہ بکثرت موجود رہتا ہے عینکوں اور بیٹریوں کی

مرمت بھی کیجاتی ہے طلبا کیلیے خاص رعایت

عنایت علی یوسف علی عینک فروش

چار مینار متصل جامع مسجد حیدرآباد دکن

عورت کا سہاگ

چوڑیوں سے ہے

ہمارے کارخانے کی چوڑیاں حسن کاری کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں جس کیلیے نمائش مصنوعات ملکی حیدرآباد سے طلائی تمغہ عطا ہوا ہے۔ پھول پتہ اور کٹاؤ کا کام نفیس اور نہایت خوبصورت بنایا جاتا ہے اس کے باوجود دام واجبی اضلاع کے آرڈر کی تعمیل کیجاتی ہے آزمائش شرط ہے۔

حاجی شیخ بالے چوڑی فروش، لاڑ بازار

حیدرآباد دکن

جلد سوم
سنہ ۱۹۳۹ء

شمارہ سوم
سنہ ۱۳۴۸ ف

مجلہ طیلسانین

انجمن طیلسانین عثمانیہ کا علمی و ادبی

سہ ماہی رسالہ

مجلس ادارت

مقاصد

۱۔ علمی، ادبی مضامین، معیاری نظمیں اور جامعہ عثمانیہ کے ام اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کیلئے پیش شدہ تحقیقاتی مقالات بالاقساط شائع کرنا۔

۲۔ اُردو مطبوعات پر تنقید و تبصرہ شائع کرنا۔

۳۔ انجمن طیلسانئین عثمانیہ کی مختلف سرگرمیوں کی روئداد کی اشاعت۔

۴۔ مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور دل آزار تنقیدیں کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہ ہوں گی۔

قواعد

۱۔ یہ رسالہ بہمن، اردی بہشت، امرداد، اور آبان مطابق جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

۲۔ رسالے کی ضخامت کم سے کم ایک سو صفحے ہوگی۔

۳۔ جواب طلب اُمور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ کا حوالہ دنیا ضروری ہے۔

چندۂ مجلۂ طیلسانئین

خریداران حیدرآباد سے عاں سالانہ، فی پرچہ ۸ر

خریداران بیرون حیدرآباد سے عاں ۱۲ر سالانہ فی پرچہ ۱۲ر
مع محصول ڈاک

اراکین انجمن طیلسانئین عثمانیہ سے عہ سالانہ
علاوہ محصول ڈاک

نرخ اشتہارات

مقدار		سال بھر	فی اشاعت
پورا صفحہ	سرورق	عہ	سے
	اندرونی	معہ	عاں
آدھا صفحہ	سرورق	صہ	عہ ۸ر
	اندرونی	سے ۱۲ر	عہ ۲ر
پاؤ صفحہ		عاں	۱۰ر
فی سطر		۸ر	۲ر

فہرست مضامین

*

اداریہ

ہمیں افسوس ہے کہ رسالِ حال مجلۂ طیلسانئین کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اتنی تاخیر کہ اکثر خریداران کو اس کے بند ہو جانے کا شبہ ہوا۔ اس تاخیر کا سب سے بڑا سبب مالی مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں تھا جس کا اظہار گذشتہ شمارہ میں کیا جا چکا ہے۔ سرپرستانِ مجلہ کی ہمت افزائی اور قدر شناسی سے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں اور خاص طور پر کوشش کی جا رہی ہے کہ رسالہ وقت پر شائع ہو۔ پہلی مرتبہ جو تاخیر ہوئی اس کا اثر بعد کے شماروں پر بھی پڑا عنقریب اس نوع کی بے ضابطگیاں رفع ہو جائیں گی

مجلۂ طیلسانئین کے علمی و ادبی معیار کو بلند رکھنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ اس میں پُر مغز، بلند پایہ تحقیقاتی اور سائنٹیفک مضامین شائع ہوتے ہیں طیلسانئین عثمانیہ کے ترجمان اور سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے اس کا معیار قائم رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں جملہ طیلسانئین سے توقع ہے کہ وہ اس معیار کو برقرار رکھنے میں ہماری مدد فرمائیں گے۔

وقتاً فوقتاً اس میں تصاویر کے چھاپنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ گذشتہ شمارہ میں کارکنانِ نمائش مصنوعاتِ مُلکی ۱۳۴۸ف کا گروپ فوٹو اور اس شمارہ میں مقالہ سے متعلق دو تصاویر شریک کی گئی ہیں۔

ہماری یہ کوشش ہوگی کہ مجلہ کے اہتمام اور انتظام سے ہمارے معاونین مطمئن ہوں اور ہمیں توقع ہے کہ

وہ اپنی قدردانی کا عملی ثبوت دیں گے، یعنے اولاً تو وہ اپنے ذمہ کا چندہ ادا کردیں گے اور ثانیاً مجلہ کی توسیع اشاعت کی جانب توجہ مبذول فرمائیں گے تاکہ ادارہ اپنے کام کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

اس ترجمان کے اجرا کا ایک مقصد جیسا کہ قبل ازیں ظاہر کیا جاچکا ہے یہ بھی ہے کہ نوجوانانِ مُلک کے ذوق علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ان قابل قدر اور لائق اشاعت مقالوں کو بھی بالاقساط شائع کیا جائے تاکہ بالآخر وہ کتابی صورت میں منظر عام پر آئیں جو ام اے وغیرہ کے طلبائے جامعہ عثمانیہ نے لکھے اور جو ان کی عدم استطاعتی کے باعث ممنون طباعت نہ ہوسکے چنانچہ اب تک تین ضخیم مقالے جو مستقل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں اس ترجمان کے ذریعہ شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

اس شمارہ سے محمد ناصر علی صاحب ام اے (عثمانیہ) کا مقالہ "موضع دُوبلی کی معاشی تحقیق" کی اشاعت کا آغاز کیا گیا ہے موصوف نے اس مقالہ کو بڑی محنت، کدوکاوش اور مقامی افراد سے مل کر بڑی عرق ریزی کے بعد صحیح معلومات اور اعداد و شمار کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جابجا مناسب اور موزوں مقامات پر تصاویر بھی شریک کی گئی ہیں جس سے اس کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا ہے معاشی نقطۂ نظر سے اس مقالہ کی بڑی اہمیت ہے۔ توقع ہے کہ دیگر مواضعات اور تعلقات کے لئے یہ اسلوبِ تحقیق نمونہ کا کام دیگا۔ اور اس طرح نتیجۃً مُلک کی معاشی خوشحالی میں اضافہ کرنے کی جدوجہد استحکام حاصل کرتی جائے گی۔

اس شمارہ میں مندرجہ بالا مقالہ کے علاوہ جو مضامین شریک کئے گئے ہیں وہ اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

ناظرین کرام کے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ جناب عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی ایس سی (عثمانیہ) نے دنیا کی رفتار سے باخبر رکھنے کے لئے تاریخی، تعلیمی اور معاشی رفتار زمانہ سے متعلق دلچسپ مضامین مجلہ کے لئے تحریر کرنے کا وعدہ فرمایا ہے چنانچہ اس شمارہ سے اس کا آغاز بھی ہوگیا ہے۔ طلبا و امیدواران سیول سرویس کے علاوہ ان تمام اصحاب کے لئے یہ سلسلہ مضامین فائدہ مند ثابت ہوگا جو زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے ایسی معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ کا وقت نہیں نکال سکتے۔ ہم موصوف کے

شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں مجلہ اور ناظرینِ مجلہ کے لئے دلچسپ مواد پیش کرنے کا تہیہ فرمایا ہے۔

مجلہ طیلسائین کی گزشتہ اشاعت کے بعد ملک کا اہم ترین واقعہ حیدرآباد میں اصلاحات کا اعلان ہے۔ مذہب کے بعد سیاست ہی اجتماعی زندگی کی سب سے زیادہ ہمہ گیر طاقت ہے۔ وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ زندگی کے سارے شعبوں کو متاثر کرتی ہے۔

طیلسائین کی برادری کے لئے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ مجلس مقننہ میں ان کے لئے دو نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔ طیلسائین کی صلاحیت اور اہمیت کا یہ عملی اعتراف ایک صحت بخش اصول کا احساس ہے۔

معاشی کمیٹی کی جانب سے اگلے دسمبر میں اعلیٰ پیمانہ پر ملک کی صنعتوں کی نمائش کا اہتمام شروع ہوگیا ہے۔ اس زمانہ میں اورنٹیل کانفرنس اور ریاضی اور فلسفہ کی کانفرنسیں بھی منعقد ہو رہی ہیں۔ باہر کے مہمان کثیر تعداد میں شریک ہوں گے۔

اس سلسلہ میں معاشی کمیٹی پوری سرگرمی سے اس امر کی کوشش کر رہی ہے کہ نمائش کے انعقاد سے قبل مملکت آصفیہ کی مصنوعات کی ایک ڈائرکٹری خاص اہتمام کے ساتھ شائع کرے۔ ڈائرکٹری کے سلسلہ میں ایک خوبصورت کتابچہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ ڈائرکٹری کی اشاعت سے توقع ہے کہ نہ صرف ملک کی گمنام صنعتیں منظرِ عام پر آجائیں گی بلکہ ملک میں صنعتی ترقی کے لئے نئی سرگرمی پیدا ہوگی۔

---

*

از

جناب ماہر القادری صاحب

ہو جو احساس تو پتی بھی ہے تلوار کی دھار — چشمِ بینا ہو تو ذرّہ بھی ہے روشن قندیل
زندگی نام ہے اک جذبۂ آزادی کا — یہ وہ نکتہ ہے کہ جس کی نہیں ممکن تحلیل
پھول بن سکتی ہے ہر وقت دہکتی ہوئی آگ — پھر یہ لازم ہے کہ ہو جرأتِ ایمانِ خلیلؑ
اُمتیں فتنۂ تہذیب سے ہوتی ہیں تباہ — اس میں بابل کے مکیں ہوں کہ بنی اسرائیل
عشق ہر وادی و منزل سے گذر جاتا ہے — خواہ لبنان کی چوٹی ہو کہ صیہوں کی فصیل
شرط یہ ہے کہ تجھے دعوتِ حق کا ہو شوق — ہر کھنڈر میں تجھے آئے گا نظر شہرِ جلیل[1]
رُوحِ فرعون کو ہے ضربِ کلیمی کی تلاش — منتظر آج بھی ہے معجزۂ رودِ نیل
عشق وہ بزم ہے کمزور ابابیلوں سے — کچلی جاتی ہے جہاں قوتِ اصحابِ فیل
ایک ہی شمع کے پروانے ہیں داؤدؑ و مسیحؑ — ایک ہی ساز کے پردے ہیں زبور و انجیل
مجھ کو یہ دُھن کہ رہِ عشق کبھی ختم نہ ہو — تجھ کو یہ ضد کہ ہو افسانۂ دل کی تکمیل
تجھ کو گر دینِ براہیمؑ کی عزت ہے عزیز — ٹھوک دے سطوتِ نمرود کے تابوت میں کیل
سطوتِ جم کو بھی ٹھکرا کے گذر جاتے ہیں — درگہِ عشق و محبت کے گدایانِ ذلیل
اُس سے جنگل کے درندوں کی ہے وحشت بہتر — عصرِ حاضر نے تراشی ہے جو تہذیبِ جمیل
کاش فطرت اُسے ہر وقت طلب کر سکتی — ذہنِ شاعر میں جو غلطاں ہے اچھوتی تمثیل

رُوحِ اقبالؒ سے ماہرؔ کو ملا ہے یہ پیام
شعر وہ ہے کہ ہو جس شعر میں نطقِ جبریلؑ

---

[1] "شہرِ جلیل" (گلیلی)، جہاں حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبلیغ فرمائی تھی۔

مثنوی کا درجہ اصنافِ شعر میں

از

جناب عبدالقادر صاحب سروری ام۔اے، ال ال بی پروفیسر ادبیات اُردو جامعۂ عثمانیہ

ہماری شاعری میں، سب سے اہم صنف مثنوی کی ہے کیونکہ اس میں ایک وسیع مضمون اور مربوط خیال کے نشو و نما کی گنجایش ہے۔ شاعری کی کوئی صنف بھی ہو، بذات خود غیر اہم نہیں سمجھی جاسکتی۔ اچھائی اور بُرائی صناع میں ہوتی ہے۔ ایک باکمال شاعر پیش پا افتادہ اصناف کو بھی، اپنی وجدانی قابلیت کی مدد سے، بے انتہا بلندی تک پہنچا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُردو شاعری کی دوسری دو تین اہم اصناف جیسے غزل، قصیدہ اور رباعی، اساتذہ کے افکار کی اتنے عرصہ سے بطور خاص زیر مشق رہ چکی ہیں، اور ان کے صلی اور بنیادی موضوعات کے اتنے وسیع پہلو طبع آزمائی کے مرکز رہ چکے ہیں کہ، ایک اعلےٰ صناع کے لیے بھی یہ منزل ذرا کٹھن ہی ثابت ہوتی ہے۔ پھر اگر اس کی طبیعت کی اپج، ان میں کچھ جوہر بھی دکھاتی ہے، تو ان کے پڑھنے والوں کے لیے اس صنف کے لوازم اور شکل خود صنف کی اصطلاحی یکسانیت ناخوش گوار ثابت ہوتی ہے۔ غزل گو شاعر، باوجود اپنی تمام قابلیت کے، اس کے بنیادی عناصر کو قائم رکھ کر استعارے سے کام لینے پر مجبور رہے۔ قصیدے میں، غزل کی وسعت بھی نہیں۔ یہ شعر کی ایک صنف ہے کل شاعری نہیں۔ ہماری شاعری پر یکسانیت کے الزام کا ایک بڑا عنصر، اصناف کی تحدید ہے مضامین شعر سے زیادہ، دراصل اسی قید نے بعض اعلیٰ صناعوں کی قابلیتوں کو بھی ضایع کردیا۔ اب ہمارے روشن خیال نقادوں کو، ان کے افکار ایک ناقابل امتیاز اجزا کی ڈھیر نظر آتے ہیں۔

مثنوی میں کچھ تو اس وجہ سے کہ یہ صنف بہت زیادہ تختۂ مشق نہیں بن سکی، اور کچھ اس کی نوعی وسعت کے سبب، بڑی گنجایش ہے اور شاید یہ گنجایش ہمیشہ باقی رہیگی۔ یہ صحیح ہے کہ صناعی ابتدا میں بھی ایمائی اختصار کی حامل ہوتی ہے اور انتہا پر بھی لیکن محض ایمائی اختصار ہی پوری شاعری نہیں ہے۔ غزل گو کی مثال ایک

شئے کے نقش بنانے والے کی سی ہے اور مثنوی نگار ایک بسیط اور مکمل تصویر بنانے والا صناع ہے اسی لیے غزل میں سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی شعر کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ اور یہ، مربوط خیالی، ایک معین مقصد کے تحت، واقعات کے ترکیبی ارتقا، اور متنوع کیفیات اور کائینات کی شاعرانہ تشریح اور توضیح سے پوری ہوسکتی ہے۔ اور یہی مثنوی کے اصلی خد وخال ہیں۔ وہ کہنے کو تو ایک خیالی اور اکثر اوقات ایک فوق الفطرت یا خلاف قیاسی قصہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے ارتقا میں حیات کے بہت سے حسین اور قبیح پہلو آجاتے ہیں اس میں ڈرامائی مواقع، بیانیہ اور توضیح شاعری کی تفصیلات اور طربیہ شاعری کی دل گدازی اور رزمیہ اور قصیدہ کا طمطراق، سب کچھ آسکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ چیزیں تنہا پیش کی جائیں تو شاید اتنی دلکشی کا سامان نہ رکھتی ہوں، لیکن، جب وہ ایک مکمل whole کے ترکیبی عناصر بن جاتی ہیں، تو ان کی دل کشی میں کئی گونا اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ایک شاعر، ایک ہزار شعر کی واحد، مربوط نظم کے سرمایہ کے ساتھ، ہزاروں بلند پایہ اشعار کا دیوان بغل میں دبائے ہوئے سخن سنجوں کے گروہوں کو پس منظر میں ڈال سکتا ہے۔

لیکن یہ بات ضرور ہے کہ مربوط خیالی، اطمینان قلب، اور آسایش دماغ کی پیداوار ہے۔ جہاں یہ مفقود ہو، شعرا کا انتشار قلب، اظہار کے، مناسب اور موزوں ذرائع تلاش کرلیتا ہے۔ وہ بہت کچھ بلکہ سب کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن لمحات فرصت اور اطمینان قلب کا اس کو یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ جو موقع مل جائے اسی کو غنیمت سمجھ کر اس سے پورا فائدہ اٹھالینا چاہتا ہے، شاید اسی لیے کسی طول طویل تجویز کی بیڑیاں اپنے پیروں میں ڈال کر، وہ اپنے کام کو اتفاقات کے خدشوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے بڑے بوڑھے نقاد اپنی طویل، اور شاید خوش حال زندگی کو مدنظر رکھ کر، اس کی جلد بازی کے خلاف طرح طرح سے زہر اگلتے ہیں، لیکن وہ خلاف فطرت کچھ نہیں کرسکتا۔

ہماری شاعری پر بظاہر کچھ خوش حالی کے دور بھی گذرے ہیں مثلاً لکھنو میں آصف الدولہ اور ان کے جانشینوں کا عہد اردو شعرا کے لئے ہمت افزا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مختصر سا زمانہ دو تباہیوں کا وسط ہے۔ لکھنو کی آبادی، دلی کے تباہی بردوش شعرا سے ہوئی۔ ان کی اولاد، جو اگلی نسل کے صدموں سے نا آشنا تھی، اور جس کی آنکھ اس "الکھ لٹ" عہد کی خوش بختیوں میں کھلی تھی، موقع سے فائدہ اٹھاتی، اور فطرت کے اقتضا کو پورا کرتی ہے۔ اور، اردو کی چند مثنویاں، اور شاید ایک بڑی مثنوی، وجود میں آتی ہے۔

اس دور سے آگے بڑھ کر، ہم ایک اور، قدیم تر دور پر نظر ڈالتے ہیں جو طویل تر کارناموں کے لئے

زیادہ موزوں تھا۔ یہ دَور، ایک طویل خوش حالی کا نتیجہ تھا۔ دکن کی بہمنی سلطنت ایک عرصہ کی امن اور آسایش کی زندگی کو ختم کر کے، جب اپنی فطری موت مرتی ہے، تو اس کی پانچ اولادیں اس کی جانشین ہوتی ہیں۔ یہ بیدر کے برید شاہی فرماں روا، احمد نگر کے نظام شاہی حکمران، بیجا پور کے عادل شاہی اور گولکنڈے کے قطب شاہی سلاطین ہیں۔ ان میں سے بعض نو وارد تھے، اور بعض نو دولتی، لیکن ماحول انھیں بہت جلد اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور تربیت دے کر ادب اور فنون لطیفہ کے بڑے سرپرست بنا دیتا ہے۔ صناعی، حُسن کاری اور ادبیت کے تخم جو فضا میں بکھرے ہوئے تھے، وہ ان کی سرپرستیوں میں نشوونما پانے لگتے ہیں۔ اور تھوڑے عرصہ میں ان میں سے بعض سلاطین کے دربار، شعرا اور صناعوں کا قابل رشک مرکز بن جاتے ہیں۔

نظام شاہی حکمران اس معاملے میں قابل رحم ہیں! اپنی جائے وقوع کی قیمت انھیں بہت گراں ادا کرنی پڑی۔ سب سے زیادہ شمال میں ہونے کی وجہ سے یہ ہمیشہ موردِ آفات رہے، شمال کے طاقتور شہنشاہوں کی شمشیریں ہمیشہ ان کے سروں پر چمکتی رہیں اور امن و عافیت ہمیشہ تہ و بالا ہوتا رہا۔ رزم آرائیوں سے انھیں بہت کم فرصت ملی۔ تاہم وہ ایک عظیم الشان تمدن کے پاسبان بنے رہے، گو خود انھوں نے کچھ زیادہ ادبی کارنامے نہیں چھوڑے، لیکن آگے زیادہ جنوب کی دو سلطنتوں یعنے بیجا پور اور گولکنڈے کے لئے یہ سپر بنے رہے! اور انھیں ایک نفیس ادبی مذاق اور شاعری کو نشوونما پانے کا موقع دیا۔ گویا بیجا پور اور گولکنڈے کے ادبی کارناموں کی آبیاری، انھیں کے شجاعوں کے خون سے ہوتی رہی! اس ماحول میں بیجا پور اور گولکنڈے کی ادبی فضا کا فروغ نہ پانا خلاف فطرت تھا۔

بیجا پور کا زرخیز خطہ، اپنے سلاطین کی نفاست پسندیوں اور صنعت گرانہ اپج کی بدولت، تاریخ ہند میں ہمیشہ یادگار رہیگا! اسی طرح گولکنڈے کی جواہر خیز، معدنوں کے ساتھ ساتھ، اس کے ادبی جواہر ریزے بھی ہمیشہ تخیل کا مرکز بنے رہینگے۔

قدیم تر عہد کے اُردو کارناموں میں، امن و آسایش کے عہد کی پیداوار کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے، بلکہ اس عہد کے امن زا ماحول نے، شعرا کے حوصلوں کو ہمیشہ بلند رکھا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا ایک ایک کارنامہ، سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہوتا تھا! اس طرح کے طویل شعری کارنامے، اُردو کے ارتقا کے دوسرے ادوار میں بہت کم پیدا ہو سکے! اس میں شک نہیں کہ

اکثر شعرانے بڑے بڑے ضخیم دیوان چھوڑے جن کے اشعار کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن یہ دیوان زیادہ تر غزلوں پہ مشتمل ہیں، کچھ قصیدے، رباعیاں، قطعے یا ترکیب اور ترجیع بند بھی ہیں۔ اور بعض شعرا کے دیوانوں میں مختصر مثنویاں بھی شامل ہیں جیسے حاتم، میر، سودا، غالب، مومن وغیرہ لیکن سوائے سوز، میرحسن، نسیم اور نواب مرزا شوق کے مستقل طور پر مثنوی لکھنے کی سعی بہت کم کی گئی۔

اس تحریر کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ہم مثنوی اور غزل کا شعریت کے لحاظ سے کوئی مقابلہ اور موازنہ کرنا چاہتے ہیں یا مثنوی کو غزل پر مرجح سمجھ رہے ہیں اسی طرح یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ غزل گو شعرانے ہزاروں اشعار کے جو ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں ہیں۔ ہمارا منشا صرف یہ ہے کہ، غزل، رباعی وغیرہ میں جس طرح کے شعری خیالات کے اظہار کی گنجایش ہے، ان کو ختم کرنے کے بعد بھی ذوق شعری کی تکمیل کے لئے، کسی اور چیز کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ غزل ہو یا رباعی، اپنی بہترین شکل میں بھی، منتشر خیالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور قطعات یا مختصر مثنویاں کسی خاص واقعے کے خاص پہلو روشنی ڈالتی ہیں لیکن ایک طویل اور مکمل و مربوط کام مثنوی ہی کے ذریعہ پورا ہوسکتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی تکمیل میں غزل، رباعی، قصیدہ یا قطعے، سب سے زیادہ محنت، فکر، ربط خیال، ترتیب اور تعمیر کی ضرورت پڑتی ہے اسی لئے جب ایک ہزار شعر کی اچھی مثنوی تیار ہو جاتی ہے، تو وہ پانچ ہزار شعر کے غزل کے دیوان سے زیادہ اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ یہ محض خیال نہیں، بلکہ واقعہ ہے۔ اثر کی مثنوی "خواب و خیال" ایک چار پانچ سو شعر کا مربوط کارنامہ ہے لیکن خاکے، ترتیب، تعمیر اور تکمیل کے نقطہ نظر سے بے حد ناقص ہے شاعر بظاہر ایک قصے کا آغاز کرتا ہے لیکن وہ اپنی ہیروئن کے سراپا اور خدوخال میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر، قصے اور اس کے ساتھ مثنوی کو بھی ادھورا چھوڑ دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک متصوفانہ ذہن، اس کی بے ربطی اور عدم تکمیل میں بھی ربط اور تکمیل پیدا کر سکے لیکن اس سے ایک عام پڑھنے والے کی تشفی نہیں ہوسکتی۔ پھر صناعی کے نقص کا شافی جواب تصوف سے بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے باوجود "خواب و خیال" کو اردو شاعری میں جو مرتبہ حاصل ہے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی

مثنوی کے اجزا

کئی مثنویاں اور بھی گنائی جا سکتی ہیں، جو تخیل کی بلندی اور اسلوب کی لطافت کے نقطہ نظر سے، چند دوسرے درجہ کے غزل گو شعرا کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن پھر بھی وہ اردو شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مثلاً سودا کی اکثر مثنویاں اور میر اور مرزا شوق کی چند مثنویاں، شعریت کے اعتبار سے

کچھ زیادہ بلند رتبہ نہیں رکھتیں لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ غزل اور مثنوی، دو بالکل جدا اصناف ہیں۔ دونوں کی صناعی (آرٹ) میں بہت فرق ہے بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لئے ان کے جانچنے کے معیار بھی جدا ہیں۔ غزل مفرد خیال کا آلہ ہے اور مثنوی مربوط خیال کا۔ غزل میں محض استعارہ ہی کافی ہے۔ لیکن مثنوی میں جب تک حقایق نہ ہوں وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غزل میں تکرار اور تقلید کی گنجایش ہے۔ لیکن مثنوی میں تکرار ممکن نہیں اور تقلید بھی ایک محدود دائرہ رکھتی ہے۔ اسی لیے وہ اردو مثنویاں بھی جو فارسی کا ترجمہ یا اقتباس ہیں یا فارسی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں، ایک مقامی رنگ اور شخصی عنصر رکھتی ہیں۔ اسی لئے زیادہ دلچسپی کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ ایک بلند پایہ غزل گو شاعر کا کلام، عوام کے لئے دلچسپی کا کم مواد رکھتا ہے، لیکن ایک بلند پایہ مثنوی بھی، خواص اور عوام دونوں کے لئے یکساں دل کشی کا مواد رکھتی ہے۔ گویا غزل ذہنی امارت کی ملک ہے اور مثنوی زیادہ تر عوام کی ملک ہوتی ہے، اور اس سے ان کی تعلیم اور درستی مذاق کا کام بہت آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے حالی نے، فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دی ہے۔

غرض مثنوی کا سب سے اہم جز واقعات ہیں، خواہ وہ رزمیہ ہوں کہ بزمیہ، متصوفانہ ہوں کہ محض روایتی۔ بغیر واقعات کے مثنوی وجود میں نہیں آسکتی۔ عشقیہ قصے، مہمات کی داستانیں اردو مثنوی کا اکثر و بیشتر موضوع رہی ہیں لیکن محض اس بنا پر، حالی کی طرح، کوئی نقاد، مثنوی کو ساقط از اعتبار نہیں سمجھ سکتا۔ عشقیہ قصے اور فوق الفطرت داستانیں بھی، اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا کوئی مقصد ہوتا ہے، اور اگر کوئی معین مقصد نہ ہو بھی تو، مسرت زائی کی خصوصیت سے یہ عاری نہیں ہوسکتیں۔ اور یہ ادب کی ایک بڑی علت غائی سمجھی جاتی ہے۔

دوسری چیز مثنوی کا اسلوب اور طرز بیان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں شاعر کو شعری نزاکتوں کے استعمال کی بڑی گنجایش ہے لیکن اس کا بڑا کمال سادگی اور صفائی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی پیش آتی ہے کہ شاعر کی توجہ، واقعات کے ارتقا، ترتیب اور ربط میں زیادہ الجھی رہتی ہے۔ اسی لئے بہترین مثنوی نگار بھی خاص خاص مواقع کے سوا، بہت کم توجہ صنعت گری پر صرف کرسکتا ہے۔

مثنوی کا ایک تیسرا وصف، بیان، توضیح اور تشریح ہے۔ اس میں مقامات اور مناظر کی تشریح کے علاوہ مواقع اور نفسی کیفیات کی توضیحات بھی داخل ہیں۔ شاعر کی قوت مشاہدہ ذرا بھی بیدار ہو، تو وہ

اس ضمن میں، خاص لطف اور کیفیت پیدا کر سکتا ہے اور بیانیہ، توضیحی اور نفسیاتی شاعری کے علاوہ غنائی یا طربیہ شاعری کے بھی اچھے نمونے پیدا ہو سکتے ہیں۔

مثنوی کی رفتار کے دوران میں بیسیوں ڈرامائی مواقع پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اگر شاعر انھیں ذرا عمدگی سے پیش کرے اور مکالموں پر ذرا سی توجہ صرف کرے تو مثنوی میں بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے اور ذہن کے اس ذوق اور تشنگی کی بھی تشفی ہو سکتی ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے۔

ایک طویل کارنامہ ہونے کی وجہ سے مثنوی میں شاعر کا تناظر اور احساس تناسب بھی خاص طور پر معرض امتحان میں آجاتا ہے۔

سب سے آخر میں مثنوی کا وہ مقصد ہے جس پر اس صنعت کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے، بعض وقت مثنوی کا پایہ صرف اس کے مقصد کے مدنظر گھٹ یا بڑھ جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی اُردو مثنوی ایسی لکھی گئی ہوگی، جس کا کوئی مقصد معین نہ ہو۔ یہ مقصد کبھی تو مذہبی ہوتے ہیں، کبھی اخلاقی یا معاشرتی اور کبھی محض صناعی۔

انھیں اسباب کی بنا پر مثنوی، اگر ٹھیٹ صناعی کے نقطۂ نظر سے دیکھی جائے، تو ایک نہایت بسیط اور مرکب صنعت ہے جس کے تمام فنی مقامات پر روشنی ڈالنے کے باوجود بھی لطف اور خوبی کا ایک بڑا حصہ ناگفتہ باقی رہ جاتا ہے اسی لئے ایک ترقی یافتہ تمدن اور معاشرت کے لازمی اجزا کے طور پر مربوط خیالی واقعات کے ارتقا اور ایک مقصد پر ان کے اختتام کو جب تک اہمیت حاصل رہیگی، مثنوی یا مثنوی کی طرز کی شاعری کی ضرورت کم نہیں ہوسکیگی۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ دنیا کے شاعر اپنی زندگی اور تمدن کی وسیع دلچسپیوں اور ضرورتوں میں گھر کر مختصر ادبی شکل کی چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ ہو جائیں لیکن جب کبھی ایک طویل اور بلند پایہ کارنامہ پیدا ہو، اس کے پڑھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے، مصروف سے مصروف زندگی میں بھی چند ساعتوں کی گنجایش نکلتی رہیگی۔

از جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب ام اے۔ ڈی لٹ (قاہرہ) پروفیسر جامعہ عثمانیہ

چند دنوں پہلے تک مصر سے جو بے اعتنائی برتی جاتی تھی اس کی نو اب زیادہ شکایت نہیں رہی ہے حیدرآباد نے تو اپنے باقاعدہ علمی ارسالیات کے ذریعہ بلاد اسلامیہ کی اس ممتاز اور ترقی یافتہ مملکت سے ایک غیر فانی ذہنی ارتباط قائم کرلیا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے ہونہار فارغ التحصیل اس وقت بھی جامعہ مصریہ میں زیر تعلیم ہیں اور اس فکری ارتباط کی توثیق اور استحکام کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی مبارک اور مسعود اقدام تھا جس کے لئے ارباب جامعہ بجا طور پر نقد بر وطن کے مستحق ہیں۔

اپنی تاریخی عظمت، شاندار ماضی اور غیر فانی آثار کے لحاظ سے مصر، دنیا کے ممالک میں سر فہرست دکھائی دیگا تاریخی مطالعہ فراعنہ مصر کے ذہنی ارتقاء اور ان کی عجوبہ روزگار تمدنی ترقیات سے واقفیت کا ضامن ہے اور اب تو آئے دن کے اثری اکتشافات نے قدماء مصر کی عظمت دماغی اور ترقیات علمی کے متعلق انسانی معلومات میں قابل لحاظ حد تک اضافہ کردیا ہے۔ یہ حقیقت اب بے نقاب ہوتی جارہی ہے کہ قدیم مصری تمدن کسی طرح روما، یونان اور فارس کے تمدن سے کم نہیں رہا۔ روما کے دور ارتقاء میں مدتوں تک اسکندریہ بالکل اسی طرح سرچشمۂ علم و تہذیب بنا رہا جس طرح زمانہ خلفاء میں مدرسہ قرطبہ اور مدرسہ بغداد، اور یا جس طرح آج یورپ اور امریکہ کی جامعات۔ اس میں شک نہیں کہ دولت فاطمیہ کا زوال مصر کی پستی اور انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا اور ایک عرصہ تک اس کو بھی اور بلاد اسلامیہ کی طرح بنی نوع انسان کی فکری قیادت سے علیحدگی پر مجبور رہنا پڑا تاہم اس دور انحطاط میں بھی ہمیشہ اس نے اس امتیاز کو قائم رکھا کہ آس پاس کے ممالک کے لئے علمی اور ادبی ترقیات میں مثال اور نمونہ کا کام دے۔ ایوبیین، جراکسہ اور ممالیک کے انتہائی تنزل یافتہ زمانوں میں بھی مصر ہی ایک ایسا مرکز تھا جس سے غیر ممالک فیض پاتے تھے۔ اسلامی علوم اور ادبیات کا یہی ایک

گہوارہ تھا جس سے شمالی افریقہ، بلاد عرب، ترکی اور شام اکتساب معارف کرتے تھے۔ نپولین اول کے داخلہ نے تاریخ مصر میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ فرنچ علماء کی وساطت سے مصر کو مغربی تہذیب اور یورپین اصول تعلیم و تربیت سے روشناس ہونے کا موقع ملا تھا لیکن صحیح معنوں میں مصر اپنی نشأۃ جدیدہ کے لئے اس بیدار مغز اور سلیم الفطرت حکمران کا رہین منت ہے جو بجائے خود تھا تو ایک ارناؤدی اس درجہ ان پڑھ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک فصیح عربی تو درکنار عامی عربی میں بھی کسی صحیح جملہ کے تلفظ یا ایک بھی سطر صحیح لکھنے پر قادر ہو سکا اس کے باوجود تاریخ حکمرانی میں اپنے ملک اور اپنی قوم کی ہمہ جہتی ارتقاء و فلاح کے لئے اس کے کارنامے ایسے نہیں ہیں جن کے بیٹھنے پر تغیرات زمانہ اور مرور ایام قدرت پا سکیں۔ دنیا میں ایسی بہت کم مثالیں ملینگی کہ تنہا کسی ایک شخص نے اپنی دُور بینی، عالی ہمتی، بلند حوصلگی اور روشن دماغی کے بل بوتے پر قعر مذلت و انحطاط کی گہرائیوں میں پڑی ہوئی کسی قوم کو حد درجہ ناموافق حالات میں بخشیم زدن اوج رفعت تک پہنچا دینے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ کون شخص ہے جس کے لئے مصر جدید کے بانی محمد علی کے کارنامے حیرت اور استعجاب کا موجب نہ رہے ہوں۔ زمام حکومت تھامنے کے بعد پہلا کام جو اس نے کیا وہ اہل ملک کے ذہنی ارتقاء اور جدید علوم کی ترویج سے متعلق تھا۔ جہالت کی تباہ کاریوں کو اس کے دردمند دل نے بُری طرح محسوس کیا، بے چین تھا کہ پوری قوم جہل و غباوت کی لعنت سے بزودی ممکنہ خلاصی پا جائے، مغربی تہذیب سے روشناس کرنے اور جدید علوم و فنون کے اکتساب کے لئے ملک کے نوجوانوں کو اس نے بھرتی کرنا شروع کردیا اور یورپ کی جامعات میں ان کا تانتا باندھ دیا۔ ان ارسالیات کا ایک سلسلہ تھا جو ختم نہونے پاتا تھا۔ یورپ میں ان کی فرض شناسی اور کارکردگی کی پوری احتیاط کے ساتھ نگرانی رکھی جاتی تھی۔ فراغ تعلیم کے بعد جب یہ واپس ہوتے تو قلعۃ الجبل میں جو خود محمد علی کی قیام گاہ تھی اس وقت تک کے لئے نظربند کردئے جاتے جب تک کہ وہ اس علم میں جس میں کہ انھوں نے مہارت اور اختصاص حاصل کیا ہو کسی بلند پایہ تصنیف کا عربی میں ترجمہ نہ کردیں۔ زمانہ نظربندی میں مترجمین کے لئے ممکنہ سہولتیں پیدا کیجاتیں اور ان کے اعزاز و اکرام میں کوئی کمی نہ کیجاتی۔ ترجمہ جب ختم ہو چکتا تو اختصاصیین اور مبصرین کی ایک مجلس میں جس کو "لجنۃ الامتحان" کا نام دیا گیا تھا پیش ہوتا۔ لجنہ کی توثیق کے بعد خاص اہتمام کے ساتھ مطبع امیریہ میں اس کی طباعت کا انتظام کیا جاتا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکتا تو محمد علی کے فیاض ہاتھوں ان مترجمین کے نوازے جانے کی باری آتی حسب حیثیت اور قابلیت، عہدوں پر فوراً ان کا تقرر عمل میں آتا عطایوں اور انعام و اکرام سے ان کی ہمت افزائی کیجاتی کہ خدمت وطن میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ زیادہ دن نہ گذرنے پائے تھے کہ محمد علی نے ملک میں ایک ایسا

ذہنی ماحول پیدا کر دیا جو جہالت اور نا واقفیت کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ انقلابات ایام نے جس ہئیات اجتماعی کو جہل اور رامیت کے گڑھوں میں ڈھکیل رکھا ہو اس کی ذہنیت میں یکبارگی اس درجہ تغیر کہ ان پڑھ اور جاہل کے لئے اس میں کوئی جگہ ہی نہ باقی رہے یقیناً تاریخ کے عجوبۂ روزگار واقعات سے شمار ہوگا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ عربی زبان نے صدیوں تک علمی درجہ اور مقام سے محروم رہنے کے بعد علم واستناد کی ان بلندیوں تک رسائی پائی جس کو کسی زبان کا منتہائے کمال قرار دیا جا سکتا ہے۔ مختلف النوع بلند پایہ علمی اور ادبی تصانیف کے ذخیرے بڑی تیزی کے ساتھ عربی میں منتقل ہو رہے تھے۔ صرف اسی ایک واقعہ سے اس تحریک کی قوت و متانت اور کام کی سرعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محمد علی نے ایک مرتبہ اس کام کو شروع کر کے اس کے بہترین نتائج خود اپنی زندگی میں صرف ایک فرنچ زبان کی دو ہزار مستند علمی تصنیفات کو طہطاوی، رشدی، حماد، نحراوی، بہجت، فلکی اور نبرادی وغیرہ جیسے پایہ کے مترجمین کے ہاتھوں عربی میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ لئے۔ علم و ادب کے انھی پرستاروں نے عربی زبان کے ان ہزارہا الفاظ کو از سر نو زندگی بخشی جو عباسیین بغداد اور امویین قرطبہ اور فاطمیین مصر کے دماغی اعجاز کا نمونہ اور دقیق تر علمی مطالب کی تعبیر کا واحد ذریعہ تھے لیکن اسلامی تمدن کے زوال و انحطاط اور علم و حکمت سے مسلمانوں کی بے تعلقی نے ان کو حوالہ طاق نسیاں کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں وضع اصطلاحات کا کام انھی کے ہاتھوں انجام پایا جو آج نہ صرف عربی لغت کا بہترین سرمایہ ہے بلکہ جب ترکوں اور ایرانیوں نے بلاد عثمانیہ اور ایران میں علوم جدیدہ کی تعلیم ترکی اور فارسی میں دینی چاہی تو انھی عربی مصطلات نے ان کی مشکل کو آسان کیا۔

علم و فن سے محمد علی کی اس نادر المثال وابستگی اور ترجمہ و تالیف سے اس کے اس غیر معمولی شغف نے مامون عباسی کی یاد تازہ کر دی تھی، لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ مامون جیسے علامۂ وقت خلیفہ کے لیے اسلامی تہذیب و تمدن کے شباب اور انتہائی عروج و کمال کے زمانہ میں خدمت علم و فن سے متعلق کارنامے اتنے حیرت خیز نہیں ہو سکتے جتنے محمد علی جیسے بیگانہ علم کے لئے۔ اور وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے انتہائی دور ادبار و انحطاط میں۔

محمد علی کی ان اصلاحی سرگرمیوں نے مصر کو نہ صرف بلاد اسلامیہ بلکہ تمام مشرقی ممالک میں مطمح انظار بنا دیا۔ عربی زبان و ادب نے جو صدیوں کے اہمال کے نتیجہ کے طور پر از کار رفتہ نثر مسجع اور

سنغر ریک کا انبار ہوکر رہ گیا تھا اس دور میں اپنے سابقہ علمی درجہ اور مقام کو واپس لیا اور دیانت و امانت کے ساتھ ایک دنیا کی فکری قیادت کا علمبردار رہا۔ محمد علی نے اپنے پیش نظر وسیع اصلاحی پروگرام پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی مہلت نہ پائی تھی کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس کو چھین لیا اور اس کے جانشینوں میں سے اکثر نے ان اصلاحی تجاویز اور منصوبوں پر عمل کرنے کی نہ خود میں قابلیت پائی اور نہ ان کی عیش پسندی اور اسراف نے اس کی مہلت ہی دی اس طرح اصلاح اور تجدید کی چلتی گاڑی میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں اور اتنے زور وشور سے اٹھی ہوئی تحریک بے پناہ اور بے سہارا ہوکر رہ گئی اور اس کو انھی تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑا جس کا مظاہرہ آئے دن شخصی سلطنتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک بلند حوصلہ وسیع النظر، صاحب عزیمت حکمران کسی اچھے کام کی ابتدا کرتا ہے اپنی زندگی تک تو وہ ہر طرح کے موانع اور مشاکل پر غالب آتا اور اس کی کامیابی کے لئے راستے صاف اور پیدا کرتا رہتا ہے لیکن جوں ہی کہ اُس کی آنکھیں بند ہوئیں اس کی تجاویز اور منصوبے بھی مٹ کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف جن کاموں کی ابتدا کسی قوم کے مجموعی ارادے اور عزیمت سے ہوتی ہے تو اس کے باوجود کہ اشخاص فنا ہوتے رہتے ہیں، قومی منصوبے برابر اپنے تقدم اور کامیابی کے راستے پیدا ہی کرتے رہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ محمد علی کے بعد کچھ عرصہ کے لئے نہ صرف یہ کہ ترقی کی رفتار ہی رک گئی بلکہ مصر نے اپنی آزادی بھی جو ہر طرح کی ترقیوں کی بنا د ہوا کرتی ہے کھو دی تھی، لیکن اس حقیقت سے انکار بھی کوئی آسان کام نہیں کہ مصر جدید کی عقلی تحریکات، ادبی رجحانات اور ملک کے استقلال اور آزادی سے متعلق منظم قومی جد وجہد کا بیج محمد علی ہی کے ہاتھوں بویا گیا تھا جو آج پھلتا اور پھولتا دکھائی دے رہا ہے۔

خدیو اسمٰعیل کے تعیش اور مجنونانہ اسراف نے جب ملک کے خزانہ کو کھوکھلا کر دیا تھا تو اپنی متعیش زندگی کی پیاس بجھانے اور ملک کی مالی ساکھ قائم رکھنے کے لئے ممالک یورپ سے خطیر مقدار میں قرض لینے کی ضرورت دامنگیر ہوئی، استعماری سلطنتیں اس طرح کی فیاضانہ دستگیری کے مواقع تو ڈھونڈتی ہی رہتی ہیں، دول یورپ نے اس زرین موقع سے کماحقہٗ فائدہ اٹھایا اور اس طرح مصر کو اقتصادی غلامی کی بیڑیوں میں کس دینے کی دیرینہ تمنائیں پوری ہوگئیں، رہی سہی سیاسی آزادی کا قلع قمع خدیو توفیق کی بیجا ہٹ، مفاد ملک سے بے اعتنائی اور وطن پرست جماعت سے کشمکش نے کیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی، اجنبی امتیازات کے خلاف چھ ملکی مطالبات تھے جن کے تسلیم کرنے میں خدیو توفیق کی کمزوری اور بودی فطرت مانع

ہو رہی تھی، وطن پرست طبقہ کا نفس ناطقہ عرابی پاشا نے جو وزیر حرب تھے ان قومی مطالبات کے منوانے کے لئے بالآخر تنگ آکر خدیو وقت پر فوجی دباؤ ڈالا۔ قدرت نے مصر کو رہی سہی سیاسی آزادی سے بھی محروم کر دینے کا ایک نایاب موقع دول استعمار کے لئے پیدا کر دیا۔ عذر یہ نکل آیا کہ عرابی کے فتنہ سے مالیین یورپ کو اپنے مطالبات کی پابجائی کے متعلق خطرات اور اندیشے لاحق ہوگئے ہیں لہذا دول یورپ کے لئے اس فتنہ کا قلع قمع کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ انگلستان نے اس موقع پر پیش قدمی کی اور خود کو نمایندہ دول قرار دیکر اس فتنہ کے فرو کرنے کے لئے مصر کے طول و عرض میں اپنی فوجوں کا جال پھیلا دیا۔ مصر میں برطانوی اضمحلال کی بنا تو صرف اسی قدر تھی اور بعد میں چلکر نہر سویز کی حفاظت کا شاخسانہ جو کھڑا ہوا تو اس میں قصور اختلال کا نہ تھا قصور سراسر سرزمین مصر کی جذابیت اور دلکشی کا تھا کہ ایک مرتبہ یہاں آکر پھر چھوڑنے کو کسی کا دل نہیں چاہتا لہذا نہ قوت اختلال کو سویز سے استغنا ہوا اور نہ مصر کو اختلال سے نجات ہے۔ اب مصر نے اپنی سیاسی آزادی ہی کھودی تھی اور مالیین یورپ کے لئے مصر سے بلند پیمانہ پر تجارتی اور زراعتی تعلقات قائم کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اکثر حالات میں بڑی بڑی عمرانی تجاویز پر اخلاص اور صداقت سے عمل کیا جو مصر کی حالیہ انتصادی اور معاشی بیداری میں حد درجہ مفید ثابت ہوئیں۔

لارڈ کرومر جیسے بیدار مغز اور مدبر برطانوی ہائی کمشنر کی نگرانی میں انگریزوں کے کارنامے ملک کی زراعت اور آبپاشی کی تحسین اور حکومت کی بہتر تنظیم سے متعلق یادگار رہینگے۔ لارڈ کرومر نے مصر کی فکری آزادی پر قیود عاید کرنا کبھی پسند نہ کیا، اس کا قول تھا کہ انسانی فکر اور خیال کا کھلے بندوں چھوڑ دینا ہی بہتر ہوا کرتا ہے ورنہ ان کا اندر ہی اندر ایسے متعفن مادہ کی شکل میں منتقل ہو جانا مستبعد نہیں جو ہر وقت پھوٹ پڑنے کے لئے آمادہ اور پھر جب ایک مرتبہ پھوٹ پڑے تو اصلاح و تدارک محال ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں مصر کے اخبارات کو جو آزادی نصیب ہوئی مشرقی ممالک میں شاید ہی کسی ملک کے اخبارات کو نصیب ہوئی ہو۔ اس قدر آزادی دیدینے کے باوجود لارڈ کرومر نے مصریوں کو کبھی پیشہ زراعت سے آگے نہ بڑھنے دیا یا زیادہ سے زیادہ حکومت کی ایسی ملازمتیں ان کی نذر کی گئیں جن کا تبرع برطانوی سیاست پر موثر نہو۔ اس سیاست اور طرز حکومت کے پیچدار اور بے پناہ مفہوم سے مصری وطن پرست غافل نہ تھے۔ آزادی اور ترقی سے متعلق محمد علی کبیر کی پیدا کی ہوئی چنگاری کو انقلابات ایام نے صرف راکھ تلے دبا ہی دیا تھا بجھایا نہ تھا اس کو از سر نو بھڑک اٹھنے کے لئے صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی۔ آزادی اور تقدم کی روح جب کسی قوم میں

سرایت کرجاتی ہے تو پھر دنیا کی مادی قوتیں اس کے میٹنے پر قادر نہیں ہوسکتیں، یہ اور بات ہے کہ کچھ دنوں کے لئے یہ اپنی سابقہ تابناکی سے محروم ہوجائے تاہم ایک معمولی سا بہانہ اس کو حیات نو بخشنے کے لئے کافی ہوجاتا ہے چنانچہ برطانوی فوج کے چند جلد باز سپاہیوں نے یہ بہانہ پیدا ہی کردیا۔ بات اتنی ہوئی کہ مصر کے ایک قریہ دنشوائی میں چند فوجیوں نے شکار کی ٹھانی، کاشتکاروں کے جھونپڑوں پر پلے ہوئے کبوتروں کو منکتا دیکھ کر چاہا کہ انھی کو نشانہ بنائیں، ادب اور لجاجت کے ساتھ جب کاشتکاروں نے مزاحمت کی تو پرندوں کی بجائے انھی میں سے چند کو نشانہ پر رکھ لیا، تڑپتی ہوئی لاشیں جب ٹھنڈی ہوچکیں تو یہ بھی اپنی بارکوں کو لوٹ آئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان چند کسانوں کا خون توقع سے زیادہ گراں ثابت ہوا، شہرۂ آفاق مصری وطن پرست مصطفیٰ کامل، اسی واقعہ کی پیداوار ہے جس نے صرف اسی ایک چیز کو سپر بنا کر ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک استعمار کے خلاف ایک ایسی ہل چل پیدا کردی کہ برطانوی طاقت اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کو دبانے سے عاجز رہی یہ معلوم ہوتا تھا کہ پورا ملک ان چند فلاحوں کے ایک ایک قطرۂ خون کا حساب لینے پر تلا ہوا ہے، سیکڑوں نہیں ہزاروں نے اس راہ میں اپنی جانیں قربان کردیں اور استعمار کے خلاف ایک ایسی منظم جدوجہد کی ابتدا ہوئی جس کا دائرۂ عمل صرف سرزمین مصر ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ ممالک یورپ خصوصاً انگلستان میں اس تحریک کے داعی پوری قوت سے اپنا کام کررہے تھے ملک کی اس یکبارگی سیاسی بیداری نے مدبرین یورپ کو حیران کر رکھا تھا۔ درپردہ خدیو عباس کی تائید وطن پرستوں کے شامل حال تھی، اس چیز نے آزادی کی اس تحریک کو اور قوت بخشی۔ لارڈ کرومر تک جس کی بیدار مغزی اور تدبر کا ایک عالم میں ڈنکا بجا ہوا تھا اس گتھی کو سلجھانے سے عاجز نظر آتا تھا زیادہ خطرناک صورت حال خود فلاحین میں آزادی کی روح کا سرایت کرجانا اور شہری وطن پرستوں کے دوش بدوش اس تحریک میں ان کا ساتھ دینا ہوئی، اس موقع پر مصر کی ترقی یافتہ اور آزاد صحافت کو اہل ملک کی سیاسی اور اجتماعی تربیت میں بڑا دخل رہا آزادی کی اس طویل داستان میں جو چیز زیادہ دلچسپ اور محل استعجاب ہے وہ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ مذہبی بیداری کا نشوونما پاتا ہے۔ واقعہ نفس الامری تو یہ ہے کہ مصر کی نشاۃ جدیدہ اور اس کی موجودہ ترقیات کا ذکر قطعاً ناتمام رہ جائیگا اگر اس دور کی تحریک اصلاح مذہب پر کسی قدر روشنی نہ ڈالی جائے۔

مدتوں کے ذہنی جمود و فکری انحطاط ادبار و تنزل اور علم و حکمت سے بیگانگی نے مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بسیط اور فطری اصول سے اس درجہ ناآشنا اور اسلام کی سیدھی سادی تعلیمات سے ان کو اس قدر

دور کر دیا تھا کہ ان کو دیکھ کر ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی کا مصداق نظر آ جائے ۔ ذمیم تعصبات لفظی مناقشات
اور حد درجہ رکیک اوہام و خرافات مسلمانوں کا شعار بنے ہوئے تھے علماء جو ورثۃ الانبیاء ہونے کے مدعی اور
حمایت دین متین کے ٹھیکے دار تھے زمانہ کی رفتار سے ناواقف اور وقت کی ضرورت سے بے خبر آپس کے اختلافات
اور منافرانہ تحریکات کے ہاتھوں ایک دوسرے کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے کسی تعمیری کام کی طرف تو ان کو کیا
توجہ ہوتی ان کے لئے اگر زندگی کا کوئی دلچسپ مشغلہ تھا تو صرف اس قدر کہ رہے سہے مسلمانوں کی تکفیر اور تلقین میں
اپنے تفقہ فی الدین کے جوہر دکھائیں اور خود ان کی اپنی یہ حالت تھی کہ ؎

ترا از کافِ کفرت ہم خبر نیست حقائق ہائے ایماں را چہ دانی

حماۃ دین کی اس نفس پرستی، تنگ نظری اور غفلت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کا قومی شیرازہ بکھر جائے۔ متحد مذہبی
نصب العین مٹ جائے اور ان کی معاشرت اور زندگی کلیۃً ایسے رسم و رواج کی پابند اور غلام ہو جائے
جس کو مذہب سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ رسم و رواج نے اسلام کے سیدھے سادے اصول اور احکام مذہب پر
تفوق حاصل کر لیا تھا مسلمانوں کے گھر اسلامی تعلیمات سے محروم ہو چکے تھے۔ جامعہ ازہر جو کسی وقت اسلامی تہذیب
اور مسلمانوں کی عظمت دماغی کا نمایندہ، علم و حکمت اور بحث و تحقیق کا مرکز بنا ہوا تھا اب اس کی لسان حال
مسلمانوں کے ادبار اور انحطاط کی داستان گو تھی اور اس کی دماغی کاوش اور ذہنی جولان کا انحصار تدریس متن
تقریر شرح، تفسیر حواشی توضیح تعلیقات اور لاطائل و بے معنی لفظی مناقشات پر ہو کر رہ گیا تھا اس کا نصاب تعلیم
وہ تھا جو صدیوں پہلے بھی بے فائدہ ثابت ہوتا اور طریق تعلیم ایسا کہ صدیوں بعد بھی اس کے سمجھنے سے عقل
قاصر رہے۔ طلبہ جو اپنی نوخیزی میں اکتساب علم کے لئے داخل ہوتے اپنی عمر کے آخری لمحوں تک تکمیل نصاب کی
سعادت سے محروم رہتے۔ ہزارہا طلبہ تھے جو ازہر کی چار دیواری میں کسلمندی، بیکاری اور غباوت کی زندگی
بسر کرتے تھے ان کی زندگی کا کوئی نصب العین ہی نہ تھا۔ ان کی اخلاقی تربیت کا سوال ایک ایسی چیز تھی جو
کبھی بھی حضرات شیوخ ازہر کی گرانی فکر کا باعث ہوئی تھی ان کے اس اہمال نے ان کے ہر طرح کے شریفانہ
اوصاف کا استیصال کر دیا تھا، روپیہ اور پیسہ کی کمی کا سوال نہ تھا صرف اوقاف ہی کی آمدنی کی بہتات اور
افراط کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کا جائز اور صحیح مصرف ہوتا تو اس کو خدمت و انسانیت کے یورپ اور امریکہ کی
کسی بہتر جامعہ سے کم مواقع حاصل نہ ہوتے لیکن مصرف اس کا اگر کچھ تھا تو یہ کہ شیوخ ازہر کی جیب اور معدہ کی
خاطر خواہ ضیافت کا سامان مہیا ہو۔ جناب شیخ کے لئے علاوہ معتد بہ ماہوار کے روزانہ ایک ہزار روٹی

مقرر تھی" اور درآں حالیکہ طلبہ ایک یا دو روٹی سے زیادہ نہ پاسکتے تھے۔ جناب شیخ کا گدھا طے مسافت کے صلہ میں (۰۰۰ ۵) روٹیوں کا حقدار قرار دیا گیا تھا، اور یہ علاوہ اُس کئی سو ایکڑ زمین کے تھا جو اس کی چندی اور گھانس کی سربراہی کے لئے معین تھی۔

گذشتہ صدی کا ربع اخیر وہ زمانہ ہے کہ ادبار وانحطاط کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں دنیائے اسلام کے ایک سچے خادم جمال الدین افغانی نے اصلاح مذہب اور مسلمانوں کے نصب العینی تقدم وارتقاء سے متعلق وسیع تجاویز کو بروئے عمل لانے کے لئے سرزمین مصر کو اپنا مستقر بنایا۔ دنیائے اسلام کے لئے جمال الدین افغانی کے کارنامے مصر کے روشن خیال اور حساس طبقہ کو ان کے مناسب مقام خیر مقدم کے لئے بہت پہلے آمادہ کرچکے تھے۔ مصر پہنچکر ان کی جذاب شخصیت نے بہت جلد اپنے ہمنوا اور حلقہ بگوش پیدا کرلئے۔ اپنے متبعین اور تلامذہ کے ایک وسیع حلقہ میں انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات کی نشر و تبلیغ شروع کی۔ اتحاد اسلامی کی تحریک جمال الدین افغانی کے اصلاحی پروگرام کا لب لباب تھی جس نے مستعمرین یورپ کے لئے نیند حرام کررکھی تھی۔ اس تحریک کا بانی ہونے کی حیثیت سے جمال الدین افغانی کے لئے عرصہ حیات تنگ ہوچکا تھا اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی تھی کہ جہاں ان کو چین اور اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوا ہو، ہندوستان سے بھاگے ہوئے ایران میں چین نہ لینے پائے تھے کہ یہاں سے بھی نکالے گئے، مصر پہنچکر جب ان خیالات کی ترویج شروع کی تو قوت استعمار نے ان کو بچشم غضب دیکھا اور بہت جلد ان کی شہر بدری کی افواہیں گرم ہونے لگیں۔ اس انجام کے وہ نہ صرف عادی تھے بلکہ منتظر بھی۔ تاہم اس قلیل عرصہ قیام مصر میں انھوں نے ایک ایسی جماعت پیدا کردی تھی جو ان خیالات سے پوری طرح متاثر ہوچکی تھی اور ان کی تبلیغ واشاعت میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار تھی۔ ان کے تلامذہ میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز شیخ محمد عبدہ تھے جن کو اپنے استاد کے فیض صحبت اور تعلیم کا بدرجہ اتم حصہ ملا تھا۔ شہر بدری کا حکم ملا تو اپنی جگہ پر محمد عبدہ کو چھوڑا، اور فرانس کا رُخ کیا۔ محمد عبدہ نے اپنی ہمہ گیر شخصیت، علمی تبحرّ، جذبہ ملیّ، اور احساس قومی کی وجہ سے مُلک میں ہر دلعزیزی حاصل کرلی تھی۔ انھوں نے آخر وقت تک اپنے استاد کی رفاقت اور ان کے خیالات سے کامل اتفاق اور ہمدردی کا ثبوت دیا، خدیو عباس کی تائید نے ان کے ارادوں میں مزید استحکام اور ان کے حوصلوں میں مزید تقویت پیدا کی اور شہر بدری کے بھوت سے ان کو چندے امان ملگئی اور بڑی مستعدی اور دیانت کے ساتھ انھوں نے اپنے استاد کے خیالات کی ترویج شروع کی۔ سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ مذہبی تعصبات کا مقابلہ اور عقائد مذہب کو رسم ورواج " اور

ہام وخرافات کی آمیزش سے پاک وصاف کرنا تھا۔ قدامت پسندوں کی مخالفت اورنفس پرست کوتاہ بیں دلویوں کی تکفیر کے باوجود ملک کے سنجیدہ طبقہ خصوصاً نوجوانوں کے دل میں ان کی تعلیمات نے گھر کرلیا اور بہت لد آزادی فکر کی ایک بالکل ہی نئی اور مقدس فضا سماءِ مصر پر محیط دکھائی دینے لگی۔ اس چیز کو محمد عبدہ نے بڑے قوی دلائل سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ اسلام زمانہ کے ہر طرح کے انقلابات اور تغیرات ورزندگی کی ہر طرح کی پیچیدگیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے عالمگیر ہونے اور اعلیٰ سے اعلیٰ علمی، تمدنی اور تہذیبی ترقیات میں اس کی موزونیت اور مناسبت پر انھوں نے جس سنجیدگی، متانت اور قابلیت سے بحث کی ہے وہ نہ صرف عربی لٹریچر کی جان ہے بلکہ اس نے اپنوں کو خواب غفلت سے جگانے اور مخالفین کو اس کی حقانیت کے قائل کرنے میں وہ کام کیا جس کو اگر جادو کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی اس کامیاب سعی نے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور مغرب کے سائنٹفک نظریات میں کوئی تصادم اور تعارض نہیں، ان کو نہ صرف بلاد اسلامیہ میں ایک مجدد اور مصلح کا درجہ دیدیا بلکہ یہی چیز متمدنہ ممالک میں ان کے وقار و احترام اور شہرت کا موجب ہوئی۔ بے پناہ ہمت اور مستعدی کے ساتھ انھوں نے جامعہ آزہر کی اصلاح پر توجہ کی، ایک ایسی تمنا جو مدتوں سے ان کے دل کی گہرائیوں میں پرورش پا رہی تھی اب متحقق ہونے کے لئے بے چین تھی، یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس طرح کا اقدام بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہوگا لیکن اسی کے ساتھ اس کا بھی ان کو پورا یقین تھا کہ پورے ملک کی اصلاح اسی درسگاہ کی اصلاح پر موقوف ہے، اس کام کے لئے انھوں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ علماء ازہر کی مخالفت کا ایک دریا امڈ آیا اور ان مفتیان شرع متین نے اسلام کے اس بے لوث خادم کی تکفیر میں اپنی تفقہ اور تورع کے جوہر دکھانے شروع کئے لیکن محمد عبدہ کی لگائی ہوئی آگ ایسی نہ تھی جو آسانی سے بجھائی جاسکتی! اس مخالفت نے تو اصلاح پسندوں کی ہمت کو اور بڑھا دیا اور بتدریج اس مقصد کی تحصیل کے لئے انھوں نے نئی نئی تجاویز پر عمل کرنا شروع کیا۔ انھی تجاویز کے تحت دارالعلوم مصر اور مدرسہ قضاءِ شرعی نے وجود پایا جو آج بلاد اسلامیہ میں علوم عربیہ اور دینیہ کی تعلیم کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ آزہر میں صدہا ایسے طلبہ تھے جن کی فطری قابلیتوں اور ذہنی بنوع اور کمال کا محض ناموافق حالات کے ہاتھوں خون ہو رہا تھا۔ آزہر ان کی تشنگی علم کی آبیاری سے قاصر اور اس کے نصاب اور طریق تعلیم میں کسی فوری تغیر اور اصلاح کا ہونا مشکل تھا۔ ان دونوں درسگاہوں کے قیام نے ان کے لئے موافق فضا

پیدا کر دی اور ان میں سے جس کسی نے خود میں ادبیات کی تحصیل کا میلان پایا اس کے لئے دارالعلوم کے دروازے کھلے ہوئے تھے، علوم دینیہ سے جن کو مناسبت تھی انھوں نے مدرسہ قضاء شرعی کا رُخ کیا۔ ان درسگاہوں کے قیام نے مصر میں ادبیات اور دینیات کی تعلیم کو اتنے بلند معیار پر پہنچا دیا کہ بلاد اسلامیہ میں کہیں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مصر میں موجودہ ادبی اور مذہبی مباحث اور تحقیقات انھی درسگاہوں کی رہین منت ہیں۔ انھی کی چار دیواری میں اسکندری۔ علام۔ تونی۔ حمزہ فتح اللہ۔ زناتی وغیرہ نے تعلیم پائی تھی اور آج بھی وہ ہستیاں ہیں جو علوم عربیہ کی سرتاج شمار ہوتی ہیں۔ ان کے اختصاصی درجہ اور کمال کو یورپ کی جامعات نے تسلیم کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی جامعات نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ عمرادی بک، حفنی ناصف اور شیخ عبدالعزیز جاویش نے مدتوں تک ان جامعات میں ادبیات عربی کی دراست کا کام انجام دیا ہے اور آج بھی مہدی علام کیمبرج میں اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان درسگاہوں کے قیام نے مصر میں مذہبی اور ادبی تعلیم کے مسئلہ کو بہت بڑی حد تک حل کر دیا تھا، تاہم یہ پورے درد کی دوا نہیں ہو سکتے تھے۔ جامعات یورپ کے معیار پر جدید علوم و فنون کی تعلیم کا مسئلہ ہنوز حل نہ ہوا تھا اس ضرورت کے شدید احساس نے جامعہ مصریہ کی بنا ڈالی۔ لارڈ کرومر کی سیاست مُلک میں کسی سرکاری جامعہ کے قیام یا علوم جدید کی اعلیٰ تعلیم کی موافق نہ رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وزارت تعلیمات مصر کی قیام جامعہ سے متعلق ہر تجویز پیچیدگیوں اور مصطنعہ طوالت میں الجھ کر رہ جاتی تھی۔ وزارت تعلیمات کے تحت جو مدارس اور کلیات تھے وہ بھی اس مقصد کو پورا نہ کر سکتے تھے! اس قومی جامعہ کے قیام نے مُلک کی دیرینہ تمناؤں کو پورا کیا۔ بلند پیمانہ پر اس میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یورپ کے نامور علما و اختصاصین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وسیع پیمانہ پر بحث و تحقیق کے انتظامات کئے گئے۔ پرنس فواد کی سرپرستی اور سعد زغلول پاشا کی چانسلری میں اس نے اس میدان بحث و تحقیق میں اپنے درجہ اور مقام کو منوا کے چھوڑا اور دنیا سے یہ تسلیم کروا دیا کہ دماغی قابلیت اور کام کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے مصر، یورپ کے کسی متمدن مُلک سے کم نہیں۔ آج علمی دنیا ڈاکٹر طٰہٰ حسین، منصور فہمی، احمد امین، حسین ہیکل، لطفی جمعہ اور مصطفیٰ عبدالرزاق جیسے مشاہیر کے مقام بحث و تحقیق سے بخوبی واقف ہے۔ ان سب نے اسی جامعہ مصریہ کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور آج مصر کی موجودہ ارتقائی ذہنیت میں ان میں سے ہر ایک نے وہ کام کیا ہے کہ جس کی تفصیل میرے لئے

دشوار ہے۔ اس ادارہ کی روز افزوں اور ہمہ گیر ترقی نے بالآخر حکومت کو بھی اس کی سرپرستی اور تائید پر
باوجود دس پردہ شدید مخالفتوں کے مجبور کردیا اور سب سعد زغلول مصر کی تحریک آزادی عروج کے
زمانہ میں برسر اقتدار ہوئے ہیں تو انھوں نے رہی سہی مخالفت کا بھی قلع قمع کردیا اور اس طرح کامل طور پر
اس کو حکومت کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ حکومت کی اس دلچسپی نے جامعہ مصریہ کی راہ سے ہر طرح کے
موانعات کو دور کردیا ہے اور وہ ارتقائی زینوں کو بڑی تیزی سے طے کرنے میں مصروف اور مسلمانوں کے
ذہنی ارتقاء و کمال کا تنہا آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔

محمد عبدہ کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر ہونے والوں اور ان کے فیض صحبت سے کامل
استفادہ کرنے والوں میں قاسم بک امین کا نام اصلاح نسواں سے متعلق اپنے شاندار کارناموں کے لئے
یادگار رہیگا۔ خواتین مصر کی حالیہ بیداری اسی محب وطن کی بے لوث خدمات اور بے ریا مساعی کا نتیجہ ہے
مدتوں کے جمود، مردوں کے ناروا جور و تعدی اور اپنے حقوق سے غافل رہنے کے بعد آج خواتین مصر
بمقابل دیگر بلاد اسلامیہ کے زندگی کے ہر شعبہ میں تفوق اور امتیاز کی مالک ہیں۔ ان کے نصب العینی تقدم کی
راہ میں اب پردہ کا مسئلہ حارج اور مانع نہیں رہا ہے۔ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم کبھی کی جاری ہوچکی ہے،
ہر قسم کی اجتماعی اور سیاسی تحریکات میں بڑی مستعدی سے یہ حصہ لیتی ہیں۔ تقریر اور خطابت میں یہ نہ صرف
فصیح و بلیغ بلکہ شعلہ نار ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہوسکتا جو ان کو کسی جلسہ میں تقریر کرتا دیکھے اور ان کی
طلاقت لسانی سے مسحور ہوکر نہ رہ جائے۔ میدان تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں یہ مردوں سے کم نہیں ہیں
هدا هانم سعراوی۔ باحثۃ البادیۃ، آنسۃ می، صفیۂ زغلول فوزیہ هانم سما، مصر کے وہ درخشاں تارے
ہیں کہ مصر اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں اور سیاسی بیداری کے لئے بڑی حد تک انھی کا رہین منت ہے۔
میدان سیاست میں انھوں نے جس قابلیت اور تدبر کا ثبوت دیا ہے اس نے ملک کی عزت اور وقار میں
اضافہ کردیا ہے۔ متعدد وسیع الانتشار جرائد ان کی ادارت میں بڑی کامیابی اور نیکنامی کے ساتھ چل
رہے ہیں، ملک کی سیاست میں ان کی رائے کو دخل ہے اور حقوق وطن کی مدافعت میں ان کے کارنامے
روشن رہے ہیں، خدمت وطن کی راہ میں انھوں نے ہر طرح کے مصائب ابتلا کا بڑی خندہ پیشانی
کے ساتھ استقبال کیا، اولاد، احبا، اور اقربا کی جدائی اور جیل خانوں کے تاریک کمروں نے
مدافعت وطن کے راستہ میں ان کے پائے ثبات کو کبھی متزلزل ہونے دیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ زغلول کو

اپنی سیاسی جدوجہد میں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوتی اگر خواتین مصر نے نادر المثال پامردی کے ساتھ اس کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔ ملک کی سیاسی بیداری کی ترقی یافتہ شکل وہ قومی جدوجہد ہے جو جنگ عظیم کے اختتام پر سعد زغلول پاشا کی قیادت میں شروع ہوئی اور اپنی قوت و متانت کے لحاظ سے ایک دنیا کے لئے محل استعجاب ہوئی، یہ اسی بیدار مغز وطن پرست اور وقت کے بڑے مدبر کی صداقت، اخلاص، فدائیت اور عظمت دماغی کے مظاہر ہیں کہ مصر آج ترقی کے اس زینہ پر وقعت اور احترام کی نظر سے دکھائی دیتا ہے، یہ اسی کی قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ بالآخر حکومت احتلال کو مصر کے ساتھ حالیہ معاہدہ پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی کے ہاتھوں دستوری زندگی کی بنا پڑی۔ پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا، اور خود سعد زغلول نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھامی۔ محمد عبدہ کے فیض صحبت سے زغلول نے کما حقہ استفادہ کیا تھا ان کی تعلیمات نے اس کے دل میں جگہ کرلی تھی، برسراقتدار ہونے کے ساتھ ہی اس نے ملک کی ہمہ جہتی ترقیات سے متعلق تجاویز پر غور کرنا شروع کردیا۔ جامعہ مصریہ کی جدید تنظیم کی۔ ملک کی تعلیمی پالسی جو غلامی کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی سرے سے بدل دیگئی، نئی پالسی کی بنیاد نوجوانوں کی صحیح اخلاقی تربیت، قومی احساس اور وقت کی ضرورت پر رکھی گئی، عربی زبان کو اس نے ذریعہ تعلیم قرار دیا، احتفاظ حقوق نسواں پر اس نے بطور خاص توجہ کی، مخلوط تعلیم نے اس کی تائید اور حمایت سے رواج پایا۔ میدان سیاست میں اپنی کامیابی اعلان دستور اور افتتاح پارلیمنٹ کی وجہ سے جو غیر معمولی ہر دلعزیزی اس نے حاصل کی تاریخ مصر میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اہل وطن سے اس تعلق نے اس کے صدہا کاموں کو آسان کردیا حتیٰ کہ جامعہ ازہر کے نصاب اور طریق تعلیم میں تغیر و تبدل کے لئے جب اس نے پیش قدمی کی تو شیوخ تک نے اس کا ساتھ دیا، اور جو چیز محمد عبدہ کے لئے دشوار بنی ہوئی تھی وہ زغلول کے لیے آسان ہوگئی، چنانچہ اس نے علوم قدیمہ کے ساتھ جدید مضامین کو داخل نصاب کیا، روشن خیال اور قابل علماء کو تدریس کی خدمات دیں، طلبہ کی رہائش کا معقول انتظام اور ان کی اخلاقی تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ جامعہ ازہر سے زغلول کی اس غیر معمولی دلچسپی نے اس درسگاہ کو اصلاح اور تقدم کے راستہ پر ڈالدیا ہے اور اس طرح توقع ہے کہ جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی ایک دیرینہ مراد بر آئے۔

یہ صحیح ہے کہ آج مصر زغلول کی قیادت اور رہنمائی سے محروم ہوچکا ہے لیکن زغلول کی پیدا کی ہوئی روح زندہ ہے اور برابر اپنا کام کئے جارہی ہے۔ زغلول کے جانشینوں نے اپنے عظیم المرتبت پیشرو سے اخلاص،

صداقت اور فدائیت کا بدرجہ اتم حصہ پایا ہے۔ وہ اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ملک کے سیاسی
فقدان کے حل میں وہ سب کچھ کر رہے ہیں جس کی کسی محب وطن سے توقع کیجا سکتی ہے۔ مصر کی حالیہ بے چینی سے آپ بخوبی
واقف ہیں اس موقع پر قومی مطالبات کی شنوائی دستور مملکت کے از سر نو احیا اور افتتاح پرلمان میں زغلول کے
جانشین مصطفیٰ نحاس ہی کے سیاسی تدبر، صداقت کار اور حب الوطنی کو دخل رہا ہے۔ برطانیہ سے معاہدہ تحالف کے بعد
انھی کی ریاست میں مصر کی پہلی دستوری وزارت کا قیام ہوا تھا، اور اب انھی کی ذات سے مصر کی کامل آزادی
اور اس کی ہر جہتی فلاح و بہبودی کی خوش آیند توقعات وابستہ ہیں۔

مصر کے دار الخلافہ قاہرہ میں جہاں کہیں بھی آپ کا گذر ہو، آپ عجیب و غریب طریقہ پر دلکشی اور جذابیت کے
سامان مہیا پائینگے۔ اسٹیشن قاہرہ سے جوں ہی آپ نے قدم باہر رکھا کہ مصری قومیت اور روح حریت کے ایک زبردست
مظاہرہ سے آپ دوچار ہوئے۔ مصری فنان محمود مختار کا فنی شاہکار یعنی حالیہ بیداری مصر کی عظیم الشان تمثال
آپ کے استقبال اور آپ کو قومی تحریک کے ثبات استقلال اور عظمت سے مرعوب کرنے کے لئے تیار ملیگی۔
بڑی بڑی خوب صورت وسیع صاف و شفاف اور دونوں جانب ایستادہ سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی
سڑکوں کا جال شہر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا دکھائی دیگا، ان کی دونوں جانب خوش منظر اور فلک بوس
مکانات کا سلسلہ ہوگا جو ختم ہونے کا نام نہ لیگا جگہ جگہ سرسبز و شاداب آراستہ و پیراستہ باغ ملینگے، وسط شہر میں
حدیقہ ازبکیہ اور اطراف میں چمنہائے قناطر خیریۃ النباتات حیوانات اسماک معادی وغیرہ کا حصار
ہوگا۔ قدیم اور نو تعمیر مساجد جو بجائے خود عربی فن تعمیر کے غیر فانی نمونے ہیں وقفہ وقفہ سے آپ کی
آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کر رہی ہونگی۔ کہیں آپ جامع سلطان کے آگے محو نظارہ ہونگے تو کہیں جامع رفاعی،
جامع ابن طولون، جامع عمر بن العاص، آپ کو مبہوت اور ششدر کئے ہوئے ہونگے، اور کہیں جامع محمد علی،
جامع سیدنا حسین اور جامع ازہر، آپ کی حیرانی اور استعجاب کا موجب بنی ہوئی ہونگی، قدم قدم پر عربی
طرز تعمیر کی بے مثال یادگاریں بلند و بالا قصور و محلات جن کی پچہ کاری نقش و نگار اور بیل بوٹے آپ پر
سحر آفریں کیفیت پیدا کر رہے ہونگے، راستے آباد جن پر انسانوں کا میلا لگا ہوا اور ہر طرح کی آرام دہ
سواریوں کا ازدحام و ہجوم، اس تمام مادی شان و شوکت کا آپ کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی
اثر ہوگا کہ باعتبار دلکشی، خوب صورتی، جذابیت اور چہل پہل کے کوئی اور شہر آپ کی نظر میں نہ جچے۔ شہر کی
ان دلکشیوں سے کہیں بڑھ کر اہل شہر کی دلکشی ہوگی، دوہی طرح کے انسان آپ دیکھیں گے یا تو ہشاش و بشاش

خوش مزاج، سانولی رنگت، تنو مند مرد ہونگے اور یا گندمی رنگ مائل بہ سفیدی، معتدل قامت سرگیں چشم خوش طبع بذلہ سنج عورتیں ہونگی جو ادبی اور علمی مجلسوں، تقریر گاہوں، باغوں، درسگاہوں اور تھیٹروں میں مردوں کے دوش بدوش دکھائی دینگی، ان میں زیادہ تر تو بے نقاب ہونگی، اور اگر کسی کے نقاب ہوا بھی تو اس نے حسنِ خداداد کی شاندار نمایش کا انتظام کیا ہوگا نہ کہ اخفاء جمال کا۔ مصر کا قابل دید اشیاء میں دارالاثارالمصریہ اور دارالاثارالعربیہ آپ کے لئے دلچسپی اور عبرت کا ایک دفتر ثابت ہونگے، ایک اگر قدماء مصر کی عظمت فکری کی نمایندگی کر رہا ہوگا تو دوسرا اسلامی تمدن کے غیر فانی آثار کا شاہد۔ کتب خانہ خدیویہ آپ کی علمی اور ادبی دلچسپیوں کا آماجگاہ بنا ہوگا جہاں آپ عجوبۂ روزگار علمی ذخیرہ کو تجربہ کار سنجیدہ علم دوست اور واقف کار ہستیوں کی نگرانی میں تشنگان علم کی آبیاری کرتا پائینگے۔ یہاں آپ قدیم ترمصاحف اور انمول مخطوطات وکتب کا اتنا نایاب ذخیرہ پائینگے کہ جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی اور کتب خانہ میں مل سکے۔ مصر کی علمی اور ادبی مجلسوں اور سیاسی اور اجتماعی انجمنوں، دارالمطالعوں اور ہر ہر پیشہ و صنعت کی محفلوں کی کثرت و بہتات یقیناً آپ کی حیرانی اور استعجاب کا موجب ہوگی۔ جابجا جلسے ہوتے دکھائی دینگے، علمی، ادبی اور سیاسی مسائل پر دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہونگی مقررین میں جہاں مرد دکھائی دینگے وہیں عورتیں بھی۔ عباسیہ اور جنیزہ سے آپ کا گذر ہو تو ایک عجیب دلچسپ سماں آپ کے پیش نظر ہو جائیگا۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی صفیں آپ کو جنبش کرتے دکھائی دینگی۔ جذبۂ قومیت سے معمور، حب الوطنی میں سرشار، ملک کی عظمت و وقار کے نگہبان قومی آمال و رمانی کی پناہ گاہ یہ خوش رو تشکیل صحت وشباب اور جرات وہمت سے لبریز ہستیاں ایک ہی وضع قطع میں کامل وقار اور متانت کے ساتھ درسگاہوں، کھیل کود کے میدانوں، انجمنوں، کتب خانوں اور تفریح گاہوں کا قصد کرتے جب آپ دیکھیں گے تو یقین مانئے کہ اس سحر آفریں منظر نے کچھ ایسا گہرا نقش آپ کے دل کی گہرائیوں پر چھوڑا ہوگا کہ مٹیٹے نہ مٹ سکے۔ غرض زندگی کے جس شعبہ پر آپ کی نظریں پڑینگی حیات اجتماعی کے جس رُخ کا آپ جائزہ لینگے ایک عجیب جذابیت اور دلبستگی کی شان لئے ہوئے ہوگا، اور بے اختیار آپ کہہ اُٹھیں گے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می بینم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

از

جناب دیپک رائے صاحب سکسینہ حسینی علم

جگّا دھر نے باہر سے آکر رسوئی گھر کی طرف جاتے ہوئے کہا :-

"ماں، اننت رام پانڈے اور منشی لالہ دونوں گودھوری[1] کے بعد جانے والے ہیں۔ ہم لوگ بھی اُن کے ساتھ ہو جائیں گے۔ راستہ کٹ جائیگا! اس کے سوائے پانڈے جی راستہ میں تمھیں جگنا تھ جی کی کتھا سُنائیں گے!"

اندر سے ایک ادھیڑ عورت نے جواب دیا۔ "بہت ٹھیک ہے بیٹا!"

جگنا تھ جی کی جاترا، مقدس گنگا کا اشنان اور ساتھ ہی اننت رام پانڈے اور ان کی بیوی کا ساتھ جگا دھر کی ماں کے لئے انتہا سے زیادہ مسرت انگیز خبر تھی۔

وہ ہمیشہ سے اس بوڑھے برہمن کی لانبی ڈاڑھی، اور چندن سے منقش پیشانی کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اُس کے خیال میں اننت رام دیوتا تھے اور دیوتاؤں میں رہنے کے قابل لیکن نہ معلوم اتفاق سے یا گاؤں والوں کی پُر جوش عقیدت سے متاثر ہو کر وہ یہیں کے ہو رہے چنانچہ پندرہ سال پہلے جب جگا دھر ابھی بچہ تھا، اور بوڑھی ٹھکرائن کا شوہر گاؤں کا سب سے بارعب ٹھاکر سمجھا جاتا تھا۔ اننت رام اپنی آوارہ گردی ترک کر کے گاؤں کے تالاب کے قریب ہی ایک مندر میں ٹک گئے تھے اور اتنے سال بعد غریب گاؤں والوں کی آو بھگت، بھبوتوں اور چڑھاؤں نے اُنھیں دو چار مویشی، ایک سفالی مکان اور کچھ زمین کا مالک بنا دیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے بیل گاڑیاں میلا پور کی طرف نکلنے لگیں، جہاں دور دور تک جگنا تھ جی کی جاترا کا میلا لگنے والا تھا۔ میلا پور گنگا کے کنارے ایک خوب صورت گاؤں تھا۔ ہر سال یہاں بڑی دھوم دھام سے جاترا منائی جاتی جس کا انتظار اطراف واکناف کے گاؤں میں اور دُور دُور تک بھی بڑی شد و مد سے کیا جاتا خصوصاً

---

[1] شام میں مویشیوں کے لوٹنے کا وقت۔

بارہ مہینوں کی انتھک محنت اور امید و بیم کی کشمکش کے بعد جب ہنگام قابل اطمینان ہوتا تو گاؤں کے گاؤں بارش اور اناج کے دیوتا کی پوجن کے لئے جوق در جوق جمع ہونے لگتے۔

چھوٹی سی برہنہ پہاڑی کی چوٹی پر جس کے دامن سے نیم دائرہ کی شکل میں دریا بہتا تھا، ایک سنگ بستہ خوب صورت مندر کسی عہد قدیم کے فن تعمیر کا نمونہ سر اٹھائے کھڑا تھا جس کے سکھر[1] پہ سُرخ پرچم ہوا کے تیز و تند جھونکوں میں ناچتا رہتا۔

مویشی واپس ہو چکے تھے اور پیپل کے درختوں پر کووں نے شب بسری کی تیاری میں جگہ کے لئے لڑنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ جگا دھر نے تھان سے دو سفید بیلوں کی جوڑی کھول لی۔ نوجوان ٹھاکر کو ہمیشہ اپنے ان جانوروں پر فخر تھا۔ جب کبھی ان کی مضطرب حرکات۔ سُرخ سُرخ آنکھوں میں متحرک دیدے جن سے غصہ اور شرارت کا اظہار ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کی نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے تو وہ مسکرا دینے پر مجبور ہو جاتا۔ اکثر گاؤں کے فربہ اندام ساہوسے اس جوڑی کی قیمت کا اندازہ کرواتے یا حریص پٹواری سے اس کی داشت و پرداخت کے بارے میں مشورہ لینے میں اُسے خاص خوشی ہوتی تھی۔

لیکن اس موقع پر تقریباً ایک ہفتہ آگے سے وہ انھیں روزانہ اپنے ہاتھوں سے تالاب میں نہلایا کرتا اور اب ان کی بے داغ جلد ڈھلتی ہوئی دھوپ میں سنگ مرمر کی طرح سفید اور چمکدار معلوم ہو رہی تھی۔

آج وہ بے انتہا خوش تھا۔ اس کی شادی ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا۔ لیکن یہ اپنے گنے دن اس کی زندگی کو کس قدر بدل چکے تھے اور اس کے خیالات میں کتنی تبدیلی پیدا کر چکے تھے۔ اس کی نئی بیوی تینی اتنی خوب صورت تو نہ تھی، جتنی منشی لالہ کی سالی مرنالنی دیوی۔ لیکن اس کا مقابلہ اس کی نئی بیاہتا سے کیا؟ جگا دھر محسوس کرتا تھا کہ مغرور مرنالنی کے سامنے اس کی وقعت بھیڑ سے زیادہ نہ تھی اور نہ دوسرے گاؤں والے اس کی نظر میں کوئی شمار و قطار رکھتے تھے۔ اس نے یہ بھی سُنا تھا کہ مرنالنی تعلیم یافتہ بھی تھی چنانچہ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہندی اور اُردو دونوں میں خطوط لکھتی تھی۔ علاوہ ازیں ـــــ

تینی سے اس کی ماں کتنی خوش تھی، اور وہ خود بھی کس قدر مسرور تھا۔ اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا تھا کہ جاڑے کی راتوں میں آگ کے اطراف دیہاتیوں کے حلقہ میں یا گرما کی شاموں میں بان کی کھاٹوں پر

---

[1] مینار مندر۔

حقہ کی آہنگ دار آواز کے ساتھ گنواروں کی جو مجلسیں گرم ہوتیں اُن میں اب نوجوان چوکیدار بہت کم نظر آتا تھا۔

جگّا دھر ذات کا راٹھور راجپوت تھا۔ کہتے ہیں اُس کے آباو اجداد بڑی خاندانی نجابت کے نام لیوا تھے لیکن مغلیہ عہد میں کسی سیاسی انقلاب نے اُنھیں ترن پور میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، اور اُن کے بعد اُن کی اولاد نے اس چھوٹے سے پُرامن گانوں کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا، اور اب بھی ایک عرصہ سے انگریزی سرکار نے دیہات کی چوکیداری کی معزز خدمت پر اُن کو مقرر کر رکھا تھا چنانچہ اسی موروثی خدمت پر جگّا دھر اب بھی فائز تھا۔

باپ کے انتقال کے بعد ایک کمپنی کی ساخت کی بندوق۔ دو دیسی تلواریں جن کے میانوں پر وقتاً فوقتاً گانوں کے چمار نے پیوند لگائے تھے، اس کو ورثہ میں ملی تھیں، اس کے ساتھ غیر منقولہ ترکہ کی صورت میں تھوڑی سی زمین۔ دو باولیاں اور چند مویشی بھی اس کو ملے تھے۔ اور اب وہ اپنے آبائی مکان میں ماں اور نئی بیوی کے ساتھ زندگی کا بہترین عہد اطمینان اور چین سے گزار رہا تھا۔

شادی کے بعد جیسے ہی نینی نے اُس کے گھر میں قدم رکھا، وہ اُس کا ہو گیا۔ گو اُس نے تعلقے کے مدرسے میں اپر پرائمری تک ہی تعلیم پائی تھی، اور گانوں کے زمین داروں کو اخبار پڑھ کر سُنا سکتا تھا لیکن وہ نہ تو اتنا زیادہ پڑھا ہوا تھا، اور نہ اُس تعلیم یافتہ زمرہ میں سے تھا جس کے افراد بیوی میں کسی ناول کی ہیروئن کے حُسن یا کسی ستارۂ سینما کی دلکشیاں اور دلفریبیاں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

پھر وہ سادہ رُخ نوجوان دلھن کی شخصیت میں تیزی سے جذب ہونے لگا، اور اب اس کی ساری زندگی ایک ہی نینی کے اطراف مرکوز ہو چکی تھی۔ چنانچہ کھیت میں کٹائی کی نگرانی کرتے، اطراف کے قصبوں کے مختصر دوروں میں، تالاب میں مویشیوں کو نہلاتے۔ غرض ہر جگہ وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی کھوج میں رہتا۔

ادھر نینی ان تمام خوبیوں سے خاطر خواہ مزین تھی جو دیہاتی لڑکیوں کے روزانہ فرائض کے لئے ضروری ہیں۔ اُس کی نگرانی میں گائیں زیادہ دودھ دینے لگیں، وہ خود دودھ دُہتی اور ان کی دیکھ ریکھ بذاتہ کرتی! اس کے علاوہ نینی کے آنے کے بعد سے گھر کا صحن آئینہ کی طرح، اور پیتل برتن سونے کی طرح چمکنے لگتے تھے۔ مزید برآں وہ بوڑھی ساس کی خدمت میں ابتدا ہی سے پیش پیش رہنے لگی، اور یہی وہ چیز تھی جس نے جگّا دھر کی ماں کی نظروں میں وہ بات کھٹکنے نہ دی جو اور خاندانوں میں — خواہ وہ سادہ مزاج دیہاتی ہی کیوں نہ ہوں — بڑی بڑی مصیبتوں۔ پھوٹ اور نفاق کی محرک ہوتی ہے یعنی یہ کہ اس کا

بیٹا اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔

۲

رات بھر چاندنی میں چلتے ہوئے وہ صبح صبح میلاپور کے قریب پہنچ گئے۔

آگے پیچھے تین بیل گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ایک میں جو سب کے آگے تھی منشی لالہ، ان کی بیوی، اور دو بچے سوار تھے۔ وہ کائستھ تھے اور گاؤں کے واحد تعلیم یافتہ شخص ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کی بہلی کی دونوں جانب دو بدرنگ ریشمی پردے، جو شاید کسی دیہاتی مقطع کے شملے کی باقیات تھے، لٹکتے تھے۔ لیکن پہلی منزل پر ہی جگا دھر نے دیکھ لیا تھا کہ اُن کی مغرور سالی مرنالنی موجود نہ تھی — اس نے ایک بار کسی موقع پر منشی جی کی بیوی کو یہ کہتے سُنا تھا کہ مرنالنی کو میلے ٹھیلے سے ہمیشہ نفرت تھی۔

دوسری میں اننت رام پانڈے، ان کی بیوی اور جگا دھر کی ماں سوار تھیں اور راستہ بھر ٹھاکر کے کانوں میں اُن تینوں کے مسلسل باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ بوڑھے برہمن کے یہاں مذہبی کہانیوں کا زبردست ذخیرہ تھا، اور شاید وہ اس کی زندگی کی طرح لمبی اور دلچسپ تھیں۔

سب سے آخر میں جگا دھر کی گاڑی تھی جس میں پیال پر اندر کی طرف نینی رات کے بیشتر حصہ میں پڑی سوتی رہی، اور نیم خوابی کی حالت میں ٹھاکر، شریر بیلوں کی رسّی تھامے اگلے تختہ پر بیٹھا رہا۔

صبح ہو رہی تھی اور میلاپور کی پہاڑی پر سفید مندر، نیلے آسمان کے مقابل میں ابر کے ٹکڑے کی طرح دھندلا، اور موہوم نظر آ رہا تھا۔ سب سے پہلے اننت رام پانڈے نے اس کو دیکھا۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور بلند آواز میں کچھ اشلوک دہرانے شروع کئے۔ جگا دھر کی ماں نے بھی اس کی تقلید کی، لیکن وہ کوئی اشلوک تو پڑھ نہ سکی، البتہ اُس نے اپنے اکلوتے لڑکے کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگ لینے پر اکتفا کیا۔

جگا دھر خاموشی سے بیل ہانکتا رہا۔ دو ایک بار اُس نے اُدھر نظریں اُٹھائیں جدھر میلاپور کے مندر کی اونچی سِکھر دھندلی نظر آتی تھی۔ پھر اُس نے بے اختیار ہی پلٹ کر گاڑی کے اندر نظر ڈالی۔

جگا دھر نے کہا "نینی میلے میں کیا لیگی؟"

نینی نے سر نیچا کر کے جواب دیا "کچھ نہیں مہاراج لونگی کیا؟ ہمارے گھر میں ایشور کا دیا سب کچھ ہے!"

ٹھاکر بولا "پھر بھی جاترا سے خالی ہاتھ تو نہ جانا چاہیئے۔"

نینی خاموش ہو رہی۔

گاڑی چلتی رہی اور سورج کی ابتدائی کرنوں میں میلا پور کا مندر اور میلے کا شور اب زیادہ صاف دکھائی اور سنائی دینے لگا۔

بڑی دیر کے بعد جگا دھر نے پھر پوچھا۔ "کہتی نہیں ؟"

ننّی نے کہا۔ "مہاراج مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہے، البتہ اگر آپ مرنالنی دیوی کے سے ـــ"
اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ٹھاکر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ہاں ہاں کیا ؟"

"ویسے بندے ـ جڑا دی ہرے نگینوں والے"

نوجوان چوکیدار سن ہو کر رہ گیا۔ مرنالنی دیوی کے بندے اف ! وہ تو بہت قیمتی تھے۔ اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ گذشتہ میلے میں منشی جی کی بیوی نے انھیں خریدا تھا۔ اور منشی لالہ اسی زیور کی خوب صورتی اور بڑھی ہوئی قیمت کا ذکر سال تمام اپنے شاگردوں سے، پٹواری سے، چوکیدار سے غرض ہر شناسا سے کرتے رہے تھے۔ ان کا گھر پنگھٹ کے قریب تھا، اس لئے گانوں کی لڑکیاں شام کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں مرنالنی کے کانوں میں دمکتے ہوئے بندوں کو حیرت اور تعریف کی نظروں سے دیکھتیں۔ ان میں چپکے چپکے کچھ اشارے اور سرگوشیاں ہوتیں، پھر ہر ایک اپنا پانی سے بھرا ہوا برتن ایک دوسرے کی مدد سے اٹھاتی اور اپنی قسمت پر شاکر ایک آہ سرد کے ساتھ پنگھٹ سے رخصت ہو جاتی۔

ٹھاکر سوچنے لگا۔ لگ بھگ پچاس روپیے ـــ اس کی زمین کا ایک سال کا محاصل !۔

اُس نے دبی آواز میں کہا۔ "ننّی ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے لئے اتنے قیمتی ـــ؟"

ننّی اسی طرح سر نیچا کئے بولی۔ "اور منشی جی کونسے امیر آدمی ہیں۔ کل ہی تو بھونڈا مل کے پاس پچیس روپیوں کے اُدھار کے لئے پگون پر گرے جا رہے تھے۔"

اس کے بعد ٹھاکر اور کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ راستہ بھر سوچنے لگا میلے میں شہر کے جوہریوں کی دوکانیں ضرور لگتی تھیں۔ اور ویسے ہی بندوں کا ملجانا بھی مشکل نہ تھا لیکن سوال تھا تو ـــ روپیہ کا۔ اُس کے پاس صرف اکیس روپیے نقد تھے، باقی وہ کہاں سے لائیگا ؟ لیکن ننّی کی یہ فرمائش ـــ انکار کرنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔

وہ گانوں کے قریب آ گئے تھے اور چڑھتی ہوئی دھوپ تماشے کے شیدائی دیہاتیوں کے جوش میں

کوئی کمی نہ کر سکتی تھی۔ ایک طرف ڈھول، دف اور منجیروں کی آوازیں قیامت کا سماں پیدا کر رہی تھیں اور دوسری طرف گنوار گاہکوں اور ہشیار شہری تاجروں کے درمیان ایک شور دار وگیر برپا تھا۔

کپڑوں کے عارضی سائبانوں اور چھپروں کے ناکافی سایہ میں ہر قسم کی سستی اور نظر فریب اشیا، مہیا تھیں۔ رنگ برنگ کی مٹھائیاں۔ غیر خالص اجزا کی بنی ہوئی گرد اور مکھیوں کی کثرت سے بدرونق ہوئی جارہی تھیں لیکن دیہاتی بچوں کی نظروں میں وہ بڑی نعمت معلوم ہوتیں۔ وہ انھیں للچائی نظروں سے دیکھتے اور اپنے ماں باپ کا دامن پکڑ کر ان دوکانوں کی طرف بزور کھینچے لئے جاتے۔

مٹی کے کھلونے جن میں کہیں کہیں بدیسی صنعت کی شکل بھی نظر آجاتی، مگر سادگی پسند دیہاتی ان کو نہ پوچھتے۔ وہ اُن کے گنوار بچوں کے کس کام کے تھے!۔

ان کے علاوہ مختلف قسم کی اشیاء جن سے دیہاتی زندگی کی ضروریات رفع ہوسکتی ہیں۔ سستا کمدر۔ ہلکے بھڑک دار رنگ کے کپڑے۔ پیتلی برتن۔ غرض کیا کیا۔ قریب قریب لگی ہوئی دوکانوں میں جمع کی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی قربت اور تماشائیوں کی کثرت سے راستہ چلنا دشوار تھا۔ اس پر بھی دیہاتی اپنی بڑی بڑی وزنی گاڑیاں اس بھیڑ میں گھسائے لئے جارہے تھے۔

ایک برگد کے درخت کے تلے منشی لالہ نے اپنی بہلی کھڑی کردی اور اُتر کر انگرکھا جھاڑنے لگے۔ اننت رام پانڈے کی گاڑی بھی ان کے پیچھے ہی رُک گئی، اور ساتھ ہی جگا دھرنے بھی اپنے بیل کھڑے کردیئے۔

دوسرے روز تک یہی برگد کا سایہ دار درخت، رات کی اوس اور دن کی دھوپ میں ان کا محافظ بننے والا تھا۔

— ۳ —

ایسے میلوں اور جاتراؤں میں بہ نسبت دن کے رات کو مصروفیتیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ رات میں مذہبی رسمیں بھی ادا ہونے والی تھیں اور یہی وجہ ہوئی کہ چاندنی میں میلے کا منظر دریا کے اُس پار رہنے والوں کو بھوتوں کا ایک شہر نظر آتا تھا۔ یہ وقت تھا جب خرید و فروخت کی گرم بازاری شروع ہوتی۔ دیہاتی اپنے پورے خاندان کی قوت کے ساتھ دوکانوں پر حملہ آور ہوتے۔ ہر شئے کے خریدنے سے پہلے دس بار اُن کا امتحان کیا جاتا۔ آپس میں دیر تک صلاح و مشورہ ہوتا، اس پر بھی ہر قدم پر دھوکہ اور فریب کا خوف پیچھا نہ چھوڑتا۔

ادھر ہوشیار بیوپاری نہایت اطمینان کے ساتھ بیک وقت دس گاہکوں کی نہایت خوبی سے تشفی کرتے ایک جوہری کی دوکان کے آگے سُہرن پور کا قافلہ نمودار ہوا۔ انھیں آتا دیکھ کر فربہ اندام جوہری چوکس ہوکر بیٹھ گیا جیسے مکڑی دُور سے آتے ہوئے شکار کو دیکھ کر اپنے پیروں کو سمیٹ جھولنے لگتی ہے۔ انھوں نے دیکھا دگیسی لیمپوں کی تیز روشنی میں بند شیشہ کے کیسوں میں رکھی ہوئی چمکدار سفید و زرد اشیاء۔ زیور اور رنگ برنگ کے پتھر آنکھوں کو چوندھیا رہے تھے۔

اننت رام۔ ان کی بیوی اور ٹھاکر کی ماں پیچھے رہ گئے۔ صرف ٹھاکر آگے تھا، اور اُس کے عقب میں منشی لالہ، ان کی بیوی اور نینی ایک جانب کو خاموش کھڑے ہو گئے۔

زیور پسند کرنے بڑی دیر لگی، اس لئے کہ مشورہ ضروری تھا بعض بہت قیمتی تھے بعض بہت ہلکے۔ یا کسی کی بناوٹ اچھی نہ تھی۔ اور بعض مرنالنی دیوی کے بندوں سے قریبی مشابہت نہ رکھتے تھے۔ غرض کئی بار کی اُلٹ پھیرا اور صلاح کے بعد جس میں منشی لالہ اور ان کی بیوی نے ماہرانہ حصہ لیا، ایک بُندوں کی جوڑ پسند کی گئی۔ باریک سونے کی جال میں دو سبز پتھر بڑی خوب صورتی سے بٹھائے گئے تھے۔

اب قیمت کے تصفیہ کا مرحلہ باقی تھا۔ جوہری نے قسم کھا کر کہا ان کی اصلی قیمت ساٹھ [60] روپیے سے زیادہ ہی تھی۔ لیکن وہ اُنھیں غیر معمولی رعایت پر دینے کے لئے تیار تھا یعنے صرف ترپن [53] روپیے میں ـــ لیکن یہ چیز ٹھاکر کی سمجھ میں نہ آئی کہ بڈھا بیوپاری جس کو اُس نے اس سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا اس قدر رعایت اُن کے ساتھ کیوں کر رہا تھا ـــ نینی نے دل میں خیال کیا "جوہری کیسا نیک آدمی ہے"۔

اب روپیہ کا حساب شروع ہوا۔ ٹھاکر نے اپنی ہمیانی سے اکیس [21] روپیے نکالے اور بقیہ کی تکمیل اننت رام پانڈے نے کردی اور اس طرح یہ منزل بھی ختم ہوگئی۔

بُندے خریدے گئے، لیکن مقدس برہمن نے آیندہ قسط اور سُود کا ذکر ٹھاکر سے کردینا مناسب سمجھا۔

ـــ ۴ ـــ

اس واقعہ کو کئی سال ہو گئے۔

اب سُہرن پور میں وہ خوشگوار فضا باقی نہ رہی تھی۔ گانوں کے تقریباً سارے تنومند اور قابل کار جوان انگریزی سرکار کے لئے لڑائی پر سمندر پار ولائت بھیج دیئے گئے تھے، اور ہر طرف ایک حسرت آمیز سکوت طاری تھا۔

اب میلا پور کی جاترا کے لئے ہفتہ بھر پیشتر سے وہ چہل پہل، وہ تیاریاں نہ تھیں۔ منشی لالہ کا انتقال

ہو چکا تھا، اور ان کی خوب صورت سالی مرنالنی کسی مقام نامعلوم کو چلی گئی تھی۔ اننت رام کی بینائی میں کچھ فتور آنے لگا تھا، اور چند مہینوں سے وہ بالکل نہ دیکھ سکتے تھے۔ نوجوان ٹھاکر جگادھر بھی نئی بھرتی میں شریک کرلیا گیا تھا۔ اور نہ معلوم اب وہ کہاں۔ کس جگہ اور کس حالت میں ہر لحظہ موت اور جان کے ڈر میں گھرا ہوا تھا ـــــ یا اس کا بھی کیا یقین تھا کہ وہ اس دنیا میں موجود بھی تھا۔

اُس کے جانے کے بعد بمبئی سے جہاز میں سوار ہوتے وقت ایک بار اور ولائت کے کسی دُور و دراز مقام سے دوسری مرتبہ دو خط گھر آئے تھے۔ منشی جی اس وقت زندہ تھے اور اُن سے ہی یہ خط پڑھوائے گئے تھے۔

لیکن اس کے بعد چار سال ہوئے اب تک کوئی خبر نوجوان ٹھاکر کی یا گانوں کے کسی آدمی کی اُن کے رشتہ داروں کو معلوم نہ ہوئی تھی۔ ٹھاکر کے جانے کے ایک سال بعد ہی صوبہ میں مہلک وبا کا پھیرا ہوا تھا جس کی آگ میں ہزاروں مویشی تباہ ہوگئے۔ گانوں میں گلے کے گلے صاف ہوگئے اور کچھ عرصہ سے ہوا میں پرندوں اور خشکی پر انسانوں کے سوا دوسرے حیوان شاذ و نادر ہی نظر آنے لگے تھے۔ اسی آگ میں ٹھاکر کی مایۂ ناز جوڑی کا ایک بیل اور تقریباً سارے مویشی ختم ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی مصیبت اور افلاس کے ایام شروع ہوئے۔ جگادھر کے جانے کے بعد زراعت کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ اس لئے زمین ایک عرصہ سے پڑا ؤ تھی، اس کا محصول بڑھتا گیا، اور اس باقی میں چوکیدار کی بیشتر جائداد اور بہت سی زمین ہراج کردی گئی۔ اننت رام پانڈے کا قرض مطلق ادا نہ ہوا تھا، اور اس کے لئے انھوں نے سخت تقاضا شروع کردیا۔ ادھر چار مہینوں سے جگادھر کی ماں بیمار تھی اور وہ برہمن کا روپیہ رکھ کر مرنا نہ چاہتی تھی۔ طے ہوا کہ اس قرض کے لئے تینی کا رہا سہا زیور فروخت کردیا جائے۔ لیکن تینی سب کچھ تو دینے تیار تھی، مگر دُنیا کی کوئی قوت اُسے ان بندوں سے جُدا ہونے راضی نہ کرسکتی تھی۔

چنانچہ ہوا بھی یہی۔ سوائے ان بندوں کے اس کا سارا گہنا تیس[۳۰] روپیے اصل اور چھیانو[۹۶] روپیہ سُود کی نذر ہوگیا۔

آہ! یہ اُن بندوں کی اصلی قیمت تھی۔ تینی نے سوچا کیا "وہ جوہری اور اننت رام ـــــ"

اس طرح اُس مقدس برہمن کا قرض پھُولوں میں ادا کردیا گیا جس کے کچھ عرصہ بعد ہی بڈھی ٹھکرائن ہمیشہ کے لئے اس مقام کو چلی گئی جہاں کوئی کسی پر احسان نہیں کرتا، اور نہ کسی کو امداد کی ضرورت ہی

ہوتی ہے۔

اب ننھی دُنیا میں اکیلی تھی اور تنہا ہی اسے دُنیا کی سختیوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے قریب کوئی سہارا نہ تھا لیکن صرف ایک خیال اُسے راہ حیات پر کھینچے لئے جا رہا تھا، یعنے ٹھاکر کی واپسی۔

وہ اب گھر کی مالکہ ٹھکرائن نہ رہی تھی، بلکہ ضروریات زندگی کے لئے اُسے مجبوراً مکان کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑا تھا۔ وہ ایک زمین دار کے یہاں کچھ قلیل مشاہرہ پر کام کرنے لگی گھر والے گو شریف تھے اور اس کی مالکہ ننھی کی گذشتہ حالت کا خیال کر کے مہربانی سے پیش آتی، لیکن اس سے کیا، ملازمت آخر ملازمت ہی تھی۔ اور کام بھی بہت کرنا پڑتا تھا۔

کچھ، ہو آنے والی امید کے تصور میں وہ انتہا استقلال سے اپنے دن گزارنے لگی۔ دن بھر وہ زمین دار کے گھر کام کرتی اور رات میں اپنے مکان کے نیم روشن کمرے میں جو، اب بھی اس کے قبضہ میں تھا سوت نکالا کرتی۔ لیکن اس پر بھی مہینے میں کئی بار فاقے ہو جاتے۔ علاوہ لباس کے اور دوسری ضروریات کے لئے وہ دن بدن تنگ ہوتی جا رہی تھی۔

تاہم اس افلاس اور مصیبت کے زمانہ میں بھی وہ ان بُندوں کو بیچنے پر تیار نہ ہوئی۔ اس کے پاس یہ زیور اس زندگی کی عزیز ترین یادگار، اور اس محبت کی لاقیمت سوغات تھا جس کی یاد اُس کے قلب میں اب بھی شعلے بھڑکاتی تھی۔ اور وہ ان بُندوں کو اُس مبارک موقع کے لئے اٹھا رکھنا چاہتی تھی جب اُس کا شوہر اپنی لمبی غیر حاضری کے بعد ـــــ

کئی بار مصائب سے تنگ آکر وہ ساہوکار کے دروازے تک ان بُندوں کو لیگئی۔ لیکن وہ کبھی گھر کے اندر نہ جا سکی اور ہر مرتبہ خاموش، مصیبت برداشت کرنے کے لئے اُسے اپنے مکان واپس ہونا پڑا۔

لیکن حیرت تو یہ تھی کہ گانوں کی کسی عورت نے جگا دھر کے جانے کے بعد سے ننھی کے کانوں میں وہ بُندے نہ دیکھے تھے۔ اور گانوں کے ساہوکار کو تعجب تھا کہ اور تمام زیور کے ساتھ وہ بُندے کیوں اُس کے یہاں نہیں آئے تھے؟۔

شوہر کو گئے تقریباً چار سال ہو گئے تھے اور ننھی اس کرب۔ افلاس میں بھی اُسی استقلال سے اپنے دن کاٹ رہی تھی۔ مگر اب بھی اُس کے مکان میں چند پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں وہ بُندے لپیٹے رکھے تھے، اور اب بھی ایک مصائب سے لوٹے ہوئے قلب میں امید ـــ آنے والی امید کی کرن موجود تھی۔

ایک دن بوڑھے نارائن نے کھیت کو جاتے جاتے رُک کر نینی سے کہا:۔

"ٹھکرائن! کل شیورام آرہا ہے، چار روز ہوئے خبر آئی تھی کہ انگریز سرکار کی جیت ہوگئی ہے!"

جیسے کسی نے خواب سے نینی کو جگا دیا۔ شیورام آرہا ہے تو جگا دھر بھی ضرور آتا ہی ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی روز ادھر سے وہ یہ بات سُن رہی تھی کہ گانوں کے وہ تمام آدمی جو انگریز سرکار کی نوکری میں ولائت گئے تھے جلد ہی اپنے وطن واپس کر دیئے جائیں گے اس لئے کہ لڑائی ختم ہوچکی تھی اور انگریزوں نے جرمن والوں کا مُلک چھین لیا تھا۔

اس رات وہ زمین دار کے گھر سے بہت جلد ہی رخصت ہوگئی! اس کا قلب آج بہت تیز تیز حرکت کر رہا تھا۔ کل اُس کا شوہر آئیگا۔ مصیبت کے یہ نہ کٹنے والے دن ختم ہوجائیں گے۔ وہ ان بے رحم ساہوکاروں سے بآسانی اپنی جائداد اگلوا لیگا۔ اور پھر ——

—— آہ! غریب لڑکی

گذشتہ چار پانچ سال کے واقعات نہایت تیز رفتاری سے اُس کی نظروں کے آگے سے گزرنے لگے۔ اُس کا قلب آج بُری طرح مضطرب و پریشان تھا۔ گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ البتہ چاند کی پھیکی کرنیں آنگن میں اپنی ملگجی چادر پھیلا رہی تھی۔

دفعتاً وہ اُٹھی اور پھٹے پُرانے کپڑوں کی گرہ سے اُن بُندوں کو نکال لائی، جو ایک عرصہ دراز سے ان میں لپیٹے پڑے تھے۔ وہ انھیں ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ کل وہ اُن کو پہن کر اپنے پیارے ٹھاکر کا استقبال کریگی۔ اُس نے ان بُندوں کو اپنے کانوں میں پہن لیا! ایک عرصہ بعد وہ بوجھ سے محسوس ہو رہے تھے۔ نہ معلوم وہ کیسی نظر آرہی تھی؟۔

طاق سے ایک چھوٹے سے آئینہ کے ٹکڑے کو نکال کر وہ کمرے میں چلی گئی، اور دئے کی مدھم روشنی میں اُس نے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا —— اف! وہ کتنی ڈراونی صورت تھی! اس میں شک نہیں کہ کئی سال بعد اُسے اپنی شکل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لئے بدنصیب عورت اس میں وہ تبدیلیاں نہ دیکھ سکی تھی جو مصیبت اور افلاس کا لازمی نتیجہ ہیں —— پھر بھی اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ اتنے قلیل عرصہ میں وہ اتنی بدل جائیگی۔ وہ کانپ گئی —— کیا حقیقت میں وہ وہی نینی تھی، یا آئینہ کے پیچھے سے کوئی اور غم نصیب اس کی طرف گھور رہا تھا۔

— ۵ —

دوسرے دن صبح سے ہی گانوں میں آنے والوں کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مائیں اپنی اولاد کو صحیح و سلامت دیکھنے کے لئے بے چین تھیں۔ بیویاں اپنے بچھڑے ہوئے شوہروں کو دوبارہ پانے کے لئے مضطرب، اور اقرباء اپنے عزیزوں کی دید کے مشتاق تھے، لیکن اللہ ہی بتا سکتا تھا کہ ان میں کتنے ایسے تھے جن کی امیدوں پر ہمیشہ کے لئے پانی پھرنے والا تھا۔ کتنے ایسے تھے جن کی خوشیاں آہ و بکا میں تبدیل ہونے والی تھیں، اور کتنے ایسے تھے جن کی مشتاق آنکھیں اپنے عزیزوں کو معذور اور اپاہج دیکھنے والی تھیں۔ آخر وہ وقت آگیا۔ ایک بڑی سرکاری موٹر لاری گانوں کی سڑک پر رُکی اور جنگ کے دیوتا کی قربان گاہ سے بچے ہوئے۔ بیمار۔ معذور۔ اپاہج، اور شاذ و نادر صحیح و سالم انسانوں نے ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے وطن اور رشتہ داروں کو دیکھا، اور اس کے ساتھ ہی ایک شور و غوغا شروع ہوا۔ جنھوں نے اپنے رشتہ داروں کو پایا وہ اُن سے لپٹنے لگے، اور جنھیں وہ نظر نہ آئے وہ آنے والوں سے اپنوں کے متعلق پے در پے سوالات کرنے لگے۔ لڑکوں نے اپنی حسرت نصیب ماؤں کو گھیر لیا، وہ بچے جو اپنے باپ کے بچھڑتے وقت ابھی گودی میں تھے ــــ اور جنھوں نے ہوش میں آنکھے بعد سے اب تک اُن کو نہ دیکھا تھا، ہر آنے جانے والے کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے لیکن شاید ان معصوموں کو بھی اپنے عزیزوں کی قسمت کا علم تھا۔ اس لئے کہ کبھی کبھی ایک آدھ آنسو ان کی آنکھ سے ٹپک جاتا۔

نبنی نے بھی ڈھونڈنے پر آنے والوں میں ٹھاکر کو نہ پایا۔ آہ! کیا وہ ہمیشہ کے لئے نہیں آئیگا! کیا اتنے زمانہ تک انتظار کرنے کے بعد، اتنے عرصہ تک مصائب اور غربت کی سختیاں برداشت کرنے کے بعد اس کی امید اس طرح ختم ہونے والی تھی!

شیورام اپنے بچوں کو گود میں اُٹھائے جا رہا تھا، اور اُس کے پیچھے اس کی ماں اور بیوی ان اہم واقعات کو جو اس کے غیاب میں رونما ہوئے تھے بیک آواز سُنا رہی تھیں۔ نبنی نے اُسے روک کر پوچھا:

"بھیا ــ ٹھاکر؟"

شیورام پیشانی کو ٹھونکتے ہوئے کہا ــ "ٹھکرائن! چوکیدار ہمارے ساتھ ہی رجمنٹ میں تھے لیکن تین سال ہوئے ــــ" وہ خاموش رہ گیا ــ اور سچ پوچھئے تو اس سے زیادہ وضاحت کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔

تینی کی آنکھوں میں اب تمام دُنیا اندھیری دکھائی دینے لگی۔ وہ اُسی جگہ کھڑی ہوگئی، اور اس کا جسم پتھر کے مجسمہ کی طرح غیر متحرک اور سرد ہوگیا! اُس کے کانوں میں عجیب عجیب قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔

تینی کے اطراف ایک شورِ قیامت برپا تھا۔ مائیں جو ایک زمانہ قبل ہی اپنی نوجوان اولاد کو کھو چکی تھیں لیکن جنھیں اس دل شکن سانحہ کا اب پتہ چلا تھا سر پر خاک اڑا رہی تھیں۔ بیویاں جن کو اپنے رنڈاپے کی ابھی ابھی خبر ہوئی تھی، دل خراش آہ و بکا کر رہی تھیں اور ان سب کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معصوموں کی چیخ پکار ناقابل برداشت سماں پیش کر رہی تھی۔

تینی رو نہ سکی! اس کو اپنے اطراف کا ہوش نہ تھا، نہ اس کو اس محشرستان کے واقعات کی خبر تھی! اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں میں، جو اب بھی خوب صورت تھیں ایک آنسو نہ تھا، نہ اس کے چہرے سے کسی غیر معمولی رنج و غم کا اظہار ہوتا تھا۔ قسمت کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اُس نے غریب عورت کے عالم احساس کو بالکل معطل کر دیا تھا۔

۶

بچھڑوں کو آئے تین چار روز ہو گئے تھے لیکن جو لوگ ہمیشہ کے لیے بچھڑ چکے تھے اُن کے لئے گانوں میں ابھی کہرام ہو رہا تھا جن خوش قسمتوں نے اپنے عزیزوں کو صحیح و سلامت یا کم از کم زندہ پالیا تھا وہ بھی گھر کی چار دیواری میں خوشیاں منا رہے تھے لیکن باہر وہ دوسرے بدقسمتوں کے سوگ میں پوری طرح شریک تھے۔

گانوں تمام اتنا مصروف تھا کہ دو روز سے کسی نے تینی کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کیا۔ صرف ایک بار زمین دار کی بیوی نے ٹھکرائن کی غیر حاضری کی شکایت کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا،

"نہ معلوم تینی کدھر چلی گئی۔ ٹلّو دیکھئے آیا گھر میں نہیں ہے!"

زمین دار نے کہا "بچاری دکھ میں ہے، نہ معلوم کہاں پڑی ہے!"

تیسرے دن صبح گانوں کے مچھلیارے نے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرنوں میں تالاب کے کنارے جہاں کائی اور گھانس کی کثرت تھی کسی شئے کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ پانی کی بیتاب موجوں میں کبھی وہ نظروں سے اوجھل ہوتی اور کبھی سُورج کی شعاعیں اس پر سے منعکس ہو کر آنکھوں کو چوندھیا دیتیں۔

محض رفع شک کے لئے اُس نے قریب جا کر دیکھا — سیاہ الجھے ہوئے بالوں میں وہ چمکدار طلائی زیور سطح آب پر تیر رہے تھے اور تینی ٹھکرائن کا پھُولا ہوا جسم پانی کے اندر سے گھانس میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ ٹلّو چارہ لئے ہوئے جا رہا تھا، مچھلیارے نے پکار کر اُسے مدد کے لئے بلا لیا، اور دونوں نے کشتۂ انتظار تینی کے مردہ جسم کو باہر کھینچ نکالا۔

تھوڑے ہی عرصہ میں گاؤں کے لوگ تالاب کے کنارے جمع ہو گئے۔ اس نئے حادثہ نے ہر ایک کو اپنا رنج اپنی خوشی اور اپنا غم بھلا دیا تھا۔ وہ سب بدقسمت عورت کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ غریب ٹھکرائن جس کی بھیگی ہوئی سیاہ زلفوں میں وہ خوب صورت بندے الجھے ہوئے تھے ـــــ اور اس کی پھولی ہوئی بدرونق آنکھیں گویا وسیع آسمانوں میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

عورتیں بچشم نم سرگوشیاں کرنے لگیں کئی سال بعد انھوں نے آج نیتی کے کان میں وہ دلفریب بندے دیکھے تھے۔

غزل

از

کاوشؔ

(۲۹ امرداد ۱۳۴۸ف کو لاسلکی حیدرآباد سے نشر کی گئی)

یہی نہیں کہ سوئے بزم دوست جا نہ سکا
میں آستانۂ دل پر بھی سر جھکا نہ سکا

فلک، ضمیر محبت کو آزما نہ سکا
وہ میری خاک نشینی کا راز پا نہ سکا

غم حیات سے فرصت ملی نہ دم بھر بھی
میں دردِ دل کو سکوں آفریں بنا نہ سکا

وہ میرے گوشۂ دل میں ہوا ہے جلوہ فروز
جو حسن، وسعت کونین میں سما نہ سکا

چمن کے ناز اٹھائے، صبا کے ظلم سہے!
میں بجلیوں سے نشیمن مگر بچا نہ سکا

وہ اُن کے جلوہ کی انگڑائیاں ارے توبہ!
کچھ ایسی مئے تھی جسے پی کے ہوش آ نہ سکا

پہنچ گئی مرے دامن کی آگ رگ رگ میں
ہزار گرچہ بجھائی مگر بجھا نہ سکا

کسی کے آتے ہی آنکھوں میں آگئے آنسو
میں انتہائے خوشی میں بھی مسکرا نہ سکا

وہ پوچھتے ہی رہے داستانِ غم کاوشؔ
میں اُن کو اپنا فسانہ مگر سنا نہ سکا

دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور

عہد نبوی کی ایک اہم دستاویز

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

متمدن اقوام ہی نہیں، وحشی باشندوں میں بھی حکمرانی اور عدل گستری کے لئے معینہ قاعدے ہوتے ہیں اور خود رائے سے خود رائے سردار بھی اپنے آپ کو اُن کا پابند پاتا ہے[۱]۔ عموماً جب کبھی ایسے قواعد تحریری صورت میں مرتب ہوئے تو انھیں کتاب کا نام دیا گیا۔ (Bible) اور (Scripture) کے معنے بھی کتاب کے ہیں۔ چنگیز خاں کے "یاسہ[۲]" کے معنے بھی کتاب کے ہیں۔ چنانچہ جدید ترکی میں بھی یازمک کا مصدر لکھنے کے معنوں میں ہی برتا جاتا ہے۔ اور "کتاب اللہ" مسلمانوں کے قرآن کا نام ہے۔

غرض عام قواعد و قوانین ملک کم و بیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا، اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے مجھے عہد نبویؐ سے پہلے نہیں مل سکی۔ بے شبہ منوسمرتی (سنہ ۵۰۰ ق م) میں راجہ کے فرائض کا بھی ذکر ہے اور کوتلیا کی ارتھ شاستر (سنہ ۳۰۰ ق م) اور اس کے ہمعصر ارسطو کی کتابوں میں سیاسیات پر مستقل تالیفیں بھی ملتی ہیں۔ ارسطو نے تو اپنی ہمعصر شہری مملکتوں میں سے بشمول ہندوستان[۴] (۱۵۸)[۵] کے دستور بھی لکھے تھے جن میں سے صرف شہر ایتھنز کا دستور ابھی پچاس سال قبل مصر میں پاپیروس پر محفوظ مل چکا ہے اور سنہ ۱۸۹۱ء میں شائع ہو چکا ہے اور انگریزی اور دیگر زبانوں میں

۱۔ Grammer of Politics by H. J. Laski

۲۔ مسالک ابن فضل اللہ العمری، مخطوطہ پاریس۔

Aristotle on the Athenian Constitution by Kenyon Preface

۵۔ ایضاً Encyclopaedia of Social Sciences, Vol I p 27. نیز P XIII

ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب یا تو درسی اور مشورتی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہیں یا کسی مقام کے دستور کا تاریخی تذکرہ ہیں کسی مقتدر اعلیٰ کی طرف سے نافذ کردہ مستند دستور مملکت کی حیثیت ان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

سنہ ۱ھ میں مدینہ منورہ میں ہجرت کر آنے کے پہلے ہی سال رسول کریم صلعم نے ایک نوشتہ مرتب فرمایا جس میں حکمران کے حقوق و فرائض اور دیگر فوری ضروریات کا تفصیلی ذکر ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دستاویز پوری کی پوری اور بلفظہٖ ابن اسحاق اور ابو عبیدہ نے اپنی کتابوں میں محفوظ کی ہے اور آج اسی کا کچھ بیان مقصود ہے۔

اس دستاویز میں ترپن جملے[۱] یا قانونی الفاظ میں دفعات ہیں اور اس زمانے کی قانونی عبارت اور دستاویز نویسی کا وہ ایک انمول نمونہ ہیں۔ اس کی اہمیت اسلامی مورخوں سے کہیں زیادہ یورپی علماء نے محسوس کی۔ ولہاؤزن، میولر، گریم، اشپرنگر، وینسنک، کائتانی، بوہل وغیرہ کے علاوہ ایک انگریزی مورخ نے مختصر تاریخ عالم لکھتے ہوئے بھی اس دستاویز کا تفصیلی ذکر کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ یہاں ان جرمن، ولندیزی، اطالوی، انگریزی اور دیگر مولفوں کے بیانات کا ذکر غیر ضروری ہے۔ میں صرف اپنے ناچیز خیالات اس کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور اُس کی اہمیت کی طرف اہل ملک کی توجہ منعطف کراتا ہوں اس دستاویز کی تفصیلی شرح اور مغربی مولفوں کے بیانات کی تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے جو اس لکچر میں ممکن نہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ اس دستاویز کے مندرجات پر کچھ عرض کیا جائے اس کا تاریخی پس منظر اور ان حالات کا ذکر ضروری ہے جن میں وہ مرتب اور نافذ ہوئی۔

رسول کریم صلعم نے جب مکہ معظمہ میں اپنے تبلیغی اور اصلاحی کام کا آغاز کیا، اور صدیوں، نسلوں کے معتقدات و رواجات کی تبدیلی چاہی تو اہل ملک نے ابتداءً حیرت اور پھر نفرت اور آخر کار مخالفت و معاندت کا برتاؤ کیا۔ یہ مشن پہلے ہی دن سے عالم گیر تھی اور معلوم دنیا، خاص کر ایران و روم (بیزنطیہ) تک اس کی فوری اور بآسانی وسعت کے امکانات نظر آتے تھے اور آنحضرت اپنی تبلیغ میں ظاہر بین دنیا داروں کو ان ممالک کی فتح کی بشارت دیتے تھے[۲] لیکن ایک مفلس اور کمزور قبیلے کی ایک جو ہر فرد کی حیثیت میں آپ کی

---

[۱] حوالے مضمون کے آخر میں دئے گئے ہیں۔

[۲] ابن ہشام صفحہ (۲۷۰)، نیز طبقات ابن سعد احوال قبل الہجرۃ۔

سرداری کا مانا جانا مشکل تھا۔ آنحضرت کی رشتہ داری طائف[1] اور مدینے[2] کے قبائل سے بھی تھی، اسی توقع میں پہلے آپ طائف کے قریب تر علاقے کو تشریف لے گئے مگر وہاں وطن سے بڑھ کر مشکلیں پیش آئیں۔ آخر حج کے زمانے میں کئی سال تگ و دو کرنے کے بعد چند مدینے والے ہی آپ کے گرویدہ بنے اور مدینہ آنے پر آپ کو اور آپ کے مکی ساتھیوں کو پناہ اور مدد دینے کا بھی وعدہ کیا۔

مکے کی مقامی حالت ناقابل برداشت ہو چکی تھی عام مخالفت سے بڑھ کر جسمانی اذیت سے بہتوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس لئے مسلمانان مکہ ہجرت کر کے مدینہ جانے لگے۔ مکے والے ڈرے کہ کہیں یہ لوگ باہر جا کر انتقام کی تیاریاں نہ کریں اس لئے خود آنحضرت کے مکان کا محاصرہ اور شبخون کی تجویز پختہ کی گئی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آنحضرت بخیر و عافیت مکے سے نکل کر مدینہ پہنچ گئے۔ جھنجھلاہٹ میں مکے والوں نے آپ کی[3] اور دوسرے مہاجروں[4] کی املاک و جائداد پر غاصبانہ تسلط جما لیا۔ مدینے کے مسلمانوں اور مکے کے مہاجروں کی مجموعی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی، اگرچہ مدینے کی آبادی کا اس وقت اندازہ چار پانچ ہزار کیا جاتا ہے جن میں آدھے کے قریب یہودی تھے۔ مکہ اس وقت ایک منظم شہری مملکت کی صورت میں تھا وہاں فوج، محاصل، عبادت، تعلقات خارجہ، عدل گستری وغیرہ کے کوئی پچیس سرکاری عہدے تھے، جن کا تفصیلی ذکر بُن حال میں ٹرونڈرم کی موتمر مستشرقین میں پڑھے ہوئے مقالے میں کیا ہے۔[5] اس کے برخلاف مدینے میں ابھی نراج کی کیفیت تھی اور قبائلی دور دورہ تھا، عرب اوس و خزرج کے بارہ قبائل میں بٹے ہوئے تھے تو یہودی بنو النضیر و بنو قریظہ وغیرہ کے دس قبائل میں۔ ان میں باہم نسلوں سے لڑائی جھگڑے چلے آ رہے تھے اور کچھ عرب کچھ یہودیوں کے ساتھ حلیف ہو کر باقی عربوں اور ان کے حلیف یہودیوں کے حریف بنے ہوئے تھے۔ ان مسلسل جنگوں سے اب دونوں بھی تنگ آ چلے تھے[6] اور گو وہاں کے کچھ لوگ غیر قبائل خاص کر قریش کی جنگی امداد کی

---

[1] معارف ابن قتیبہ صفحہ (۳۴۳)، کتاب المنتقی من دلائل النبوۃ لابی نعیم (مخطوطہ) الفصل العشرون۔

[2] ابن ہشام ص ۱۰۷، ۲۲۶، ۳۴۶ طبقات ابن سعد ج ۱/ ۱ ص ۳۴، ۴۵، ۴۶ معارف ابن قتیبہ "احوال عمومتہ" تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷۱ تا ۱۷۹ وغیرہ۔

[3] بخاری کتاب ۲۴ باب ۸۴ حدیث ۲۔

[4] ابن ہشام ص ۳۰۹ ج ایضاً ص ۱۲۱ تا ۲۲۔ [5] مطبوعہ رسالۂ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۳۸ء

[6] ابن ہشام ص ۲۸۷ طبقات ابن سعد ج ۱/ ۱ ص ۱۴۷ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۲۷ بخاری کتاب ۶۳ باب ۱، ۲۷، ۴۶۔

تلاش میں تھے[1] لیکن شہر میں امن پسند طبقات کو غلبہ ہو رہا تھا اور ایک کافی بڑی جماعت اس بات کی تیاری کر رہی تھی کہ عبداللہ بن اُبَی بن سلول کو بادشاہ بنا دیں حتیٰ کہ بخاری[2] و ابن ہشام[3] وغیرہ کے مطابق اس کے تاج شہریاری کی تیاری بھی کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی۔ بے شبہہ آنحضرت نے بیعت عَقَبہ میں بارہ قبائل میں بارہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے نقیب مقرر کرکے مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تھی مگر اس سے قطع نظر وہاں ہر قبیلے کا الگ راج تھا اور وہ اپنے اپنے سقیفے یا سائبان میں اپنے امور طے کیا کرتا تھا کوئی مرکزی شہری نظام نہ تھا تربیت یافتہ مبلغوں کی کوشش سے تین سال کے اندر شہر میں معتد بہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے مگر مذہب ابھی تک خانگی ادارہ تھا اس کی سیاسی حیثیت وہاں کچھ نہ تھی اور ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ ان حالات میں آنحضرت مدینہ آتے ہیں جہاں اس وقت متعدد فوری ضرورتیں تھیں:۔

(۱) اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین۔

(۲) مہاجرین مکہ کے توطن اور بسر برد کا انتظام۔

(۳) شہر کے غیر مسلم عربوں اور خاص کر یہودیوں سے سمجھوتہ۔

(۴) شہر کی سیاسی تنظیم اور فوجی مدافعت کا اہتمام۔

(۵) قریش مکہ سے مہاجرین کو پہنچے ہوئے جانی و مالی نقصانات کا بدلہ۔

انھیں اغراض کے مدنظر آنحضرت صلعم نے ہجرت کرکے مدینہ آنے کے چند مہینے بعد ہی[4] ایک دستاویز مرتب فرمائی جسے اسی دستاویز میں کتاب اور صحیفہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے، اور جسے بظاہر اشخاص متعلقہ سے گفت و شنید کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام قانون مُلک کتاب اللہ یا قرآن کی صورت میں جیسے جیسے نافذ یا نازل ہوتا تحریری صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا، اور منکسر المزاج احتیاط پسند پیغمبر اسلام صلعم نے اس زمانے میں اپنے ذاتی اقوال و ہدایات کو لکھنے کی عام طور سے ممانعت فرما دی تھی! اس کے باوجود زیر بحث دستاویز کا

---

[1] ۔ ابن ہشام ص ۲۸۵، ۲۹۰۔

[2] ۔ بخاری کتاب ۷۹ باب ۲۰۔

[3] ۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۲۷، تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۵۱۱ و مابعد۔ نیز قرآن مجید سورہ ۶۳ آیت ۸ کی تفسیریں

[4] ۔ ابن سعد ج ۲/۱ ص ۱۹۔ کتاب الاموال لابی عبید ف ۵۱۸۔

لکھا جانا معنے خیز ہے جسے کتاب اور صحیفے کے اہم ناموں سے یاد کیا گیا ہے جن کے معنے دستور العمل اور فرائض نامے کے ہیں۔ اصل میں یہ شہر مدینہ کو پہلی دفعہ "شہری مملکت" قرار دینا اور اس کے انتظام کا دستور مرتب کرنا تھا۔

روسو اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانی" میں مملکت کا آغاز حاکم و محکوم کے عمرانی معاہدے سے قرار دیتا ہے۔ اس کی ایک بیّن اور واقعی مثال ہم کو بیعت عقبہ میں ملتی ہے جس میں مدینے والوں نے آنحضرت صلعم کو اپنا سردار مانا، اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اور آپ کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ زیر بحث دستاویز ایک معاہدے کی شکل نہیں رکھتی بلکہ ایک فرض اور ایک حکم کی صورت میں نافذ کی جاتی ہے چنانچہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتاب کے معنے فرض اور حکم کے بھی ہیں۔ انّ الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً۔ انّ کتاب الابرار لفی علیین[1]۔ کتب علیہم القتال وغیرہ میں لفظ "کتاب" اسی معنے میں برتا گیا ہے۔ جرمن لفظ Vorschrift اور فرانسیسی و انگریزی لفظ (Prescription) اطالوی (Prescrizone) ہسپانوی (Prescripcion) (بمعنے فرض و حکم) کا مادہ بھی "کتابت" ہی کے معنے رکھتا ہے۔

عرب میں عام طور پر اور مدینے میں خاص طور پر جو مرکز گریزی تھی اس کا علاج تنظیم پسند اور وحدت خواہ نبی صلعم نے یہ تجویز کیا کہ "ایک حکمران ایک قانون"۔ ابھی تک زکاۃ اور حج کے مرکزکش احکام نہیں آئے تھے جن سے مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا حق مل کر ملک میں بزور ایک نقطے پر لوگوں کو لانے کا اور ہر حصے کے لوگوں کو ایک ہی قبلے کی زیارت کا بعد میں موقع ملا پھر بھی ایمان و اعمال کے سلسلے میں ایک خدا کو ماننے ایک ہی نبی کے احکام کی اطاعت کرنے اور مل کر نماز پڑھنے کے ادارے وجود میں آچکے تھے۔ اب اس دستور نے اس میں ایک نہایت اہم اور عرب کے لئے انقلابی اصلاح و ترقی یہ دی کہ لوگ اپنے حقوق اپنی یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کی مدد سے حاصل کرنے کی جگہ انصاف رسانی کو ایک مرکزی اور پبلک ادارہ بنا دیں۔ یہ عہد آفرین کارنامہ اسی دستاویز میں رکارڈ میں لایا گیا ہے جس نے قبائلیت کی افراتفری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور ایک وسیع تر ادارے یعنے مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اس دستاویز میں آنحضرت صلعم نے عدالتی، تشریعی، فوجی اور تنفیذی اعلیٰ ترین اختیارات اپنے لئے محفوظ فرما لئے مگر ایک نہایت اہم اور قابل ذکر فرق اس اقتدار اور دیگر ممالک کے مستبدانہ شاہی اقتدار میں یہ تھا کہ یہاں

---

[1] ابرار کے نامۂ اعمال کا جنت میں جانا بے معنے بات ہوگی۔ میں اس کے معنے یہ لیتا ہوں کہ ابرار کے متعلق طے شدہ حکم یہ ہے کہ وہ علیین میں ہونگے۔

مادیت کو دخل نہ تھا۔ آنحضرت نے سیاست میں اخلاقی عناصر داخل کئے، اصل سرچشمۂ اقتدار خدا کو قرار دیا اور اپنے کو اس کا رسول اور نائب اور ساتھ ہی امت کے لئے لائے ہوئے احکام اپنے پر بھی مساوی طور پر واجب التعمیل قرار دیے اور عہد نبوی میں ذات اقدس کے خلاف دیوانی اور تارٹ (ضمان) کے جو مقدمات دائر ہوئے[1] ان نظائر کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے King can do no wrong (بادشاہ کسی فعل ناجائز کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا) کو مسترد کر دیا۔ اور جب ملک کا قوی ترین شخص قانون کی خلاف ورزی نہ کر سکے تو دیگر عہدہ دار اور عام لوگ بھی تعمیل زیادہ توجہ کے ساتھ کریں گے۔ اس دستاویز کے دو نمایاں حصے ہیں:۔

حصہ اول میں (۲۵) فقرے ہیں جن کو ولہاوزن نے (۲۳) قرار دیا تھا اور جملہ یوروپی مولفوں نے ولہاوزن ہی کے نمبرات برقرار رکھے ہیں، میں نے بھی مجبوراً (۲۳) ہی نمبرات دیے، البتہ ضمن الف و ب کے ذریعہ دو دفعات کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور اس طرح ان کے (۲۵) دفعات قرار دیے تاکہ یوروپی مواد سے استفادے میں کسی کو الجھن پیدا نہ ہو۔

حصہ دوم ۲۴ تا ۴۷ پر مشتمل ہے لیکن ضمنی تقسیم متعدد فقرات میں کرنی پڑی، میرے حساب سے یہ حصہ (۲۸) فقرات پر مشتمل ہے اور جملہ دستاویز میں (۵۳) فقرات یا دفعات ہیں۔

پہلے (۲۳) دفعات مہاجرین و انصار کے متعلق قواعد پر مشتمل ہیں اور بقیہ حصہ مدینے کے یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا ہے، ان دونوں میں ایک جملہ دہرایا گیا ہے کہ آخری عدالت مرافعہ محمد رسول اللہ کی ذات ہوگی۔ مسلمان مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی حد تک تو کوئی دشواری نہیں لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کے چند مہینوں بعد ہی ایک نو وارد اجنبی صلعم کو اتنا بڑا اقتدار غیر مسلم طبقات نے دیدینا کس طرح منظور کیا؟ مدنی عربوں کی حد تک یہ جواب ایک حد تک تشفی بخش سمجھا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہاں اب تک قبائلی نظام تھا اور قبائلی سرداروں نے اسلام قبول کر لیا تھا اس لئے اُن بندگان خاندان کا مذہب قبول نہ کرتے ہوئے بھی ان کے خور د نز رشتہ دار انھیں کی سی کرنے پر مجبور تھے۔ عربی سماج کے باعث وہ خاندان اور قبیلے سے الگ نہ ہو سکتے تھے اور بیرون ملک بھی وہ اپنے باقی رشتہ داروں کی مدد کے بغیر جان و مال کا کوئی امن نہیں پا سکتے تھے۔ دستاویز میں صراحت سے یہ بتایا گیا ہے کہ جملہ مدنی قبائل اور

---

[1] ابن ہشام ص ۴۴۴۔ نیز تاریخ ابن الاثیر ذکر احوال مرض موت آنحضرت صلعم۔ و سیرۃ شامی، بر موقع

مہاجرین مکہ وغیرہ کی مرکزائی ہوئی زبردست قوت سے انصار کے مُشرک رشتہ داروں کو متمتع ہونے کا صرف
اس شرط سے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ سیاسی حیثیت سے مرکزی حکومت کی پالیسی میں رکاوٹیں نہ ڈالیں چنانچہ
حکم دیا گیا ہے کہ عربی قبائل میں جو مُشرک یا یہودی المذہب لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ میں معاون
ہوں اور وہ قریش مکہ کی جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں اور نہ اس بات میں آڑے آئیں کہ مسلمان کسی
قریشی کی جان و مال پر حملہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں ان کو قریشیوں سے حلیفی کو توڑنے، تعلقات کو منقطع کرنے
اور مسلمان اور قریشیوں کے تعلقات میں غیر جنبہ دار رہنے کی شرط پر حقوق شہریت عطا کیے گئے اور انھیں اس کو
منظور کرنا پڑا۔ ہمیں ایسے بھی بیانات عرب مولفوں کے ہاں ملتے ہیں کہ مدینے کے عرب برادرکشی اور باہمی لڑائیوں سے
اکتا گئے تھے[1]، اور تنگ آکر اس پر آمادہ ہو چکے تھے کہ کسی اجنبی غیر جانبدار کو حکمران بنا کر آئندہ امن کی زندگی
بسر کریں۔ یہ عرب غیر مسلموں کا ذکر تھا۔

یہودیوں کا بھی اسی ابتدائی زمانے میں آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لینا قرین قیاس نہیں۔
میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دستاویز کا حصہ دوم، یعنے یہودیوں کا دستور العمل، جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے
جبکہ ایک زبردست فتح سے مسلمانوں کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی تھی۔ اہل مدینہ نے اپنے سابقہ معاہدات حلیفی
جو یہودیوں کے ساتھ تھے منسوخ کر دیئے تھے۔ آنحضرت نے آس پاس ینبوع تک کے قبائل مثلاً بنی ضمرہ،
جہینہ وغیرہ سے حلیفیاں کر کے مسلمانوں کی قوت کو بے حد مضبوط اور مستحکم بنا دیا تھا۔ یہودیوں کے دو
بڑے گروہ آپس کے حریف و رقیب تھے۔ ان کا مل کر رہنا اور الگ مستقل رہ کر بجنت اور محفوظ رہنا
ممکن نہ تھا، اور وہ ہر طرف سے بچھڑ کر بے یار و مددگار اور ہر قوی کا شکار بنے ہوئے تھے۔ ان حالات نے
انھیں مجبور کیا کہ اپنی مذہبی آزادی اور اندرونی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے آنحضرت سے ماتحتانہ
تعاون کریں اور جیسا کہ عرض کیا گیا میرے خیال میں یہ جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہو سکتا ہے اس سے
پہلے کا ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ پوری دستاویز ایک ہی کل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی عبارت و
انداز اسلوب سے بھی ایک ہی مرتب کنندہ کا ہونے کا پایا جاتا ہے اور مسلمان مورخ عام طور سے یہ بیان
کرتے ہیں کہ یہ دستاویز سنہ ۱ھ کی ابتدا میں مرتب ہوئی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سنہ ۲ھ میں دستاویز کا

---

[1] ملاحظہ ہو اوپر صفحہ (۴۴)

حصۂ اول مرتب ہوا ہو، اور بقیہ حصہ ۲ھ میں جنگ بدر کے بعد مرتب کرکے حصۂ اول کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لسان العرب[1] میں اس دستاویز کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں اس کو دو نام دیے گئے ہیں، ایک جملے میں "کتب فی کتابہ للمہاجرین والانصار" کہہ کر "دستور العمل مہاجرین و انصار" سے یاد کیا گیا ہے اور اسی سے ذرا نیچے حصہ دوم کے سلسلے میں "و وقع فی کتاب رسول اللہ صلعم لیہود" یا "دستور العمل یہودیان" کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ ایک اور زیادہ راست شہادت اس سے ملتی ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی سنن[2] میں یہودیوں کے اس دستور العمل کو جنگ بدر کے بعد کا قرار دیا ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا اس دستور کے دو نمایاں اور ممتاز حصے ہیں، ایک اسلامی و عربی قبائل سے متعلق ہے اور دوسرا یہودیوں سے۔ ہر ایک کی مختصر تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی۔

سب سے پہلے فقرے میں ایک اسلامی سیاسی وحدت کے قیام کا اعلان کیا گیا ہے جس میں مہاجرین مکہ، انصار مدینہ اور وہ لوگ جو ان سب کے تابع و لاحق رہ کر ان کے ہمراہ جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں اور یہ سیاسی وحدت محمد النبی رسول اللہ کے احکام کی اطاعت کریگی (ف۱) اور اس اسلامی حصے کے سب سے آخری فقرے میں بھی مکرر اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ منبع اقتدار تو ذات خداوندی ہے لیکن لوگ خدا کے بھیجے ہوئے حضرت محمدؐ کی اطاعت کریں گے اور اپنے جملہ اختلافوں، جھگڑوں میں ان سے رجوع ہوں گے اور اُن کے فیصلے کو آخری مانیں گے (ف۲۳) یہ سیاسی وحدت باوجود اندرونی بوقلمونی کے اُمّت واحدہ سمجھی جائیگی اور تمام دنیا کے مقابل ایک ممتاز اور مستقل حیثیت رکھے گی اور جملہ مسلم طبقات کو یکساں حقوق و واجبات حاصل ہوں گے (ف۲) اور باوجود کمی تعداد و کمزوری و خطرات کے ان میں خود داری اور راہ راست پر ہونے کے جذبات پیدا کئے گئے (ف۱۲-۱۳) جنگ و صلح کو مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا، اور یہ نہیں ہو سکے گا کہ چند صلح یا جنگ کریں اور باقی نہ کریں۔ جنگی خدمت جبری و لازمی ہوگی۔ اور سب اس میں برابر کا حصہ لیں گے، عین حالت جنگ میں بھی نوبت نوبت فوجیں لڑیں گی اور آرام پائیں گی، یہ نہیں کہ پورا بار ایک ہی طبقے پر پڑے (ف۱۷-۱۸)، جنگ و صلح تو مرکزی مسئلہ ہو گئے

---

[1] تحت کلمۂ "ربع"۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب ۱۹ باب ۲۱

البتہ حسب سابق پناہ دہی کا حق انفرادی طور سے ہر چھوٹے بڑے سب کو حاصل ہوگا اور ادنیٰ ترین شخص کے دیئے ہوئے دعدۂ پناہ کا بھی پوری امت احترام کریگی (دفعہ ۱۵) اور اس طرح اخوت و مساوات اور آزادیٔ عمل اس سیاسی وحدت میں عملی طور سے جاری و ساری کردی گئی پناہ دہی کی اس آزادی میں ایک شرط لگائی گئی کہ جو مشرکین عرب اس سیاسی وحدت میں حقوق رعیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے یہ پابندی ہوگی کہ وہ قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دیں گے اور نہ اس بات میں آڑے آئیں گے کہ قریش کی جان و مال کو مسلمان اپنے حقوق حربیت کے سلسلے میں نقصان پہنچائیں (دفعہ ۲۰ب) اس دفعے کے سلسلے میں دو واقعات قابل ذکر ہیں جن کا امام بخاری[1] نے ذکر کیا اور جو دونوں جنگ بدر سے پہلے پیش آئے تھے ان دونوں میں دو بڑی مسلمان شخصیتوں نے بعض قریشی افراد سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اُن کی جائداد کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا بے شبہہ دفعے میں قریش کو پناہ دینے کی ممانعت صرف مشرک رعایا کو کیگئی ہے لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بھی اس کے پابند تھے اور بلا صراحت وہ اس پر عمل کرتے تھے اسی بنا پر میرا خیال ہے کہ یہ دفعہ ابتدائی دستور میں نہ تھی بعد میں جنگ بدر کے اختتام پر یہودی قبائل سے معاہدے کے وقت کسی قریبی موقع پر اس اصل دستور میں اضافہ کی گئی جنگ کے سلسلے میں جملہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مددگار اور دکھ درد میں حصہ دار رہنے کا حکم دیا گیا (دفعہ ۱۹) عدل گستری کے سلسلے میں آخری عدالت مرافعہ جہاں ذات رسالت پناہی صلعم کو قرار دیا گیا وہیں ہرجے اور خونبہا (ضمان و دیت) کی ادائی کے لئے قدیم نظام کی توثیق و تشریح کی گئی کہ اگر کوئی شخص کسی رقمی ادائی کا مستوجب ہو تو اس کی مدد اس کے سب رشتہ دار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنا ہو تو اہل قبیلہ ہی اس ادائی کے ذمہ دار ہوں گے (دفعہ ۳) اس سلسلے میں ایک طرح سے شہر کی محلہ وار تقسیم کی گئی اور ہر قبیلے کے لوگ دوسروں سے الگ یکجا ہی رہتے تھے، اور ہر محلے میں ایک میر محلہ اور متعدد نائبان میر محلہ اور اجتماع گاہ پائے جاتے تھے جن کو علی الترتیب نقیب، عریف اور سقیفہ کہتے تھے کوئی محلہ وار فنڈ یا خزانے کا تو پتہ نہیں چلتا[2] غالباً حسب ضرورت چندہ ہوتا ہوگا۔ یہ محلہ وار مجلسیں بڑی حد تک

---

[1] بخاری کتاب ۴۰ باب ۲ نیز کتاب ۶۴ باب ۲۔

[2] لیکن بنو النضیر کے یہودیوں میں قبیلہ واری بیت المال تھا چنانچہ سیرۃ شامی میں غزوہ سویق کے بیان میں لکھا ہے "سلام بن مشکم وکان سید بنی النضیر فی زمانہ ذلک وصاحب کنزھم . . یعنی بالکنز ھذا المال الذی کانو یجمعونہ لنوائبھم وما یعرض لھم"

خود مختار اور خود اکتفا تھیں۔

انصار کے قبائل تو معین تھے ہی اب ان عدالتی وسماجی اغراض کے لئے جملہ مہاجرین کا بھی ایک قبیلہ قرار دیا گیا (ف ۱۳) اور یہ قرار دیا گیا کہ اگر کوئی محلہ وار مجلس اپنے کسی اہل محلہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو تو دیگر مجالس بھی ہاتھ بٹانے کی پابند ہوں گی (ف ۱۲) اور یہ بھی صراحت سے بتا دیا گیا کہ اگر کسی قبیلے میں کوئی موالی ہوں یعنے کسی فرد سے قانونی اور معاہداتی بھائی چارہ کر کے اس قبیلے کے رکن بنے ہوں تو ایسے موالی کو اپنے اصل سے اختلاف کا حق نہ ہوگا (ف ۱۳) اس نظام ولاء کے سلسلے میں یہ بھی حکم دیا گیا کہ ایک شخص کے مولا کو کوئی دوسرا شخص بلا اجازت اصل اپنا مولا نہ بنالے۔ (ایضاً بروایت ابن حنبل)۔ انصاف جوئی کا اختیار افراد سے لیکر جماعت یعنے مرکز کے سپرد کر دیا گیا جو ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اور حکم دیا گیا کہ انصافی مسائل میں جانبداری کرنے اور اپنے رشتہ داروں کی پچ کرنے بلکہ خود حقیقی بیٹے کو تک بچانے کی کوشش کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی اور جملہ مسلمان اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہر ضرر پہنچانے یا ضرر پہنچانے کی تیاری کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری طرح ہاتھ بٹائیں (ف ۱۳) قتل عمد کی سزا قصاص مقرر کی گئی البتہ مقتول کے ولی کو اختیار دیا گیا ہے کہ دیت لیکر قصاص سے درگزر کرے۔ اور انصاف رسانی میں مداخلت کی سختی سے ممانعت کی گئی (ف ۱۵) اسلام کی حقانیت جتانے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا کہ اگر ان کا کوئی غیر مسلم رشتہ دار کسی مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو قصاص پر اصرار نہ کریں اور کسی مسلمان کے خلاف کسی غیر مسلم کی مدد نہ کریں (ف ۱۴) اسی طرح کسی قاتل مجرم کو پناہ یا مدد دینے کی ممانعت کی گئی اور کہا گیا کہ جو خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہے اور جس نے اس دستاویز کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا ہے اگر وہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوں گے اور اس کی رستگاری کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

انصار کے بعض لوگ یہودیت قبول کر چکے تھے، خاص کر بعض بچوں کو اُن کے والدین منت مان کر یہودی بنادیتے تھے اُن کے متعلق بھی ایک خصوصی دفعہ رکھ دی گئی کہ اگر وہ ماتحتانہ انخاذ عمل پر آمادہ ہوں تو انھیں سب مسلمان کے برابر حقوق رعیت حاصل ہوں گے، ان کی حفاظت و مدد کی جائیگی اور ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا جائیگا (ف ۱۶)۔

---

* یہاں تک ان امور کا ذکر ہوا جو حصہ اول میں مندرج ہیں اور جو مدینے کے عربوں سے متعلق ہیں۔

حصہ دوم یہودیوں کے قبائل سے متعلق ہے۔

اوپر اس امر سے بحث ہو چکی ہے کہ آیا یہودیوں کا یہ دستور انصار و مہاجرین کے قواعد کے ساتھ ہی بنایا گیا یا بعد۔ اس حصے کی مختصر تحلیل کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کی پہلی دفعہ مشترک ہے کہ کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحادِ عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا اور یہ حکم نہ صرف دفعہ ۲۴ میں بیان ہوا ہے بلکہ دفعہ ۳۷ الف اور دفعہ ۳۸ میں بھی دہرایا گیا ہے اور غالباً دفعہ ۴۵ ب کی مبہم عبارت کا بھی یہی منشا ہے کہ "وعلی کل اناس حصتہم من جانبہم الذی قبلہم" جس کو ابو عبید نے "حصتہم من النفقۃ" لکھا ہے اس تکرار کی وجہ غالباً یہی تھی کہ مالی معاملات میں یہودی بہت بدنام تھے ان کی بدمعاملگی کو "لیس علینا فی الامیین سبیل" اور "منہم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک" وغیرہ آیات قرآنی میں بھی طشت از بام کیا گیا ہے جب مصارف برداشت کرنے کی ذمہ داری تھی تو ظاہر ہے کہ انھیں مال غنیمت کو پانے کا بھی حق حاصل تھا جیسا کہ ابو عبید نے اپنی شرح میں صراحت بھی کی ہے[۵]۔ یہودیوں نے بھی آنحضرت کے سیاسی اقتدار کو مان لیا تھا اور ہر اختلاف میں آنحضرت کے فیصلے کو آخری تسلیم کر لیا تھا، جیسا کہ دفعہ ۴۲ میں نہایت صراحت سے قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دفعہ ۲۵ میں "یہودی اپنے مذہب پر اور مسلمان اپنے مذہب پر" کہہ کر دینی آزادی اور رواداری کا اعلان کرنے کے باوجود دفعہ ۴۲ میں ابن اسحاق کی روایت میں محمد رسول اللہ اور ابو عبید کی روایت میں محمد النبی کے الفاظ بڑھ گئے ہیں اور دفعہ ۴۷ میں ابن اسحاق کے ہاں محمد رسول اللہ کا کلمہ مکرر آیا ہے گو ابو عبید کی روایت میں یہ جملہ حذف کر دیا گیا ہے اس کے معنے غالباً یہ تو نہیں ہوں گے کہ ان یہود نے آنحضرت کی رسالت یا نبوت مان لی تھی بلکہ ان تاریخی کتابوں کے کسی باادب کاتب نے یہ لفظ بڑھائے ہوں گے (کیوں کہ ابن اسحاق کے ہاں دونوں جگہ آخر میں صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے جو خود آنحضرت کا اپنے متعلق لکھنا قرین قیاس نہیں ہے) یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نبی" یا "رسول اللہ" کا لفظ آنحضرت نے خود لکھا تھا اور یہودیوں نے اپنی خطرناک سیاسی و جنگی حالت کے مدنظر اس پر اعتراض کی جراءت نہ کی۔ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے استعمال کے متعلق سیرۃ ابن ہشام ص ۹۹۲ سطر ۳ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خطبے وغیرہ میں آنحضرت اس کا بطور دعا خود بھی اپنے متعلق استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اس ذیلی بحث کے قطع نظر اس دستاویز میں دس یہودی قبائل کا فرداً فرداً اور نام بنام ذکر

۵۔ روض الانف للسہیلی ج ۲ ص ۱۷۔ کتاب "الاموال لابی عبید" ۵۱۰۔

کیا گیا، اور ان کے حقوق کی مساوات تسلیم کی گئی اِس کا منشا بظاہر یہ ہے کہ یہودیوں نے ایک جماعت بن کر اس وفاقی شہری مملکت مدینہ میں شرکت نہیں کی بلکہ ہر قبیلہ ایک علیحدہ وحدت کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے چند یہودی قبائل سے جنگ کی یا انھیں مدینہ کی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دیا تو نہ صرف باقی قبائل خاموش رہے بلکہ بعض مواقع پر انھوں نے مسلمانوں کی جنگی مدد بھی کی اور اس جنگ کے باوجود یہ معاہدہ یا دستور دیگر یہودی قبائل کی حد تک باقی رہا منسوخ نہیں سمجھا گیا چنانچہ اس دستور میں خونبہا کی ادائی میں اہل قبیلہ اور موالی مشترکہ طور پر ذمہ دار قرار دیے گئے تھے اور بنی قینقاع کے اخراج کے بعد بنو النضیر سے اسی قرارداد مندرجہ ف۲۵ و ف۳۱ کے تحت آنحضرت نے ایک موقع پر چندہ دینے کا مطالبہ کیا تھا[1] یہودیوں کو مسلمان رعایا کے ساتھ سیاسی و تمدنی حقوق میں صراحت سے مساوات دی گئی (ف۲۵) اور یہودیوں کے معاہداتی رشتہ داروں کو جنھیں موالی البطن اور بطانہ کا نام دیا گیا ہے حقوق اور ذمہ داریوں میں تمام اور اصلی یہود کے برابر مان لیا گیا ہے (ف۳۲ ف۴۰ ف۳۴ ف۴۵ ف۴۶) البتہ پناہ گزیں بلا اجازت پناہ دہندہ کسی اور کو پناہ نہیں دے سکتا (ف۴۱) یہودیوں سے اصل میں ایک جنگی حلیفی کی گئی تھی چنانچہ ف۳۷ ف۴۴ اور ف۴۵ میں صراحت سے قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں اور ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں اور مدینے کی مدافعت میں مشترکہ حصہ لیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہود مسلمانوں کو مدد دیں گے اور یہود پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان، یہودیوں کو مدد دیں گے، البتہ دینی جنگوں میں جو مسلمان اختیار کریں یہودیوں کو ہاتھ بٹانے کی ذمہ داری نہ ہوگی (ف۴۵) نیز مسلمان کے ساتھ فوج میں شرکت آنحضرت کی اجازت پر منحصر رکھی گئی (ف۳۶ الف) اس دفعہ کی عبارت کسی قدر مبہم ہے اور یہ معنے بھی نکلتے ہیں کہ یہودی آنحضرت کی اجازت کے بغیر خود بھی مستقلاً کسی سے جنگ نہیں کر سکتے اگر یہ واقعہ ہے تو آنحضرت کے سیاسی اقتدار کی مزید وسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس اہم قرارداد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مکے کے قریش متاثر ہوئے ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف مدد دے سکنے والے ایک اہم حلیف یعنے یہودیوں کی اعانت سے محروم کر دیئے گئے جیسا کہ ف۴۳ میں قرار دیا گیا ہے کہ یہودی، قریش اور قریش کے مددگاروں کو کوئی پناہ نہیں دیں گے، گو بدقسمتی سے عمل اس پر نہ ہوا

---

[1] - ابن ہشام ص ۶۵۲ - ابن سعد ج ۲/۱ ص ۴۰ تا ۴۱ - تاریخ طبری طبع یورپ ص ۱۴۴۹ تا ۵۰

اور یہودی سردار برابر قریش سے سازش کرتے رہے اور جنگ بدر کی شکست کے بعد اس کا سلسلہ جو شروع ہوا تو بنو قریظہ کی بلا شرط اطاعت تک برابر جاری رہا۔[1] بہر حال صلح و جنگ کو وفاق کا بلا شرط ایک مرکزی مسئلہ قرار دے دیا گیا، اور جنگ کی کمان آنحضرت کو حاصل ہو گئی جو آنحضرت کی زبردست سیاسی کامیابی تھی۔

سماجی اور اندرونی مسائل میں آنحضرت نے کوئی مداخلت نہیں کی اور فدیہ، دیت اور جوار یا پناہ دہی اور معاہداتی رکنیت قبیلہ کے ادارات اور رواجات کو برقرار رکھا گیا (ف ۲۵ و ۳۱ ف ۴۰) اس فرزانہ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کو ہچکچاہٹ اور گھبراہٹ نہیں ہوئی اور یہودیوں نے خوشی سے اس کو منظور کر لیا کہ آنحضرت اُن کی بھی آخری عدالت مرافعہ کے فرائض انجام دیں (ف ۴۲) نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے مقدمات میں آنحضرت ان کے شخصی قانون ہی کے مطابق فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ جنگ و صلح کی طرح یہودیوں کی عدل گستری کو بھی (ف ۳۶ ب میں) صراحت کے ساتھ مرکزی مسئلہ قرار دیا گیا اور انصاف میں رشتہ داری وغیرہ کے باعث دخل دہی کی قطعی ممانعت کی گئی اور قدیم زمانے کے انتقامات اور انتقام کے انتقامات کا لامتناہی سلسلہ یک تحت روک دیا گیا۔ آنحضرت کا یہودیوں پر عدالتی اقتدار اعلیٰ بھی مسلمانوں کے لئے بڑی سیاسی فتح تھی۔ یہودیوں نے نہ صرف آنحضرت کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کر لیا بلکہ شہر مدینہ و مضافات (جوف) کو ایک حرم بھی تسلیم کیا ف ۳۹ مکہ ایک حرم تھا شہر طائف کی حرمت کو ۹ھ کے معاہدۂ طائف میں بھی تسلیم اور برقرار رکھا گیا (دیکھئے کتاب الاموال لابی عبید ف ۵۰۶) یہودیوں سے ایک نیم عرب شہر کو حرم مقدس منوا لینا بھی آنحضرت صلعم کا ایک سیاسی کارنامہ تھا اور اس طرح ایک چھوٹی سی بستی کو جو بنش[2] ایک محلوں پر مشتمل تھی شہری مملکت کی صورت میں منظم کیا گیا، اور اس کی قلیل لیکن بوقلموں و کثیر الاجناس آبادی کو ایک لچکدار اور قابل عمل دستور کے تحت ایک مرکز پر متحد کیا گیا، اور ان کے تعاون سے شہر مدینہ میں ایک ایسا سیاسی نظام قائم کر کے چلایا گیا کہ وہ بعد میں ایشیا، یوروپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر پھیلی ہوئی ایک وسیع اور زبردست شہنشاہت کا بلا کسی وقت کے صدر مقام بھی بن گیا۔ یوروپ کے لفظ پر آپ حیران نہ ہوں، عہد بنی امیہ سے بہت پہلے حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۷ھ میں

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۴ ص ۶ ۔ ابن ہشام ص ۶۸۱ نیز ۔

[2] Jewish foundation of Islam by Torrey P. 130.

مسلمانوں کی فوجیں اندلس میں داخل ہوگئیں اور مزید کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں مقیم اور مُلک کے ایک حصے پر قابض رہیں تاآں کہ بہت دنوں کے بعد طارق آتا ہے اور اندلس کی فتح کو مکمل کرتا ہے، عہدِ عثمانی کی اس مہم کا ذکر طبری[1] اور گبن[2] نے بھی کیا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ عہدِ عثمانی تک مدینہ ہی مرکز خلافت تھا۔

اس دستاویز میں ایک جگہ لفظ "دین" بھی برتا گیا ہے اس لفظ میں بیک وقت مذہب اور حکومت دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسا اہم امر ہے کہ اس کو پیشِ نظر رکھے بغیر مذہب اسلام اور سیاسیات اسلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔

یہاں اس دستور کے متن کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا۔

اصل متن دستور کے ماخذ

۱۔ سیرۃ ابن ہشام (طبع یوروپ) ص ۳۴۱ تا ۳۴۴۔
۲۔ سیرۃ ابن اسحاق (ترجمۂ فارسی، مخطوطۂ پاریس) ورق ۱۰۱۔
۳۔ کتاب الاموال مولفۂ ابوعبید قاسم بن سلّام (طبع مصر) فقرہ ۵۱۷۔
۴۔ البدایہ والنہایہ مولفۂ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲۴ تا ۲۲۶۔
۵۔ سیرۃ ابن سید الناس۔ احوال بعد ہجرت کے ضمن میں۔

متن کے اقتباسات کے ماخذ

۱۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب ۱۹۔ باب ۲۱۔
۲۔ مسند احمد بن حنبل۔ ج ۱ ص ۲۷۱۔ ج ۲ ص ۲۰۴۔ ج ۳ ص ۲۴۲۔
۳۔ تاریخ الطبری (طبع یوروپ سلسلۂ اول) ص ۱۲۶۲، ۱۳۵۹۔
۴۔ لغت لسان العرب مولفۂ ابن منظور تحت مادہ "بدر، دسع، عقب، عقل، فرح، وتغ"۔

---

[1] تاریخ طبری ص ۲۸۱۷۔
[2] Decline and fall of Roman Empire, V, p. 555.

ھ طبقات ابن سعد ج ا قسم دوم ص ۱۷۲۔

اس موضوع پر یوروپی زبانوں کے مضامین

1. Wellhausen, Skizzen und Vorarbeiten, Vol. 4, Nr. 2:- "Gemeindeordnung von Medina."
2. Caetani, Annali dell'Islam, anno 1, § 41.
3. Wensinck, Mohammed en de Joden te Medina, pp. 78 et seq.
4. Buhl, Das Leben Mohammeds, pp. 210-212.
5. Sprenger, Das Leben und die Lehre des Mohammed, Vol. 3, pp. 20-30.
6. Mueller, Der Islam in Morgen- und Abendland, Vol. 1. pp. 15-18
7. Grimme, Mohammed, pp. 75-81.
8. Islamic Culture (Hyderabad quarterly), Vol. XI, pp. 163-172.
"Administration of Justice in Early Islam."

ترجمہ دستور مملکت مدینہ بعہد نبوی ؐ

(کوشش کیگئی کہ ترجمہ واضح ہو اور سمجھنے کیلئے کسی حاشیے کی ضرورت نہ رہے۔ اور فقرات پر نمبر بھی لگائے گئے ہیں تاکہ حوالے میں سہولت رہے۔ یہ نمبر چونکہ معین ہوچکے ہیں اور جرمنی، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ ہر جگہ ایک ہی ہیں اسلئے جہاں مجھے اختلاف کرنا پڑا وہاں الف، ب کرکے ذیلی تقسیم کیگئی ہے اور بین الاقوامی نمبروں کو باقی رکھا گیا ہے)

رحم والے اور مہربان خدا کے نام سے۔

ف ۱۔ یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمدؐ کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانے والوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہوجائیں اور انکے ہمراہ جنگ میں حصہ لیں۔

ف ۲۔ تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (امت) ہوگی۔

ف ۳۔ قریش سے ہجرت کرکے آنیوالے اپنے محلے کے (ذمہ دار) ہونگے اور اپنے خونبہا باہم ملا کر دیا کرینگے اور اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائینگے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۴۔ اور بنی عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۵۔ اور بنی الحارث بن خزرج اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۶۔ اور بنی ساعدہ اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۷۔ اور بنی جشم اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۸۔ اور بنی النجار اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۹۔ اور بنی عمرو بن عوف اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ

اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۰۔ اور بنی النبیت اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۱۔ اور بنی الأوس اپنے محلے کے ذمہ دار ہونگے اور حسب سابق اپنے خونبہا باہم مل کر دیا کرینگے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائیگا تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۲۔ الف۔ اور ایمان والے کسی قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کو مدد دیے بغیر چھوڑ نہ دینگے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

ف ۱۲۔ ب۔ اور یہ کہ کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا (معاہداتی بھائی) سے خود معاہدہ برادری نہیں پیدا کریگا۔

ف ۱۳۔ اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھینگے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اٹھینگے خواہ وہ انہی میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف ۱۴۔ اور کوئی ایمان والا کسی ایمان والے کو کسی کافر کے بدلے قتل نہ کریگا اور نہ کسی کافر کی کسی ایمان والے کے خلاف مدد کریگا۔

ف ۱۵۔ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں میں) کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عاید کرسکیگا۔ اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا کے) لوگوں کے مقابل۔

ف ۱۶۔ اور یہ کہ یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کریگا تو اسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ان پر ظلم کیا جائیگا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائیگی۔

ف ۱۷۔ اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کریگا جب تک کہ (یہ صلح) ان سب کیلئے برابر اور یکساں نہ ہو۔

ف ۱۸۔ اور ان تمام ٹکڑیوں کو جو ہمارے ہمراہ جنگ کریں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دلائی جائیگی۔

ف ۱۹۔ اور ایمان والے باہم اس چیز کا انتقام لینگے جو خدائی راہ میں ان کے خون کو پہنچے۔

ف ۲۰۔ الف اور بے شبہہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستہ پر ہیں۔

ف ۲۰۔ ب۔ اور یہ کہ کوئی مشرک (غیر مسلم رعیت) قریش کی جان اور مال کو کوئی پناہ نہ دیگا اور نہ اس سلسلہ میں کسی مومن کے آڑے آئیگا۔

ف ۲۱۔ اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے اور ثبوت پیش ہو تو اس سے قصاص لیا جائیگا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خونبہا پر راضی ہو جائے۔ اور تمام ایمان والے اس (کی تعمیل) کیلئے اٹھینگے اور اسکے سوا انہیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی۔

ف ۲۲ ۔ اور کسی ایسے ایمان والے کیلئے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا اور خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے ۔ اور جو اسے مدد یا پناہ دیگا تو قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہونگے اور اس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہ ہوگا ۔

ف ۲۳ ۔ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اسے خدا اور محمدؐ سے رجوع کیا جائیگا ۔

ف ۲۴ ۔ اور یہودی اس وقت تک مومنین کیساتھ اخراجات برداشت کرتے رہنگے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں ۔

ف ۲۵ ۔ اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت (یا امت) تسلیم کئے جاتے ہیں یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین ۔ موالی ہوں کہ اصل ۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا ۔

ف ۲۶ ۔ اور بنی النجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو ۔

ف ۲۷ ۔ اور بنی الحارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف ۲۸ ۔ اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف ۲۹ ۔ اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف ۳۰ ۔ اور بنی الأوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو

ف ۳۱ ۔ اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو ۔ ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اس کی ذات یا گھرانے کے سوائے کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا ۔

ف ۳۲ ۔ اور جفنہ جو (قبیلۂ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے اسے بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو ۔

ف ۳۳ ۔ اور بنی الشطیبہ کو کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو بنی عوف کے یہودیوں کو ۔ اور وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی ۔

ف ۳۴ ۔ اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو ۔

ف ۳۵ ۔ اور یہودیوں (کے قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہونگے جو اصل کو ۔

ف ۳۶ ۔ الف ۔ اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد کی اجازت کے بغیر (مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہو کر) نہیں نکلیگا ۔

ف ۳۶ ۔ ب ۔ اور کسی مار، زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائیگی اور جو خونریزی کرے تو اسکی ذات اور اس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا ورنہ ظلم ہوگا ۔ اور خدا اسکے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے ۔

ف ۳۷ ۔ الف ۔ اور یہودیوں پر ان کے خرچے کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کا خرچہ ۔

ف ۳۷ ب۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم امداد عمل میں آئیگی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

ف ۳۸۔ اور یہودی اسوقت تک مومنین کیساتھ اخراجات برداشت کرتے رہینگے جب تک کہ وہ مل کر جنگ کرتے رہیں

ف ۳۹۔ اور یثرب کا جوف (یعنی میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہو) اس دستور والوں کیلئے ایک حرم (اور مقدس مقام) ہوگا۔

ف ۴۰۔ پناہ گزین سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کیساتھ۔ نہ اسکو ضرر پہنچایا جائیگا اور نہ خود وہ عہد شکنی کریگا۔

ف ۴۱۔ اور کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دیجائیگی (یعنی پناہ دینے کا حق پناہ گزین کو نہیں

ف ۴۲۔ اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمدؐ سے۔ جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔ رجوع کیا جائیگا۔ اور خدا اس شخص کے ساتھ جو اس دستور کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف ۴۳۔ اور قریش کو کوئی پناہ نہیں دی جائیگی اور نہ اس کو جو انہیں مدد دے۔

ف ۴۴۔ اور ان (یہودیوں اور مسلمانوں) میں باہم مدد دہی ہوگی اگر کوئی یثرب پر ٹوٹ پڑے۔

ف ۴۵۔ الف۔ اور اگر ان کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کرینگے اور اسمیں شریک رہینگے اور اگر وہ کسی ایسے ہی امر کیلئے بلائیں تو مومنین کا بھی فریضہ ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا ہی کریں بجز اسکے کہ کوئی دینی جنگ کرے

ف ۴۵۔ ب۔ ہر گروہ کے حصے میں اسی رخ کی (مدافعت) آئیگی جو اس کے بالمقابل ہو۔

ف ۴۶۔ اور (قبیلہ) الأوس کے یہودیوں کو موالی ہوں کہ اصل وہی حقوق حاصل ہونگے جو اس دستور والوں کو اور وہ بھی اس دستور والوں کے ساتھ خالص وفاشعاری کا برتاؤ کرینگے اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی جو جیسا کریگا ویسا خود ہی بھریگا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس دستور کی مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صداقت اور زیادہ سے زیادہ وفاشعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

ف ۴۷۔ اور یہ کہ یہ حکمنامہ کسی ظالم یا عہد شکن کے آڑے نہ آئیگا۔ اور جو جنگ کو نکلے تو بھی امن کا مستحق ہوگا اور جو مدینے میں بیٹھ رہے تو بھی امن کا مستحق ہوگا ورنہ ظلم اور عہد شکنی ہوگی۔ اور خدا اس کا نگہبان ہے جو وفاشعاری اور احتیاط (سے تعمیل عہد) کرے اور اللہ کے رسول محمدؐ بھی جن پر خدا کی توجہ اور سلامتی ہو۔

ایجادات کے پانچ دَور

از جناب حبیب احمد صاحب فاروقی بی۔اے؛ ڈپ مددگار ٹکنیکل کالج

تمہید ایجادات کی تاریخ دراصل انسان کے ذہنی ارتقاء اور تہذیب و تمدن کی نشو و نما کی تاریخ ہے۔ اس کی ابتدا زمانۂ تاریخ سے بھی بہت پہلے ہوئی۔ پہلا برتن پہلا ہل، یا پہلا پہیہ ایسی ایجادات ہیں جن کو کوئی محفوظ نہ کرسکا۔ ہم نہیں جانتے کہ جھاڑ کی پیڑ کو کرید کر کس نے پہلی ناؤ بنائی؟ اور نہ اس کا صحیح اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کونسی ضرورت اس ایجاد کا باعث ہوئی؟ پانچ ہزار سال پہلے ایک مصری نے شیشے کے زیورات بنائے تھے جو اب بھی نمائش گاہ میں محفوظ ہیں اور اپنی خوب صورتی سے ہم کو ششدر کردیتے ہیں مگر ہم کو اس شخص کا کچھ بھی حال معلوم نہیں جس کے سر اس ایجاد کا سہرا ہے۔ اسی طرح ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے دست کاری کے جو عجیب و غریب نمونے حاصل ہوئے ہیں ان سے ہم اس عہد کے متعلق صرف کچھ قیاس کرسکتے ہیں جس عہد میں ان کی ایجاد متعین کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اشیاء سے ہم اُن ادوار کا ایک سرسری اندازہ لگاسکتے ہیں جن کی یہ نشانیاں ہیں یہ دراصل ایجادات کی ان منزلوں کی نشان وہی کرتے ہیں جو انسان نے اپنے سفرِ زندگی میں طے کیے۔

ابتدائی ایجادات اوقاتِ فرصت کے صحیح استعمال کے باعث دست کاریاں، صنعتیں اور دوسری ایجادات وجود میں آئیں، جن کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا بار کم ہوتا گیا۔ اگرچہ بعد کی ایجادات مَرد کی جد و جہد کا نتیجہ ہیں، مگر ابتدائی ایجادات کا سہرہ عورت ہی کے سر ہے۔ عورت نے پہلی مرتبہ اُون کاتا، اور پہلا لباس بنایا، پہلی مرتبہ غلّہ میں کراس کی روٹی پکائی اور کیا عجب ہے کہ اپنے شوہر کو شکار میں مدد دینے کے لیے پہلا بھدّا چھُرا بھی اسی نے بنایا۔ گھر کو سجانے اور جسم کو سنوارنے کی تمام اشیاء اور اسی قسم کی دوسری ایجادات عورت ہی کی ممنونِ احسان ہیں! ایجادات کا یہ سلسلہ کئی صدیوں تک اپنی ایسی معمولی رفتار کے ساتھ قایم رہا کہ اس زمانے میں ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ صدیوں بعد جو ایجادیں

ظہور میں آئیں وہ کئی سو سال پہلے ہی کیوں پیش نہ کی جاسکیں۔ ازمنۂ وسطیٰ نے کیوں کوئی قابلِ ذکر ایجاد پیش نہیں کی؟ انسان نے برق اور بھاپ پر قابو پانے میں کیوں اتنی دیر لگائی؟

ضروریاتِ زمانہ واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم ہر زمانے اور عہد کے حالات زندگی کا صحیح حال معلوم نہ کرلیں ایجاد کی اس سست ترقی کی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ہم جانتے ہیں کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ ضروریاتِ زندگی اور معاشی و سماجی حالات کچھ ایسے تھے کہ پچھلے زمانے میں ان ایجادات کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ حالانکہ اس زمانے کے بعض مفکرین نے بعض ایجادات کے امکانات پر پیش قیاسی کی تھی، مگر ایک ایسی دنیا میں جہاں سادگی کارفرما تھی اور کشمکشِ حیات کے پیچیدہ مسایل پیدا نہ ہوئے تھے، ان ایجادات کی ضرورت ہی کیا ہوسکتی تھی؟ جب کوئی ایجاد ہوتی ہے وہ یا تو کسی زندگی کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یا معاشی و سماجی حالات میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے۔ تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ یورپ میں اٹھارھویں صدی کا صنعتی انقلاب دراصل اس عہد کے سماجی ارتقا، کا نتیجہ تھا۔ مختلف ممالک میں چند طبقوں کی زرعی زندگی سے بیزاری اور دست کاریوں کی طرف میلان کی وجہ سے شہری آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ آبادی کی کثرت، مصنوعات کی نکاسی، باہمی مقابلے، غرض کشمکشِ حیات کے بہت سے پیچیدہ مسایل پیدا ہوئے۔ اس سماجی تغیر اور معاشرتی پیچیدگیوں کے باعث اٹھارھویں صدی کا صنعتی انقلاب واقع ہوا، جو ایجادات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

دھانی انجن اپنے وقت پر ایجاد ہوا، اسی طرح گیسی انجن، ریل گاڑی اور موٹر گاڑی بھی زمانے کے حالات اور ضروریات کے تحت وجود میں آئے۔

عوام کی مخالفت اگرچہ کہ ہر نئی ایجاد اپنے افادات کے باعث آگے چل کر مقبول ہوجاتی ہے مگر ابتدا میں ہر ایجاد کی مخالفت ضرور ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسی جدید چیز کو قبول کرنے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک یا چند ایسی قدیم چیزیں ترک کردیں جن سے ہمارے جذبات اور وجدانات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہر مرتبہ جدید و قدیم کا ایک تصادم ہوتا ہے۔ مرڈاک اور اسٹیفن سن کو اپنی ایجادات پیش کرنے میں جن دقتوں کا سامنا ہوا ان کی تفصیل پڑھنے سے واضح ہوگا کہ یہ جھگڑے کسی تاریخی لڑائی سے کچھ کم معرکہ آرا نہ تھے۔ قدیم اشیا سے وابستگی اور جدید سے جو نفرت ہوتی ہے اس پر غالب آنا ہر زمانے میں کچھ غیر معمولی طور پر مشکل پایا گیا۔ اس زمانے میں شاید ہم ان مخالفتوں کو حیرت اور استعجاب سے دیکھیں گے

اور محسوس کریں گے کہ ہٹ دھرمی کے سوا اس مخالفت کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی مگر ہم میں سے بہت کم اتنی جرات یا صداقت رکھتے ہیں جو ایسے نئے مواقع پر خود انھیں غلطیوں میں مبتلا نہ ہوں جن کو ہم پچھلوں کی ہٹ دھرمی اور جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔

سمسن موجد کلوروفارم اپنی اس ایجاد کی وجہ سے انسانی محسن شمار کیا جاتا ہے، مگر کس قدر عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم عصروں نے اس کی بے انتہا مخالفت کی اور مذہبی اشخاص نے اس کو مُرید شیطان، زندیق اور مردود ٹھیرایا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بیماری خدا کی دی ہوئی چیز ہے اور اس کی ساری تکلیفیں انسان کو برداشت کرنی چاہئیں، اب اگر کوئی شخص ان تکالیف کو کم کرنے کی کوشش کرے تو وہ (معاذاللہ) خدا کی مرضی کے خلاف انسان کو آرام پہنچا رہا ہے جو عبودیت کی خلاف ورزی اور شیطان کی مددگاری کے مرادف ہے۔

اگر دنیا ساری بیماریوں کو خدا کے حکم کا نتیجہ اور ناقابل علاج تسلیم کرلیتی، دوا، اور تیمارداری کو داخل گناہ شمار کرتی تو غور کیجیے کہ آج انسانی زندگی کی حالت کس قدر قابل رحم ہوتی۔ شکر ہے کہ ہم اس زمانے سے گذر چکے ہیں جبکہ نئی ایجادات اور سائنسی ترقیاں خدا کی مقدس مرضی کی مخالفت کرنے اور خدائی قوانین کو توڑنے کے مترادف سمجھی جاتی تھیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا نے اپنے "خلیفہ" کو وہ علم و حکمت عطا فرمائی ہے جس کو وہ اپنی زندگی کے موانعات پر غالب آنے، ضروریات اور جائز مسرتوں کے حاصل کرنے کے لیے کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتا ہے اور اس کو کرنا ضروری بھی ہے، کیوں کہ خدا کی عنایت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لینا بڑی ناشکری ہے۔ سائنس دانوں نے جہالت، مرض اور دوسرے موانعات پر غلبہ حاصل کرکے نوع انسانی کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کسی طرح قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی نہیں کہلائی جا سکتی۔

آج سے چالیس سال پہلے انگلستان کی سڑکوں پر کسی سواری کو چار میل سے زیادہ رفتار سے چلنے کی اجازت نہ تھی اور چار میل کی رفتار پر یہ قید تھی کہ سواری کے سامنے ایک سوار سُرخ جھنڈی لیا ہوا رہا کرے۔ ابتدا میں عوام موٹر میں بیٹھنا اس لیے گناہ سمجھتے تھے کہ "تعجیل کار شیاطین بود" اور نیک انسان وہ ہے جو سست رفتاری پر قناعت کرے۔ اطباء کی طبیعتوں پر بھی اس جدید ایجاد کے خلاف ایسا تنفر تھا کہ انھوں نے فنی نقطۂ نظر سے اعلان کیا کہ انسانی اعصاب کے لیے دس میل سے زیادہ رفتار ناقابل برداشت ہے۔ باوجود مذکورۂ بالا قسم کے اعتراضات اور مخالفتوں کے نئی نئی ایجادات یکے بعد دیگرے پیش کی گئیں اور اپنی افادیت کے باعث

مقبول خاص و عام ہوئیں۔ انسان نے جب دیکھا کہ جدید اشیاء نے اس کی ضروریاتِ زندگی کے حصول میں سہولت پیدا کردی ہے اور ان کے استعمال سے وقت اور سعی کی کفایت کے ساتھ ساتھ فرصت کے خوشگوار گھڑیوں میں اضافہ ہوتا ہے تو اس نے پوری قوت کے ساتھ نئی نئی ایجادات کے لیے جد و جہد شروع کردی۔

عہد اور دَور پہلی ایجاد زمانۂ تاریخ سے بھی ہزار ہا سال پہلے ہوئی ہوگی لیکن ہم کو مصریوں اور چینیوں کی ایجادات کا بھی حال معلوم ہے۔ ارشمیدس کی ایجادات جو تین سو سال قبلِ مسیح پیش کی گئی تھیں آیندہ ایجادات کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ اسی طرح اٹھارھویں صدی تک یہ سلسلہ قایم رہا مگر یہ سب ایجادات کی تاریخ کے قدیم عہد سے متعلق ہیں ان ایجادات کا اثر انسانی زندگی، معاشرت اور سماج پر اتنا گہرا نہیں پڑا جیسا کہ بعد کی ایجادوں کا ہوا اثرات کے لحاظ سے اٹھارھویں صدی سے جدید عہدِ ایجادات کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس عہد کو سہولت کے لحاظ سے پانچ دَوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:-

۱۔ دُخانی دور

۲۔ فولاد کا دور

۳۔ کرگے کا دَور

۴۔ برقی دَور

۵۔ پرواز اور لاسلکی کا دَور

ادوار کی تقسیم سے متعلق اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ دراصل تاریخِ ایجادات میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے بلکہ ہر دَور میں بعض اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی کے لیے اَدوار قایم کیے جاتے ہیں جس طرح عام تاریخ میں پتھر کا زمانہ، دھاتوں کے زمانے سے ممیز طور پر علٰحدہ واقع نہیں ہے اسی طرح ایجادات کی تاریخ میں بھی ایک دَور اور دوسرے دَور میں کوئی امتیازی حدِ فاصل نہیں ہے۔ الغرض یہ دَور ایک دوسرے میں متداخل ہیں مگر ہر دَور میں ایک خاص ایجاد کا ایسا وسیع استعمال ہوا ہے جس کا اس دَور کی زندگی پر نمایاں اثر رہا ہے۔

بعض ایجادات کی تفصیل تو سوں میں کی گئی ہے مگر اس حصّے کو ترک کردینے سے مضمون کے تسلسل میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا۔

---

(۱)

دُخانی دَور

تمہید بھاپ کے مختلف کرشمے اب بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں، مگر جس وقت دُنیا نے حراری انجن اور برق پر قابو نہ پایا تھا، سارے کاروبار بھاپ ہی کی برکت سے چلتے تھے۔ دخانی کشتیوں اور دخانی جہازوں کے ذریعے بیرونی تجارت ہوتی تھی اور اندرونی تجارت اب بھی دخانی انجن ہی کی ممنونِ احسان ہے۔ بھاپ سے تو قدیم یونانی اور مصری بھی واقف تھے۔ اس کو وہ ایک عجیب و غریب چیز سمجھتے تھے اور اس پر انھوں نے چند تجربات بھی کیے تھے، مگر ان کی کوششوں کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں بھاپ پر عملی تسلط حاصل کرنے کی کوئی خاص ضرورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ طلب و رسد کا قانون ہمیشہ سے دُنیا میں جاری ہے اور جب تک ضروریاتِ زمانہ کا دباؤ نہ پڑا کوئی ایجاد پیش نہیں کی جا سکی۔

ابتدائی کوششیں ورسٹر کے نواب نے سترھویں صدی میں بھاپ پر چند تجربے کیے جس کا عملی نتیجہ انھوں نے اپنی تالیف کے ذریعے ۱۶۶۳ء میں پیش کیا۔ موصوف نے بھاپ کے استعمال سے پانی کو اُوپر چڑھانے کی پہلی کامیاب کوشش کی (ایک بڑے بند برتن میں دو نلیاں لگائی گئیں، ان نلیوں پر صمام یا کھلندن تھے جو پانی کو صرف ایک طرف گذرنے دیتے تھے۔ اندر کھلنے والی نلی کا دوسرا سرا باؤلی میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور باہر کھلنے والی نلی کو ایک ٹوٹی لگا دی گئی تھی۔ اس بڑے برتن میں بھاپ گذاری جاتی اور جب برتن بھاپ سے اچھی طرح بھر جاتا اس کو فوراً ٹھنڈا کر دیا جاتا۔ بھاپ ٹھنڈی ہو کر تھوڑے سے پانی کی صورت میں مُبدّل ہو جاتی۔ اس طرح جو خلا پیدا ہوتا اس کو بھرنے کے لیے باؤلی کا پانی اُوپر چڑھ آتا اور برتن کو بھر دیتا۔ اب پھر برتن میں بھاپ گذاری جاتی جس کے دباؤ کی وجہ سے پانی دوسری نلی سے باہر آ جاتا)۔

ورسٹر کی یہ ایجاد ہمارے موجودہ مفہوم کے اعتبار سے دخانی نہ تھی کیوں کہ اس میں بھاپ کے

پھیلاؤ کی قوت کا استعمال نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کا عمل ہوا کے دباؤ پر منحصر تھا۔ یہ ایجاد بہت مقبول ہوئی کیوں کہ اس سے ایک بڑی صنعتی ضرورت کی تکمیل ہوئی۔ کوئلے کی کانوں میں سطح سے تھوڑی ہی گہرائی پر پانی جمع ہو جاتا تھا، اور اس میں سے مزید کوئلہ نکالنا ممکن نہ ہوتا تھا، اس ایجاد کی بدولت پانی کی نکاسی آسانی سے ہونے لگی چنانچہ ایک صدی تک ورسٹر کی اس ایجاد کا وسیع استعمال ہوتا رہا۔ البتہ مختلف موقعوں پر حسب ضرورت اس کی کچھ ترمیم ہوئی۔ سیوری نے ۱۶۹۸ء میں اور نیوکامن نے ۱۷۰۵ء میں مناسب ترمیم کے ساتھ کچھ اضافے بھی کیے۔ ایک عرصۂ دراز تک نیوکامن کے انجن کانوں سے پانی کے اخراج کے لیے استعمال ہوتے رہے۔ واٹ نے جو دخانی انجن ایجاد کیا وہ دراصل اسی قسم کی ایک مشن کی مرمت اور ترمیم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

جیمس واٹ

واٹ ایک تاجر کا لڑکا تھا جسمانی کمزوری کی وجہ سے والدین نے اس کو مدرسہ نہیں بھیجا بلکہ گھر پر ہی تعلیم کا انتظام کیا۔ جب بڑا ہوا تو ریاضیاتی اور سائنسی آلے بنا کر اپنی روزی کمانے لگا۔ اس کام میں اس نے اتنی شہرت حاصل کی کہ جامعہ گلاسگو میں آلات کی مرمت اور ساخت کے لیے متعین کیا گیا جہاں اس کے تحت ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی تھا۔ جامعہ کے دارالتجربے میں نیوکامن کے انجن کا ایک نمونہ تھا جس میں کچھ خرابی آگئی تھی، مرمت کے لیے واٹ کے پاس بھیجا گیا اگرچہ یہ کام اس کے فرائض سے زاید تھا اور وہ اس فن سے چنداں واقف بھی نہ تھا مگر وہ اس کو درست کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے اس مشین کی خرابیوں پر غور کیا، اور ارادہ کیا کہ ان نقائص کو دور کرکے اس کو زیادہ مفید بنائے گا۔

نیوکامن کے انجن میں ایک ہی برتن استعمال کیا جاتا تھا، اس کو ہر مرتبہ ٹھنڈا کیا جاتا تھا اور پھر اس میں بھاپ گذاری جاتی تھی۔ اس طرح حرارت کی ایک بڑی مقدار ضائع ہو جاتی تھی چنانچہ اس نے معلوم کیا کہ صرف (۲۵) فیصدی (یعنے ایک ربع) حرارت مفید کام انجام دیتی ہے اور (۷۵) فیصدی حرارت ٹھنڈے برتن کو پھر گرم کرنے میں ضائع ہوتی تھی۔

اس نے پہلی ترمیم یہ کی کہ بجائے ایک بڑے برتن کے دو استعمال کیے جن میں سے ایک صرف بھاپ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ علاوہ ازیں اس نے دوسرے برتن کی گرمی کو محفوظ رکھنے کی بھی چند عملی تدابیر اختیار کیں۔

دوسری ترمیم صماموں کے ایسے منظم استعمال پر مشتمل تھی جس کی وجہ سے بھاپ دونوں رخوں پر دباؤ ڈال کر متحرک حصے سے ٹکراتی تھی اس طرح دونوں سمتوں میں مفید عملی حرکت ہونے لگی۔ حاکم (گورنر) کے

استعمال سے انجن کی رفتار پر قابو حاصل ہوا اب تک جتنے انجن ایجاد ہوئے ان سے صرف اوپر نیچے کی حرکت حاصل ہوتی تھی۔ واٹ نے سلاخ اور پہیے کے استعمال سے اس حرکت کو دوری حرکت میں تبدیل کیا۔ اس اہم تبدیلی کی وجہ سے جو انجن پہلے صرف پانی نکالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا وہ اب دوسرے کاموں کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

مرڈاک کی ایجاد

واضح رہے کہ اس وقت تک بھاپ کی مدد سے کام کرنے والے جو انجن پیش کیے گئے وہ استادہ انجن تھے جو ایک جگہ قائم رہ کر پانی کا اخراج کیا کرتے تھے۔ اب تک بھاپ سے حرکت کرنے والی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ سنہ [illegible]ء میں واٹ کی ملاقات مرڈاک سے ہوئی۔ مرڈاک نے کئی ایجادات پیش کیں مگر بدقسمتی سے اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اس کی ایک مشہور ایجاد جلنے والی گیس ہے جو برقی روشنی سے پہلے عام طور پر استعمال کی جاتی رہی اور اب بھی ریل کے ڈبوں میں بکثرت استعمال کی جاتی ہے۔ مرڈاک کو بھاپ کی مدد سے چلنے والی گاڑی بنانے کا خیال ہوا کئی سال کی خاموش اور خفیہ کوشش کے بعد اس نے ایک تین پہیوں کی گاڑی بنائی جس کا اگلا پہیہ سمت بدلنے کے لیے تھا۔ اس نے گاڑی میں پانی کا ایک برتن بنایا اور اس کے نیچے آگ رکھنے کا انتظام کیا۔ اندھیری رات میں جب اس نے خیال کیا کہ کوئی سڑک پر نہ ہوگا اس نے پہلی مرتبہ اپنی اس سواری کی آزمائش کی۔ اتفاق سے اس قصبے کا پادری ادھر سے گذر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اندھیری رات میں سڑک پر شعلے اچھالتے ہوئے ایک چیز آگے بڑھ رہی ہے تو وہ بہت گھبرایا اور ادبدا کر تیز تیز گھر کا رخ کیا اور دوسرے دن گرجا میں اس واقعے کو وجودِ شیطان کے ثبوت میں پیش کیا۔ مرڈاک پھر اس گاڑی کو باہر لانے کی ہمت نہ کر سکا۔ البتہ اس نے واٹ اور چند دیگر احباب سے اپنی اس ایجاد کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس کی قدر کی اور اس میں کچھ ترمیم و اضافے بھی کیے۔

اس زمانے میں کوئلوں کی کان سے گودام تک کوئلہ پہنچانے کے لیے گھوڑے بڑی بڑی واگنوں میں جوتے جاتے تھے۔ ان وزنی گاڑیوں سے سڑکیں بہت جلد خراب ہو جاتی تھیں۔ اس لیے راہِ آہن تیار کی گئی یعنے لوہے کی پٹریاں بچھا دی گئیں۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پٹری کا استعمال نہایت ہی قدیم ہے چنانچہ اہلِ روما نے بھی سڑکوں پر اس کا استعمال کیا ہے۔ ان پٹریوں سے ایک تو سڑک خراب ہونے سے محفوظ ہو گئی اور دوسرے گھوڑوں پر بھی واگن کھینچنے کا بار کم ہو گیا۔ پٹری کے یہ راستے عوام کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے چنانچہ کچھ اجرت دے کر ہر شخص اپنی گاڑی اس راہ سے لے جا سکتا تھا۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں مرڈاک کے ایک شاگرد نے پہلی مرتبہ بھاپ کی گاڑی کو آہنی راہ پر چلایا۔ اس پر اس کا خوب مضحکہ اڑایا گیا۔ بوڑھوں نے اس حماقت پر وعظ کہہ ڈالے اور پادریوں نے اس کو شیطانی کارنامہ قرار دیا۔ بہرحال ہر طرف سے لعنت ملامت ہونے لگی اور بہت کم ایسے تھے جو یہ تصور کر سکے کہ یہ چیز ایک بڑی ایجاد کا

پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ پھر بھی بعض بیرونی حالات ایسے پیش آئے جس کے باعث اس سلسلے میں کوشش ناگزیر پائی گئی۔

جب نپولین کی جنگوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا تو سارے گھوڑے میدانِ جنگ کے لیے مخصوص ہو گئے، صرف ٹٹوؤں اور خچروں سے بار برداری کا کام لیا جا سکتا تھا جو گھوڑوں کے برابر کام تو نہ کر سکتے تھے مگر خوراک میں ضرور ہم پلّہ تھے۔ جنگ کی ضروریات کے تحت دانہ چارہ بہت مہنگا ہو گیا۔ کانوں اور کارخانوں کے مالکوں نے سوچا کہ کسی طرح ایسی کل ایجاد کی جائے جس سے گاڑیاں چلائی جا سکیں، کیوں کہ کوئلے اور پانی کی کوئی کمی نہیں تھی، البتہ دانے چارے کی غیر معمولی قلّت تھی۔

بلاکٹ ایک کان کا مالک تھا، اس کا گودام کان سے چھ میل کے فاصلے پر تھا، اس نے مرڈاک کی بھاپ گاڑی کا حال تو سنا ہی تھا لگا خود اس پر تجربے کرنے۔ کوئی دس سال کی کوششوں اور متعدد ناکامیوں کے بعد اس نے دو بڑی بڑی بھاپ گاڑیاں بنائیں جو اب تک لندن کے عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ یہ نہایت ہی بھدّے اور عجیب و غریب نمونے ہیں۔ ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے، مگر یہ واضح رہے کہ یہی گاڑیاں ریلوے انجن کی پیش رو ہیں جس کو ۱۸۱۸ء میں جارج اسٹیفن سن نے ایجاد کیا۔

اسٹیفن سن

اسٹیفن سن ایک ایسی جھونپڑی میں پیدا ہوا جس کے سامنے سے بلاکٹ کی بھاپ گاڑی گذرتی تھی۔ بچپن سے اس کے کان اس کی مہیب آوازوں کے عادی ہو گئے تھے۔ بڑا ہوا تو اسی کان میں ملازم ہوا۔ سترہ سال کی عمر تک اس کی کوئی تعلیم نہ ہو سکی جب اس نے محسوس کیا کہ بغیر لکھے پڑھے ترقی ممکن ہی نہیں تو اس نے مستعدی کے ساتھ تحصیل شروع کی۔ مشاہدہ اور حافظہ دونوں قوی تھے انجن اور اس کے متعلقات کو غور سے دیکھا کرتا تھا اور اس کے تمام حرکات اور پرزوں کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کو محسوس ہوا کہ اس انجن میں کچھ نقائص ہیں جن کو دور کرنے سے کارکردگی میں اضافہ ہو گا۔ اس عرصے میں اس نے ترقی کی اور ایک دوسری کان میں ملازم ہو گیا جہاں اس کو لارڈ رینسورتھ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ نئے مالک نے جب اسٹیفن سن کے خیالات معلوم کیے تو ضروری رقم فراہم کر دی اور ۱۸۱۴ء میں اس نے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ اس نے مناسب ترمیم اور اضافوں کے ساتھ ریلوے انجن بنایا۔ اب تک یہ گاڑیاں صرف بار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ یہ اس قدر ہلتی تھیں کہ سوائے کوئلے کے اور کوئی چیز ان میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، مگر اسٹیفن کے ریلوے انجن میں یہ خرابی نہ تھی۔

انگلستان کے شمال مشرقی حصے میں معاشی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہوا کہ وہاں تیز رفتار سواری کی حقیقی طلب پیدا ہو چکی تھی اس لیے یہ خیال پیدا ہوا کہ مشہور تجارتی مقامات اسٹاکٹن اور ڈارلنگٹن کے درمیان ریل گاڑی چلائی جائے ابتداء میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ پارلیمان نے تیز سواریوں پر حد و دعاید کر دیے تھے اور بہت سے ارکان نہ تو ریل گاڑی پر اعتماد رکھتے تھے اور نہ اس کو مفید سمجھتے تھے۔ بڑی دقتوں سے جب یہ موانعات دور کیے گئے تو ۱۸۲۵ء میں ان دونوں تجارتی مقامات میں ریل کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

پہلا دن اسٹیفن سن کے لیے عجیب معرکے کا تھا پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے دونوں اسٹیشنوں پر غیر معمولی مجمع تھا، اور درمیان میں بھی دونوں کناروں پر سب لوگ اس نئی ایجاد کے منتظر تھے ایک طرف اطبا اپنی اس رائے کا اظہار کر رہے تھے کہ دس میل سے زیادہ رفتار انسانی اعصاب کے لیے ناقابل برداشت ہے تو دوسری طرف عوام کو خواہ مخواہ بھی اس کی ناکامی کا یقین تھا، اور آئے بھی اس غرض سے تھے کہ مضحکہ اڑانے کا ایک اچھا موقع ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے مگر اسٹیفن سن اپنی دھن کا پکا تھا اس نے پورے اہتمام کے ساتھ پیش بینی کی اور تمام ضروریات سے لیس ہو کر ٹھیک وقت پر روانہ ہوا کئی ڈبے کوئلے اور آٹے سے بھرے ہوئے تھے اور دو ڈبے مسافروں کے لیے محفوظ تھے۔ نظام العمل کے مطابق صرف ایک جگہ پانی لینے کے لیے ٹھیرنا پڑا اوسط رفتار (۸) میل رہی جو بعض جگہ (۱۲) میل تک پہنچ جاتی تھی۔ اس طرح وقت مقررہ پر سفر ختم ہوا تو سارا ملک ششدر ہو کر رہ گیا۔

موجودہ ریلوے انجن، اسٹیفن سن کے انجن کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے مگر دونوں کے اصول اور عمل ایک ہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اس میں کچھ ترمیم اور اضافے ہوئے۔ وزن کے لحاظ سے آج کل کا صرف انجن اسٹیفن سن کی پوری ریل گاڑی کا ہم پلہ ہوتا ہے۔ رفتار کا یہ حال ہو گیا ہے کہ روزانہ اڈنبرا سے لندن تک راست چار سو میل کی دوڑ برسوں سے جاری ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اسٹیفن کی ایجاد کو سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا، اور ایک صدی میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے اتنی ترقی کوئی غیر معمولی چیز نہیں سمجھی جانی چاہیئے۔

برق پر قابو حاصل کرنے کے چند ہی سال بعد برقی ریل ایجاد ہوئی جو بعض خصوصیات میں دخانی انجن پر فوقیت رکھتی ہے مگر باوجود اس کے حالات بتا رہے ہیں کہ مستقبل بعید میں بھی دخانی انجن کا ترک کیا جانا ممکن نہیں۔ یہ ایک ایسی خوش وضع، مفید اور مکمل کل ہے جو ہمیشہ اپنے فیوض سے دُنیا کو مستفیض کرتی رہے گی۔

تربان ہم جانتے ہیں کہ بہتے ہوئے پانی میں خاص وضع کا پہیہ رکھا جائے تو پانی کی رَو اس کے چپٹے حصوں سے ٹکرا کر اس کو گھماتی ہے چنانچہ اس عمل سے پن چکیوں میں کام لیا جاتا رہا ہے۔ سر چارلس پارسنس نے

خیال کیا کہ اگر یہی کام بھاپ سے لیا جاسکے تو بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ دخانی انجن کی پیچیدہ ساخت بہت سے پُرزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی رگڑ کے باعث بہت سی توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر بھاپ کی ٹکر سے راست دَوری حرکت حاصل ہو سکے تو توانائی ضائع ہونے سے بچ رہے گی۔

پارسنس نہ صرف ایک کامیاب انجینیر تھا بلکہ ایک پیدائشی موجد و محقق بھی، یعنے فطرتاً وہ صحیح سائنسی تفکر کے لیے خاص موزونیت رکھتا تھا۔ اس کا باپ اَرل راس اپنے زمانے کی سب سے بڑی دُوربین کا موجد تھا۔ اس طرح بچپن ہی سے وہ تحقیق و ایجاد کی فضاء میں پلا۔ پارسنس نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں لگائی۔ ۱۸۸۴ء میں جب اس کی عمر صرف (۳۰) سال کی تھی اپنی حسب منشاء تربان بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کی یہ ایجاد اس کے نظریئے کے عملی پہلو کو واضح کرنے کے لیے کافی تھی مگر عملی دُنیا میں اس کو کامیاب بنانے کے لیے ترمیم کی ضرورت ہوئی۔ بدقسمتی سے بعض اختلافات کی وجہ سے پارسنس اپنی کمپنی سے مستعفی ہو گیا۔ سارے حقوق کمپنی اس کے حق میں محفوظ تھے اس لیے پارسنس کو مزید تحقیق کا موقع کئی سال تک نہ مل سکا۔ آخر کار ۱۸۹۱ء میں پہلی مرتبہ تربان ایک جہاز میں استعمال کیا گیا۔ باوجودیکہ تربان کا پہیہ نہایت تیز رفتار تھا مگر جہاز کی رفتار توقع سے بہت کم ثابت ہوئی۔ اس نقص کو رفع کرنے میں (۵) سال سے زیادہ صرف ہوئے اور آخر کار ۱۸۹۶ء میں جب جہازوں کا مقابلہ ہوا تو تربانی جہاز سب سے تیز رفتار ثابت ہوا۔ اس تجربے کے بعد سے اس کا شمار ہمارے بڑے بڑے تیز رفتار جہازوں میں ہونے لگا چنانچہ ۱۹۰۰ء میں برطانیہ کا سب سے بڑا جہاز "وکٹورین" جس میں تربان استعمال کیا گیا تھا پہلی مرتبہ بحر اطلانتک کو عبور کیا۔ "مارٹینیا" نے ۱۹۲۸ء میں نیویارک سے لندن تک کا فاصلہ صرف پانچ دن میں طے کیا۔

تکوین برق تربان کا زیادہ مفید استعمال برق کی پیدائش کے لیے کیا جاتا ہے۔ ہم آیندہ کسی باب میں تفصیل سے معلوم کریں گے کہ کس طرح مقناطیسی میدان میں حرکت سے برقی رَو پیدا ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر برق پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ حرکت نہایت ہی تیز ہو۔ تربان سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی کل نہیں اس لیے برق کی تکوین (پیدائش) کے لیے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ شہر حیدرآباد کے محکمہ برقی میں جو تربان استعمال کیا گیا ہے اس کی رفتار تین ہزار فی منٹ یعنے (۵۰) دَور فی ثانیہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ رفتار کے تربان بھی بنائے جاچکے ہیں جن سے بڑے بڑے جہازوں میں کام لیا جاتا ہے۔ جدید وضع کے جہاز میں تربان کی حرکت سے راست فایدہ نہیں اُٹھایا جاتا بلکہ تربان کی گردش سے ڈائنمو (برق پیدا کرنے والی کلیں) چلائے جاتے ہیں اور اس برقی قوت سے جہاز چلائے جاتے ہیں۔ پی اینڈ او کمپنی کا مشہور اور عظیم الشان جہاز "وائسرائے ہند" اسی قسم کا تربانی برقی جہاز ہے۔ برطانیہ کا عظیم الشان جہاز "ملکہ میری" بھی اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔

(۲)

فولاد کا دَور

تمہید زمانۂ گذشتہ کی ایجادات کے اولین نمونے اپنی تاریخی اہمیت کے لحاظ سے نمایش گاہوں میں محفوظ رکھے گئے ہیں اُسی قسم کی موجودہ کلوں سے مقابلہ کیجیئے تو ان کا بھدّا پن مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اگلے موجدین اور صنّاعوں کو قدیم وضع کے آلوں سے کام لینا پڑتا تھا مثلاً دیہاتی لوہار کے بھدّے آلے، کھلی بھٹّی اور بھتّہ، ایرن اور ہتوڑیاں اور خام لوہا جو ملوث ہوتا تھا۔ سلاخوں کو گول بنانے اور پٹریوں میں سُوراخ ڈالنے کے لیے بھی نہایت ہی معمولی درجے کے آلے تھے۔ مگر کلوں کو بڑے بڑے پُرزے تو ڈھالنے ہی پڑتے تھے جن کو لوہار اپنی دستکاری سے آخری صورت بخشتا تھا۔ الغرض ۱۸۲۰ء تک صحیح پیمایش اور پیمایشی آلات تک رسائی حاصل نہ ہوسکی تھی جن کے بدون سائنسی ایجادات وجود میں نہ آسکے۔

سائنسی ایجادات اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ سائنسی ایجادات سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے ایسی ایجادات مراد ہیں جن کو سائنس سے تعلّق ہو۔ "سائنس" کے لفظی معنے "علم" کے ہیں، مگر یاد رہے کہ ہر قسم کے علم پر سائنس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ بے ترتیب معلومات کی ایک بڑی مقدار کو سائنس کہنا درست نہیں اور نہ بڑے بڑے مشکل ناموں سے واقف ہونا سائنس ہے۔ سائنس دراصل صحیح، ٹھیک اور منظم معلومات کا نام ہے۔ اور چونکہ سائنسی معلومات نہایت ٹھیک اور صحیح ہوتے ہیں اس لیے پیمایش میں انتہائی صحت کی ضرورت ہوتی ہے۔

صحیح اور معیاری پیمایش معمولی حالات میں کسی چیز کے طول یا دَور کی پیمایش میں ہمارا پیمانہ تقریبی ہوتا ہے۔ مثلاً مکان کی چھت کے لیے ۱۵ فٹ کی نالیں بنوائی جائیں تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بالکل ۱۵ ہی فٹ کی ہوں۔ ایک آدھ انچ کی کمی یا زیادتی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ مگر جب کلوں اور مشینوں کے پُرزوں کی تیاری کا سوال ہوتا ہے تو ایسے تقریبی پیمایشات سے کام نہیں چل سکتا۔ ان کے لیے

نہایت صحیح پیمائشات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زمانے میں جب کہ تقسیم کار کا اصول عملی دنیا میں مسلّم ہو چکا ہے اور مختلف پرزے مختلف کارخانوں میں بنائے جاتے ہیں۔ پیمائش میں انتہائی صحت ضروری ہو گئی ہے۔

پہلے یہ حال تھا کہ ہر پیچ اور نٹ پر ایک ہی قسم کے نشان لگا دیے جاتے تھے تاکہ مشین کھولنے کے بعد لگانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اگر اتفاقاً ایک کھو جاتا تو اس کے ساتھ دوسرا ملنا محال ہوتا۔ ان دقتوں پر غالب آنے کے لیے صحیح پیمائشات کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں ماڈسلے کا نام بہت اہم ہے کیوں کہ اس نے پہلی مرتبہ ایسے پیچ اور نٹ بنائے جو نہایت صحیح پیمائش کے تھے۔ اس زمانے میں تمام نٹ اور پیچ اس قدر معیاری ہو گئے ہیں کہ ان میں $\frac{1}{10000}$ انچ سے بھی کم فرق ہوتا ہے۔ برطانوی ہوائی جہاز آر ۱۰۱ کی تعمیر میں صحت پیمائش کا انتہائی کمال ظاہر ہوا۔ اس جہاز کا طول ۷۰۰ فٹ تھا اور اس کا سارا ڈھانچہ کئی میل لمبی فولادی نلیوں پر مشتمل تھا۔ لچکدار فولاد کی سلاخوں کو احتیاط سے جوڑ کر ۴۵ فٹ لمبی نلیاں بنائی گئیں۔ جہاز کارخانے سے کئی میل کے فاصلے پر بنایا جا رہا تھا اور ضرورت تھی کہ ساری نلیاں بالکل ایک ہی ناپ کی ہوں۔ ہزارہا نلیاں بنائی گئیں اور انتہائی صحت و نزاکت کے ساتھ پیمائش کی گئی اور معلوم ہوا کہ انتہائی فرق $\frac{3}{10000}$ انچ سے بھی کم ہے یعنی ۴۵ فٹ کے طول میں معمولی کارڈ کی موٹائی کے برابر۔

خام مادہ

ابتدائی انیسویں صدی میں موجدین اور صناع معمولی لوہا استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ فولاد بہت کم یاب اور گراں تھا اس لیے اس کا وسیع استعمال ممکن نہ تھا غور کرنے سے واضح ہوگا کہ حرکت کرنے والی کلوں کے پرزوں پر جو غیر معمولی بار اور دباؤ پڑتا ہے وہ معمولی لوہے کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی زمانے میں اکثر ریل گاڑی کے پہیئے اور پٹریاں ٹوٹ جانے سے حادثے پیش آئے۔ جہاں ایجادات کے متعلق نئے خیالات پیدا ہوئے وہاں زیادہ پائیدار دھات کی تلاش بھی جاری رہی۔ ان کوششوں کا نتیجہ فولاد کی صنعت کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے ساری صنعتی دنیا میں ایک تازہ روح پھونک دی۔

فولاد

ساری تاریخ ایجادات میں فولاد سے زیادہ وسیع استعمال کی کوئی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔ اطراف و اکناف کی مختلف چیزوں پر نظر ڈالنے سے اس کے کثرتِ استعمال کا خود اندازہ

ہو جاتا ہے۔ چھری۔ چاقو سے بندوق اور توپوں تک ایک طویل فہرست بنائی جاسکتی ہے بسکٹ کے ڈبے جیسی معمولی چیز سے لے کر عظیم الشان جنگی جہاز تک ہزارہا چیزیں فولاد ہی کی رہین منت ہیں۔ ہر طرف فولاد کے بنے ہوئے پل۔ سرنگیں۔ نلوے اور ریل گاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ گھڑیال کی بال کمان فولاد ہی کی ہے اور شہر نیویارک میں لارکن کی ایک سو دس منزلہ عمارت بھی فولاد ہی کی بنی ہوئی ہے۔ فولاد کی ہزارہا قسمیں تیار کی گئی ہیں۔ ایک قسم ایسی نرم ہے کہ اس کو صرف دو انگلیوں سے موڑا جاسکتا ہے۔ دوسری انتہائی سخت جس کو کوئی چیز کاٹ نہیں سکتی۔ ایک قسم ایسی کہ اس سے مختلف وضع کی اشیا، ڈھالیں۔ ایک ایسی کہ اس کو پیٹ کر پتلی تختیاں بنالیں، اور ایک ایسی جو پتھر سے بھی زیادہ مضبوط اور پائدار ہے۔

یہ عجیب و غریب شئے لوہے سے حاصل کی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ زمین میں لوہے کا خزانہ پھیلا دیا ہے، جو دنیا کے ہر حصے میں دستیاب ہوسکتا ہے۔ خام لوہے میں بہت سے لوث ہوتے ہیں، خصوصاً کاربن ضرور شامل ہوتا ہے۔ فولاد بنانے کے لیے پہلے خام لوہے کو تمام لوثوں سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ جب خالص لوہا حاصل ہو جائے تو خاص تناسب میں کاربن پھر شریک کرنا پڑتا ہے۔ لوہے کو صاف کرنے کے لیے بلاسٹ بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں وہ ایک بڑی تپش پر پگھل جاتا ہے اور اس حالت میں اس کو علیحدہ کر کے ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

بھٹی معمولی بھٹی کے ذریعے بلند تپش تک گرم کرنا ممکن نہیں اس لیے بلاسٹ بھٹی (جھکڑ بھٹی) ایجاد کی گئی۔ یہ بھٹی بھی جدید ایجادات کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ آبادی سے بہت دور بڑے بڑے فولادی مینار ہوتے ہیں جن میں سے دن بھر دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جو شب کو آتش فشاں پہاڑ کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ ٹرالیوں کے ذریعے خام لوہا مینار کے اوپری حصے میں ڈالا جاتا ہے۔ اندر کی بے پناہ تپش اس لوہے کو سرخ و سیال بنا دیتی ہے۔ صاف لوہے کا یہ بہتا ہوا دریا بڑے بڑے خانوں میں جاگرتا ہے اور ٹھنڈا ہو کر منجمد ہو جاتا ہے۔ اس طرح حاصل کیا ہوا خالص لوہا نرم ہوتا ہے۔ اس میں بہ لحاظ ضرورت سختی پیدا کرنے کے لیے کاربن کی آمیزش ضروری ہے۔ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر چاروں طرف خالص کاربن کی تہ جما دی جاتی ہے اور یہ سب ایک خاص قسم کی بھٹی میں رکھے جاتے ہیں جہاں ایک ہفتے تک ان کو ایک ایسی خاص تپش پر رکھا جاتا ہے کہ لوہا پگھلنے نہیں پاتا بلکہ کاربن سے اس کی آمیزش ہو جاتی ہے اور سطح پر آبلے سے نظر آنے ہیں جس کی وجہ سے یہ آبلہ دار فولاد کہلاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ لوہا پگھلتا نہیں پھر بھی کاربن کو جذب

کرلیتا ہے مگر یہ انجذاب متجانس نہیں ہوتا سطح کے قریب کے حصّے میں کاربن کی زیادہ مقدار جذب ہوتی ہے اور اندرونی حصّے میں بہت کم ایک ہی قسم کا متجانس فولاد تیار کرنے کے لیے اس پر اور کئی عمل کرنے پڑتے ہیں۔ ان عملوں کے دوران میں مختلف قسم کے فولاد کے لیے مختلف دھاتیں شریک کی جاتی ہیں تاکہ ضروری خاصیت پیدا ہو جائے۔ تجربوں سے معلوم کیا گیا کہ کم یاب دھاتیں مثلاً کرومیم۔ ٹنگسٹن۔ نکل۔ الیمونیم وغیرہ فولاد میں مخصوص خاصیتیں پیدا کرتی ہیں اس طرح فولاد کی صدہا قسمیں وجود میں آئیں۔

مذکورۂ بالا پیچیدہ طریقے سے جو فولاد تیار ہوتا تھا وہ دُنیا کی بڑھتی ہوئی ضرریات کے لیے بالکل ناکافی تھا۔ سر ہنری بے سیمر نے ایک نیا طریقہ معلوم کیا جس کی وجہ سے ہر سال (۱۰) کروڑ ٹن فولاد تیار ہوتا ہے۔ اس انکشاف کی وجہ سے صنعتی دُنیا میں ایک نیا انقلاب ہوا، اور جدید فولادی دَور شروع ہوا جس سے فولاد کے وسیع استعمال سے ہماری زندگی کے مختلف شعبے متاثر ہوئے۔

بے سیمر کا باپ ایک فرانسیسی حُسن کار تھا جو انگلستان میں مقیم ہو گیا تھا نپولین نے فرانس میں اعلان کیا کہ بندوق کے لیے عمدہ لوہے یا فولاد کی ایجاد کرنے والے کو وہ ایک بیش بہا انعام دے گا۔ اس زمانے میں بندوقوں اور توپوں کے لیے جو دھات استعمال ہوتی تھی وہ اس قدر کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہوتی تھی کہ بعض اوقات بندوقیں اور توپیں پھٹ کر جانی نقصان کا باعث ہوتی تھیں۔ نپولین چاہتا تھا کہ بہتر دھات ایجاد کی جائے تاکہ وہ اپنی فوج کشی زیادہ سہولت کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ دراصل اس کا اعلان ہی بے سیمر کو اس ایجاد کی طرف مائل کیا۔ ابتدا میں اس نے ایک فولادی بندوق تیار کی اور فرانس جا کر نپولین کے نذر کی۔ شہنشاہ نے اس کے لیے ایک کارخانہ قائم کرنے میں مدد دی جہاں بے سیمر نے بڑے پیمانے پر فولاد تیار کرنے کے لیے کئی تجربے کیے۔

بعض ایجادات محض حُسنِ اتفاق سے وجود میں آئے چنانچہ بے سیمر کی ایجاد بھی اس کی ایک مثال ہے۔ بے سیمر کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ خام لوہے کو خوب گرم کیا جائے اور اس میں گرم ہوا کی رَو گذاری جائے تو ممکن ہے کہ لوہے کے لوث اس گرم ہوا سے جل جائیں اور خالص لوہا حاصل ہو۔ پھر اس میں حسب ضرورت کاربن ملا کر عمدہ قسم کی فولاد حاصل کی جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۵ء میں بے سیمر نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی حاصل کی، چند ہی دنوں میں وہ بڑے پیمانے پر عمدہ فولاد تیار کرنے لگا حُسنِ اتفاق سے اس نے جو خام لوہا خریدا وہ بھی اس تجربے کے لیے خاص طور پر موزوں ثابت ہوا۔ اس زمانے میں دھاتوں کا علم

اس قدر باقاعدہ نہ تھا اس وجہ سے خام لوہے کے مختلف نمونوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر بےسیمر کو یہ خاص قسم کا خام لوہا حسنِ اتفاق سے نہ ملتا تو معمولی خام لوہے سے اس کو مایوس ہونا پڑتا کیوں کہ اُس پر یہ عمل کارگر نہیں ہوتا۔

۱۸۵۶ء میں بےسیمر نے اپنے طریقے کو رجسٹر کروالیا۔ یورپ کے پانچ بڑے بڑے کارخانوں کے مالکوں نے ایک ایک لاکھ روپیہ دے کر بےسیمری طریقے سے فولاد بنانے کی اجازت حاصل کی۔ اس طرح بےسیمر کا شمار ان چند سائنسی موجدوں میں ہونے لگا جن کے لیے اپنی ایجاد سے حینِ حیات دولت اور شہرت پانا مقدر کیا گیا تھا۔

دو ماہ بعد ہی بےسیمر کو کارخانوں سے خطوط وصول ہوئے کہ اس کے طریقے سے جو فولاد تیار کیا گیا وہ محض بےکار ہے۔ یہ بہت پریشان ہو کر وہاں پہنچا اور دیکھا کہ نہایت ہی ناقص فولاد کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے پاس کا خام لوہا منگوایا اور ان سب کے سامنے فولاد تیار کیا، یہ نہایت ہی اچھا اور مضبوط نمونہ تھا۔ اب بےسیمر کو یقین ہو گیا کہ خام لوہے کی قسمیں بھی مختلف ہوتی ہیں کیمیا دانوں کی مدد سے اس نے معلوم کیا کہ عام طور پر جو خام لوہا ملتا ہے اس میں فاسفورس اور گندک بھی خفیف سی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اور ان لوثوں کے باعث عمدہ فولاد نہیں بن سکتا۔ اس کے پاس جو خام لوہا آ گیا تھا وہ اتفاق سے ان دونوں لوثوں سے پاک تھا اس وجہ سے اس کو کامیابی ہوئی۔ کیمیا دانوں کی مدد سے اس نے خام لوہے سے فاسفورس اور گندک دُور کرنے کا طریقہ معلوم کیا اور اس طرح اس کی تحقیقات مکمل ہوئی۔

دو سال بعد ان کارخانوں میں فولاد کی غیر معمولی مقدار تیار ہونے لگی۔ صنعتی دنیا میں اس دیرپا اور مضبوط دھات کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ بجائے معمولی لوہے کے فولاد کا استعمال وسیع طور پر ہونے لگا۔ ریل کی پٹریاں اور انجن وغیرہ فولاد ہی کے بنائے جانے لگے۔ اگرچہ کہ اس کی قیمت معمولی لوہے کی بہ نسبت دوگنی تھی، مگر دیرپا اور مضبوط ہونے میں یہ دس گنا بہتر ثابت ہوئی۔ جب مانگ کروڑ ہا ٹن تک بڑھ گئی تو کئی بڑے بڑے کارخانے کھولنے پڑے۔ بےسیمر نے صنعتی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جس کی وجہ سے اس کا نام صنعتی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہیگا۔ بےسیمر ان چند خوش نصیب موجدوں میں سے تھا جن کی قدر ان کی زندگی ہی میں کی گئی۔ اس نے اپنی ایجاد کے صلہ میں ایک کروڑ روپیہ پائے۔

بےسیمر نے یہ ایجاد ۱۸۵۶ء میں پیش کی تھی۔ اس طریقے کے مطابق یہ ضروری تھا کہ خام لوہا

فاسفورس اور گندک سے بالکل پاک ہو۔ اُس خام لوہے کی غیر معمولی مقدار جس میں فاسفورس اور گندک کے لوث پائے جاتے تھے اب تک بے مصرف تھے ۱۸۷۸ء میں ٹامس اور گلکرسٹ نے ایک ایسی ترمیم پیش کی جس کے باعث غیر خالص خام لوہا بھی فولاد بنانے کے کام آنے لگا بھٹی کی دیواروں پر ایک خاص قسم کی مٹی کا دَل لیپ دیا جاتا تھا، خام لوہے کا فاسفورس اور گندک اس سے ترکیب کھا جاتے اور لوہا ان سے پاک ہو جاتا تھا۔ فاسفورس اور گندک کے مرکبات علحدہ کر لئے جاتے تھے جو بطور کھاد کے بہت مفید ثابت ہوئے۔

صنعت فولاد کی ترقی کے سلسلے میں کارل سیمنس کا کام بہت مفید ثابت ہوا۔ یہ جرمنی باشندہ انگلستان میں آکر بس گیا تھا، اس کے کارنامے صنعت کے مختلف شعبوں میں کافی اہمیت رکھتے ہیں حرارت اور فلزیات میں اس نے جو تجربے کئے اس کے نتائج آج تک رہبری کرتے ہیں۔ وہ برقیات کا بھی ماہر تھا۔ چنانچہ سمندر میں تار دکیبل، بچھانے کے کام کی ابتدا اسی نے کی تھی اس نے برقی تپش پیما بھی ایجاد کیا۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ "بازآتشیں بھٹی" کی ایجاد تھی۔ ان ایجادات کے صلہ میں اس کو شاہ انگلستان نے ۱۸۸۳ء میں "سر" کا خطاب عطا فرمایا۔

"بازآتشیں بھٹی" میں کئی چھوٹی بھٹیوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ درمیانی بھٹی گرم گیسوں کو اطراف میں پھیلاتی ہے۔ پھر یہ گیس ادھر سے اُدھر اس طریقے سے متحرک کی جاتی ہیں کہ ان کے اثر سے بہت بلند تپش حاصل ہوتی ہے۔ اس ایجاد سے ایک ایسا طریقہ ہاتھ آیا جس کی مدد سے بعض ایسی دھاتیں پگھلائی جانے لگیں جو ناقابل گداخت سمجھی جاتی تھیں۔ اگرچہ سیمنس نے تو اس طریقے کو شیشہ سازی کی صنعت کے لئے استعمال کیا تھا مگر یہ اس قدر مفید ثابت ہوا کہ فولاد سازی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔

صنعتی کارخانوں میں بعض ناکارہ چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے لئے یہ مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے کہ ان ناکارہ چیزوں کا کوئی مصرف تلاش کریں۔ اُن دنوں میں بے سیمری کارخانوں میں فولاد کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور باریک ریزوں کے انبار لگ گئے تھے۔ سب پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ اس ناکارہ مادّے سے کسی طرح چھٹکارا مل جائے۔ جب سیمنس کی بھٹی ایجاد ہوئی تو اس کی تپش بے سیمری فولاد کو پگھلانے کے لئے بھی کافی ثابت ہوئی۔ اس طرح یہ بے کار انبار مفید دھات کی شکل میں منتقل ہو گئے۔ (باقی)

موضع دوپلی کی معاشی تحقیق

از

جناب محمد ناصر علی صاحب ۔ ایم۔اے (عثمانیہ)

مقدمہ

موضع دوپلی تعلقہ بودھن ضلع نظام آباد صوبہ میدک سمت تلنگانہ، ایک قدیم آبادی ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ ہیں ان برجوں سے ہو سکتا ہے جو اس وقت منہدم[1] صورت میں وہاں موجود ہیں۔ یہ موضع مستقر بودھن اور ضلع نظام آباد کے تقریباً درمیان واقع ہے۔ ہر دو مقامات سے اس کی مسافت تقریباً (۹) میل ہے بس اسٹیج پوچارم سے اس کا فاصلہ تقریباً (۲) میل ہے۔

اس موضع کے شمال میں موضع کلبا پور، جنوب میں پوچارم و چینا پور، مشرق میں جانکم پیٹھ وا آباپور اور مغرب میں رنجل و برہمن پلی واقع ہیں۔

اس کا جملہ رقبہ (۳۰۲۵) مربع میل ہے۔ ۱۳۴۷ف (م اکتوبر ۱۹۳۷-۳۸ء) کی مردم شماری[2] کے مطابق یہاں کی آبادی (۱۱۵۴) نفوس پر مشتمل ہے۔

آئندہ فصلوں میں ہم موضع ہذا کے معاشی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بتائینگے کہ یہاں کے باشندے کس معیار پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر معیار زندگی ادنیٰ ہے تو یہ دریافت کرینگے کہ آخر اس ادنیٰ معیار کے کیا وجوہ ہیں۔ بعد ازاں ان تدابیر پر غور کرینگے جن کے ذریعہ موجودہ معیار زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ گویا موجودہ مقالہ کا اصلی مقصد باشندگان موضع دوپلی کے ادنیٰ معیار زندگی کا مطالعہ کرنا، اس کے وجوہ معلوم کرنا، اور اس کو بلند کرنے کے لئے موزوں و مناسب تدابیر پیش کرنا ہے۔

---

[1] ۔ دیکھئے تصویر ۱ دوپلی کا ایک منہدم برج۔

[2] ۔ مردم شماری بذات خود کیگئی ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر آئندہ فصل میں ہم مسئلہ آبادی (جس کو نہ صرف موضع ہذا بلکہ تمام ہندوستان میں نمایاں اہمیت حاصل ہے) کا مختلف نقاط نظر سے مطالعہ کرینگے۔ جس سے اگر ایک طرف ہمارا اصلی مقصد پورا ہوگا تو دوسری طرف موضع ہذا کی آبادی سے متعلق دیگر ضروری امور کی تشریح بھی ہو جائیگی۔
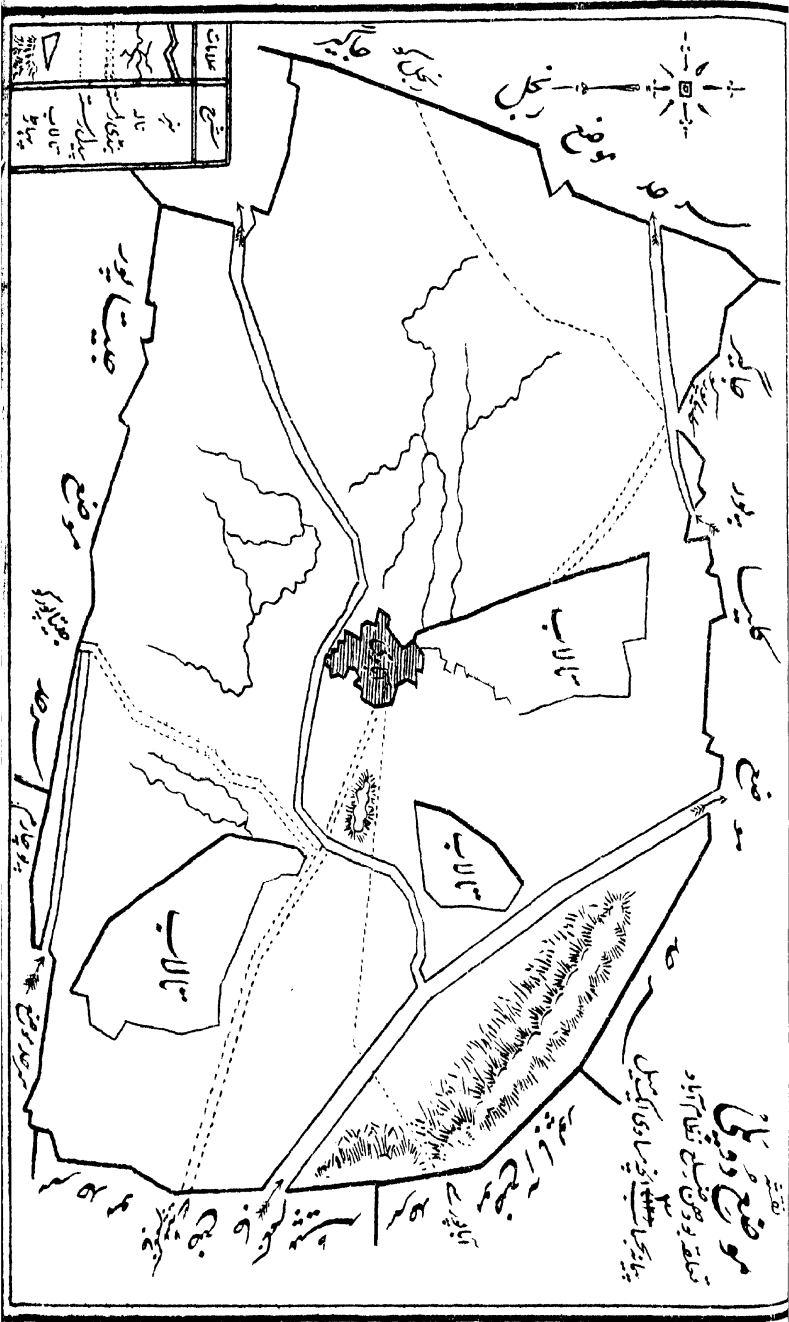
نقشہ
موضع دوپلی
تعلقہ بودھن ضلع نظام آباد
پیمانہ بحساب ۳ انچ مساوی ایک میل
موضع کلیا پور
جاگیر
موضع رنجل
رنجل کو
تالاب
تالاب
تالاب
آبادی
موضع آباپور
آباپور سے
سرحد
موضع جبیتا پور
سرحد
بوچارم
سرحد موضع
علامات
شرح
نہر
نالہ
بنڈی راستہ
پیدل راستہ
تالاب
پہاڑ
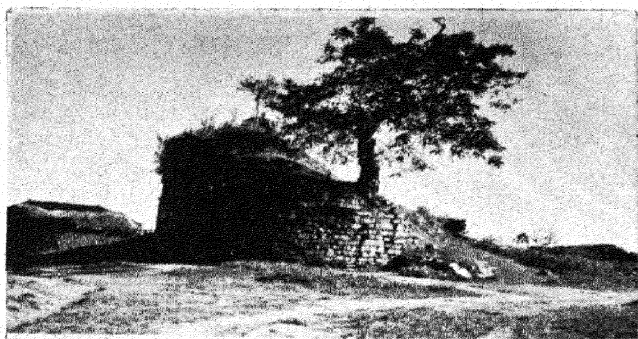
(۱) موضع دو پلی کا ایک منہدم برج
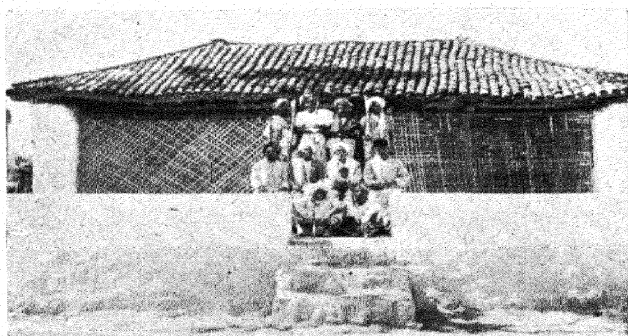
(۲) موضع دو پلی کی چاوڑی

(۱) موضع دو پلی کا ایک منہدم برج
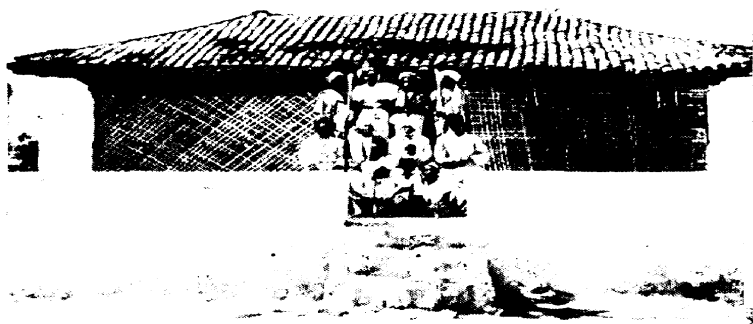
(۲) موضع دو پلی کی چاوڑی

پہلی فصل

زرعی آبادی[1]

سنہ ۱۳۲۳ف تا سنہ ۱۳۲۹ف مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء تا اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء

تاریخی پہلو | موضع دُوپلی کی آبادی سے متعلق ہمیں سب سے پہلے اعداد سنہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء) سے ملتے ہیں. اس سال موضع کی جملہ آبادی (۱۰۳۲) بتلائی گئی ہے لیکن چھ سال بعد یعنے سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) میں آبادی میں غیر معمولی تخفیف ہوگئی، اور وہ (۱۰۳۲) سے گھٹ کر (۸۸۷) ہوگئی. بالفاظ دیگر سنہ ۱۳۲۳ف (م ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء) کے مقابل سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) میں (۱۴۵) یا ۱۴ فیصد کی کمی ہوئی.

اس تخفیف کی اہم وجہ سنہ ۱۳۲۷ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء)، سنہ ۱۳۲۸ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۹-۲۰ء) اور سنہ ۱۳۲۹ف (م اکتوبر سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) کی قحط سالی تھی. قلت خوراک کی وجہ سے اگر ایک طرف شرح پیدائش میں نسبتاً تخفیف ہوگئی تو دوسری طرف شرح اموات میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا. زیر بحث چھ سالوں میں بحیثیت مجموعی (۵۴) نفوس پیدا ہوئے اور (۱۲۵) نفوس فوت ہوئے[2]. آبادی میں اگر ایک طرف شرح پیدائش کے مقابل

---

[1] موضع ہذا میں ۹۵٫۴ فیصد افراد کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ جزاً یا کلاً زراعت سے ہے لہذا اس فصل کا عنوان زرعی آبادی رکھا گیا ہے.

[2] حالانکہ سنہ ۱۳۴۱ف تا سنہ ۱۳۴۸ف کے معمولی سالوں میں بحیثیت مجموعی ۹۸ نفوس پیدا ہوئے اور ۶۲ نفوس فوت ہوئے.

لی آبادی

شرح اموات کی زیادتی کی وجہ سے تخفیف ہوئی تو دوسری طرف توطن داخلی کے مقابل توطن خارجی (گو عارضی سہی) کی زیادتی کی بناء پر کمی ہوئی قلت غذا سے مجبور ہو کر باشندگان موضع کی ایک کثیر تعداد نے تلاش معاش کے لئے ترک مقام کیا۔ لہذا متذکرہ دو مخالف اسباب کی بناء پر آبادی میں سرعت کے ساتھ تخفیف شروع ہوئی اور وہ ۱۳۲۳ف (م اکتوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) کے مقابل ۱۳۲۹ف (م اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء) میں ۱۴ فیصد گھٹ گئی۔

۱۳۲۹ف تا ۱۳۴۰ف مطابق اکتوبر ۱۹۱۹-۲۰ء تا اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء

۱۳۲۹ف (م ۱۹۱۹-۲۰ء) کے اختتام پر قحط سالی کے اثرات زائل ہونے لگے اور وہ افراد جو قحط سالی کے زمانہ میں فکر معاش کی خاطر ترک مقام کئے تھے واپس ہونا شروع ہوئے۔ نتیجتہً آبادی میں پھر اضافہ ہوگیا چنانچہ ۱۳۳۰ف (م اکتوبر ۱۹۲۰-۲۱ء) کی مردم شماری کے وقت یہاں کی جملہ آبادی (۹۷۰۰) تھی لیکن جب ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) میں دوبارہ مردم شماری کی گئی تو اس وقت تک جملہ آبادی ۱۳۳۰ف (م اکتوبر ۱۹۲۰-۲۱ء) کے مقابل (۹۷۰۰) سے بڑھ کر (۱۴۴۰۰) ہوگئی گویا آبادی میں تقریباً (۴۸) فیصد کا اضافہ ہوا لیکن یہ حقیقی اضافہ نہ تھا۔

مقدمان دیہی کا بیان ہے کہ آبادی میں اس غیر معمولی اضافہ کی اہم وجہ یہ تھی کہ ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) کی مردم شماری کے وقت نہر نظام ساگر کی تعمیر کا کام جاری تھا، اور اس کے سلسلہ میں وڈرول (مزدور پیشہ افراد کی ایک ذات) کی ایک کثیر تعداد موضع کی سواد میں مقیم تھی۔ لہذا ان تمام وڈروں کا شمار موضع ہذا کی آبادی میں کرلیا گیا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت وڈروں کی کوئی (۸۰۰) جھونپڑیاں تھیں۔ اگر ہم فی جھونپڑی ۵ نفوس فرض کرلیں تو منجملہ (۱۴۴۰۰) نفوس کے (۴۰۰۰) کی آبادی وڈروں پر مشتمل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا تعلق موضع کی حقیقی آبادی سے نہیں اس مفروضہ کے تحت ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) میں موضع کی حقیقی آبادی (کم و بیش) ۱۰۴۰۰ تھی۔ اس لحاظ سے ۱۳۳۰ف (م اکتوبر ۱۹۲۰-۲۱ء) کے مقابل ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) میں ۴۸ فیصد کے بجائے ۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔

۱۳۴۰ف تا ۱۳۴۷ف مطابق اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء تا اکتوبر ۱۹۳۷-۳۸ء

اگر ہم ۱۳۴۰ف (م اکتوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) کے اعداد کا مقابلہ ۱۳۴۷ف کے اعداد سے کریں تو

زرعی آبادی

آبادی میں مزید اضافہ نظر آتا ہے۔ ۱۳۴۷ف دم اکٹوبر ۳۸-۱۹۳۷ء) کی مردم شماری کے مطابق موضع کی جملہ آبادی (۱۱۵۴) ہے۔ اِس طرح ۱۳۴۰ف دم اکٹوبر ۳۱-۱۹۳۰ء) کے مقابل موجودہ آبادی میں ۱۱۴ نفوس یا ۱۱ فیصد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس اضافہ کے دو وجوہ ہیں۔ پہلا شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی۔ دوسرے توطن خارجی کے مقابل توطن داخلی کی زیادتی۔ جہانتک کہ اموات و پیدائش کے اعداد کا تعلق ہے وہ حسب ذیل ہیں :۔

سنہ فصلی	سنہ عیسوی	پیدا شدہ	فوت شدہ	اضافہ (+) یا تخفیف (-)
۱۳۴۱	اکٹوبر ۳۲-۱۹۳۱	۸	۱۲	-۴
۱۳۴۲	″ ۳۳-۱۹۳۲	۵	۲	+۳
۱۳۴۳	″ ۳۴-۱۹۳۳	۹	۷	+۲
۱۳۴۴	″ ۳۵-۱۹۳۴	۲۰	۲	+۱۸
۱۳۴۵	″ ۳۶-۱۹۳۵	۱۰	۶	+۴
۱۳۴۶	″ ۳۷-۱۹۳۶	۳۰	۹	+۲۱
۱۳۴۷	″ ۳۸-۱۹۳۷	۱۶	۲۴	-۸
جملہ		۹۸	۶۲	+۳۶

مندرجہ بالا اعداد کے دیکھنے سے واضح ہے کہ سوائے ۱۳۴۱ف (دم اکٹوبر ۳۲-۱۹۳۱ء) و ۱۳۴۷ف دم اکٹوبر ۳۸-۱۹۳۷ء) کے باقی تمام سالوں میں شرح پیدائش، شرح اموات سے کچھ نہ کچھ بڑھی رہی خصوصاً ۱۳۴۴ف و ۱۳۴۶ف (دم اکٹوبر ۳۵-۱۹۳۴ء، اکٹوبر ۳۷-۱۹۳۶ء) میں شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش میں غیر معمولی زیادتی کی وجہ سے علی الترتیب (۱۸) اور (۲۱) نفوس کا اضافہ ہوا۔ بحیثیت مجموعی گذشتہ سات سالوں میں جملہ ۹۸ نفوس پیدا ہوئے اور ۶۲ نفوس فوت ہوئے اِس طرح شرح اموات کے مقابل شرح پیدائش کی زیادتی کی وجہ سے جملہ ۳۶ نفوس یا ۳ فیصد سے کچھ زاید اضافہ ہوا لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ توطن خارجی کے مقابل توطن داخلی کی وجہ سے کس قدر زیادتی ہوئی۔

توطن داخلی و خارجی سے متعلق ہمیں کسی قسم کے اعداد نہیں ملتے، لہٰذا اس دقت کو رفع کرنے کے لئے

زرعی آبادی ہر بزرگ خاندان سے یہ دریافت کیا گیا کہ گذشتہ سات سالوں میں کتنے افراد ان کے مکان سے دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے۔ اس منتقلی کی کیا وجہ تھی۔ اسی طرح یہ بھی دریافت کیا گیا کہ گذشتہ سات سالوں میں کتنے افراد دیگر بیرونی مقامات سے ان کے مکان کو دائماً منتقل ہوئے۔ اس منتقلی کی کیا وجہ تھی۔

مذکورہ سوالات کی بناء پر گذشتہ سات سالوں میں نوطن داخلی وخارجی کے متعلق ہمیں حسب ذیل معلومات فراہم ہوئے:۔

۱۔ وہ افراد جو موضع ہذا سے گذشتہ سات سالوں میں تلاش معاش کی خاطر دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے .... (۴)

۲۔ وہ افراد جو موضع ہذا سے گذشتہ سات سالوں میں شادی بیاہ کی وجہ سے دیگر بیرونی مقامات کو مستقلاً منتقل ہوئے .... (۲۸)

جملہ منتقل شدہ افراد .... (۳۲)

۱۔ وہ افراد جو گذشتہ سات سالوں میں تلاش معاش کی خاطر دیگر بیرونی مقامات سے آکر موضع ہذا میں مستقلاً قیام پذیر ہوئے .... (۳۸)

۲۔ وہ افراد جو گذشتہ سات سالوں میں شادی بیاہ کی وجہ سے دیگر بیرونی مقامات سے آکر موضع ہذا میں مستقلاً مقیم ہوئے .... (۳۵)

جملہ واردین .... (۷۳)

مندرجہ صدر تشریح سے ظاہر ہو رہا ہے کہ گذشتہ سات سالوں میں نوطن خارجی کے مقابل نوطن داخلی کی زیادتی (۷۳ - ۳۲) کی وجہ سے ۱۳۴۰ف (م ۱۹۳۰-۳۱ء) کے مقابل موضع ہذا کی موجودہ آبادی میں ۴۱ یا تقریباً ۴ فیصد (نفوس) کی زیادتی ہوئی۔

بحیثیت مجموعی شرح پیدائش و شرح اموات، نوطن داخلی و نوطن خارجی کے باہمی فرق کی بناء پر (۳۶ + ۴۱) ۷۷ یا (۳ + ۴) ۷ فیصد کی زیادتی ہوئی لیکن فی نفسہ اضافہ ۱۱۴ نفوس یا تقریباً ۱۱ فیصد کا ہے۔ گویا مزید ۳۷ افراد یا تقریباً ۴ فیصد اضافہ کے وجوہ دریافت طلب ہیں۔ اس اضافہ کو ہم اضافہ بوجہ نامعلوم قرار دے سکتے ہیں اس لئے کہ اس کے کوئی وجوہ معلوم نہ ہو سکے۔

زرعی آبادی

یہاں تک تو ہم نے یہ معلوم کیا کہ ۱۳۴۰ف دم اکٹوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) کے مقابل ۱۳۴۷ف (دم اکٹوبر ۱۹۳۷-۳۸ء) میں آبادی میں جو اضافہ ہوا اس کے کیا وجوہ تھے لیکن اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ۱۳۲۳ف (دم اکٹوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) کے مقابل موجودہ آبادی کس قدر زاید ہے۔ واضح رہے کہ ۱۳۲۳ف (دم اکٹوبر ۱۹۱۳-۱۴ء) میں جملہ آبادی (۱۰۳۲) تھی۔ لیکن اب (۱۱۵۴) ہوگئی ہے۔ گویا گذشتہ ۲۴ سال میں (۱۱۵۴-۱۰۳۲) ۱۲۲ نفوس یا ۱۱٫۸۲ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ بالفاظ دیگر فی سال اوسطاً ۵٫۰۸ نفوس کی زیادتی ہوئی۔ اس ادنیٰ رفتار اضافہ کی اہم وجہ ۱۳۴۰ف (دم اکٹوبر ۱۹۳۰-۳۱ء) اور اس سے قبل کے قحط سالیاں اور وبائیں ہیں جب کہ نہ صرف شرح پیدائش کے مقابل شرح اموات بالعموم غیر معمولی طور پر بڑھی رہتی تھی بلکہ توطن داخلی کے مقابل توطن خارجی (گو عارضی سہی) زیادہ ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں اثرات سرعت کے ساتھ آبادی کو گھٹا دیتے تھے۔ اعلیٰ شرح پیدائش کی وجہ سے اگر آبادی میں اضافہ کا امکان ہوتا ہے تو اعلیٰ شرح اموات کی بدولت یہ امکان بالعموم تقریباً معدوم ہوتا رہتا ہے، لہٰذا آبادی کا حقیقی اضافہ موثر طور پر رونما نہیں ہونے پاتا۔ نتیجہ یہ کہ آبادی کی رفتار ترقی بہت سست رہتی ہے۔[1]

۴۔ موجودہ نوعیت

آبادی کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالنے کے بعد اب ہم اس کی موجودہ نوعیت معلوم کرینگے۔

تقسیم آبادی بلحاظ مذہب:۔ موضع ہذا میں جملہ چار مذہب کے لوگ آباد ہیں:۔ ۱۔ ہندو، ۲۔ اچھوت، ۳۔ مسلمان، ۴۔ عیسائی۔ ان مذاہب کے خاندانوں اور افراد کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

تفصیل مذہب	تعداد خاندان	فیصد	تعداد نفوس	فیصد
۱۔ ہندو	۱۷۳	۷۰٫۳	۸۴۷	۷۳٫۴
۲۔ اچھوت	۶۵	۲۶٫۴	۲۶۷	۲۳٫۱
۳۔ مسلمان	۷	۲٫۹	۳۶	۳٫۱
۴۔ عیسائی	۱	۰٫۴	۴	۰٫۴
جملہ	۲۴۶	۱۰۰٫۰	۱۱۵۴	۱۰۰٫۰

[1] ۱۳۲۳ف (دم ۱۹۱۳-۱۴ف) کے مقابل موجودہ آبادی میں جس قدر زیادتی ہوئی وہ بیشتر ۱۳۴۰ف (۱۹۳۰-۳۱ء) کے بعد عمل میں آئی ہے ورنہ اس سے قبل بالعموم شرح پیدائش شرح اموات سے بڑھی ہوئی رہتی تھی۔

نرعی آبادی

مندرجہ صدر اعداد سے ظاہر ہے کہ بلحاظ خاندان اور بلحاظ افراد ہند و مذہب کے لوگ سب سے زیادہ ہیں۔ واضح رہے کہ ہند و مذہب میں مختلف فرقوں :۔ کولی، دھنگر، جلاہے، موٹرواڑ، بھوئی، دیمرواڑ، دھوبی، حجام، برہمن، کومٹی، بڑھئی، سنار، لوہار، کلال، درزی، منورواڑ، ایاوار، بڑوڑ، اور کمار، کے شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر فرقے ایک دوسرے کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے۔ خصوصاً برہمن کسی کے ہاتھ کی پکی ہوئی غذا نہیں استعمال کرتے۔ البتہ برہمنوں کی دی ہوئی غذا سب لوگ استعمال کرتے ہیں۔

اچھوت افراد میں دھیڑ اور مانگ شامل ہیں۔ سماجی نکتہ نظر سے مانگوں کو سب سے ادنیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے دھیڑوں کا رتبہ مانگوں سے بہتر ہے۔ لیکن جہاں تک کہ چھوت کا مسئلہ ہے ان دونوں فرقوں کو بالکل علحدہ رکھا جاتا ہے۔

تقسیم آبادی بلحاظ جنس :۔۔۔۔۔ بلحاظ جنس آبادی کو دو طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مذکر اور مونث۔ (۱۱۵۴) افراد میں سے (۵۶۷) ذکور، اور (۵۸۷) اناث ہیں۔ گویا فی ہزار ذکور، اناث کی تعداد (۱۰۳۵) ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد میں بعض اہم فرقوں میں ذکور و اناث کی تعداد دی گئی ہے۔ نیز یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ہر فرقے میں ذکور اور اناث کا کیا تناسب ہے :۔

نام فرقہ	جملہ تعداد نفوس	ذکور	اناث	فی ہزار ذکور و اناث کی تعداد
دھیڑ	۱۸۲	۸۴	۹۸	۱۱۶۷
کولی	۱۵۶	۸۰	۷۶	۹۵۰
دھنگر	۱۱۵	۵۵	۶۰	۱۰۹۱
جلاہے	۹۸	۵۱	۴۷	۹۲۳
موٹرواڑ	۱۰۱	۵۰	۵۱	۱۰۲۰
بھوئی	۹۰	۴۴	۴۶	۱۰۴۶
مانگ	۷۹	۳۹	۴۰	۱۰۲۶
دیمرواڑ	۸۴	۳۹	۴۵	۱۱۵۴
دھوبی	۴۴	۲۸	۱۶	۵۷۱

زرعی آباد:

حجام	۳۲	۱۴	۱۸	۱۲۸۵
منفرق[1]	۱۷۳	۸۳	۹۰	۱۰۸۴

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہے کہ سوائے چند فرقوں کے باقی تمام فرقوں میں ذکور کے مقابل اناث کی تعداد زیادہ ہے لیکن جب ہم عمر کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہر دو کا باہمی تناسب بتدریج گھٹتا جاتا ہے۔ (جوں جوں عمر کے مدارج بڑھتے جاتے ہیں) چنانچہ ذیل کے اعداد سے اس بیان کی تشریح ہوتی ہے:۔

سال	ذکور	اناث	فی ہزار ذکور، اناث کی تعداد
۰ تا ۵	۶۶	۷۲	۱۰۹۲
۵ تا ۱۰	۶۹	۷۸	۱۱۳۰
۱۰ تا ۱۵	۵۹	۵۵	۹۳۲
۱۵ تا ۲۰	۴۴	۴۴	۱۰۰۰
۲۰ تا ۲۵	۳۲	۵۷	۱۷۸۱
۲۵ تا ۳۰	۱۰	۹۷	۱۲۸۱
۳۰ تا ۳۵	۵۳	۵۴	۱۰۱۹
۳۵ تا ۴۰	۴۶	۲۵	۵۴۴
۴۰ تا ۴۵	۴۸	۴۳	۸۹۶
۴۵ تا ۵۰	۳۱	۱۱	۳۵۵
۵۰ تا ۶۰	۲۶	۲۶	۱۰۰۰
۶۰ تا ۷۰	۱۱	۱۴	۱۲۷۳
۷۰ تا ۸۰	۲	۱۱	۵۵۰۰

مندرجہ صدر اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ۲۰ تا ۲۵ سال کے بعد سے ۵۰ تا ۶۰ سال فی ہزار مرد کے مقابل عورتوں کی تعداد بالعموم گھٹتی جاتی ہے۔ ۲۰، اور ۲۵ سال کے درمیان فی ہزار مرد

---

[1] منفرق فرقوں میں مسلمان۔ عیسائی۔ برہمن۔ کومٹی۔ کلال۔ سنار۔ درزی وغیرہ شامل ہیں۔

ری آبادی

عورتوں کی تعداد ۱۸۱۷ ہے لیکن ۲۵ اور ۳۰ سال کے درمیان یہ تعداد گھٹ کر ۱۲۸۱ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ۳۵ اور ۴۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی کمی ہو جاتی ہے اور اب وہ صرف ۵۴۴ رہ جاتی ہے۔ ۴۵ تا ۵۰ سال کے درمیان اس تعداد کا تناسب بہت ہی کم ہو جاتا ہے یعنے یہ کہ فی ہزار مرد، عورتوں کی تعداد صرف ۲۵۵ رہتی ہے۔

اس تخفیف کی اہم وجہ یہ ہے کہ آغاز شباب (۱۲ تا ۱۴ سال) کے بعد سے موضع ہذا کی عورتوں کو مختلف تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ عام طور پر بچپن ہی میں شادی ہو جاتی ہے لہٰذا آغاز شباب کے ساتھ ہی زن و شوہر میں ازدواجی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً نہ صرف مرد کمسنی میں باپ بن جاتے ہیں بلکہ عورتوں کو بھی کمسنی میں (۱۴ تا ۲۰) سال، ماں کا رتبہ ملجاتا ہے۔ جلد جلد زچگیوں کی وجہ سے عورتوں کے قویٰ سرعت کے ساتھ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ ایک طرف تو انھیں دودھ پلانا پڑتا ہے اور دوسری طرف تمام دن محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے۔ ان دو حالتوں کی موجودگی میں قلت غذا اُن کے لئے اور مضر ثابت ہوتی ہے۔ ان ہی واقعات کی بناء پر ترقی عمر کے مدارج جوں جوں بڑھتے جاتے ہیں ایک عمر معینہ (۴۵ تا ۵۰) تک فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد گھٹتی جاتی ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۵۰ تا ۶۰ سال کے بعد سے فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں پھر غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ۶۰ اور ۷۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد ۱۲۷۳ رہی ہے۔ ۷۰ اور ۸۰ سال کے درمیان فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ عمر کے اس درجے میں فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد ۵۵۰۰ ہے۔

اس زیادتی کی وجہ یہ ہونی چاہیئے کہ عورتوں کے آرام کا زمانہ ۴۵ سال کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے۔ امور خانہ داری سے یوں سبکدوشی ہو جاتی ہے کہ گھر کی بھو بیٹی اس کو انجام دینے لگتی ہیں۔ جہانتک کہ مزدوری کو جانے کا تعلق ہے اس میں بھی پہلی سی پابندی باقی نہیں رہتی۔ ۵۰ سال کے بعد سے مزدوری کا کام کلیتاً بند ہو جاتا ہے۔ البتہ بچوں کی سنبھال کا کام ان کے سپرد ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس آرام کی وجہ سے ان کی شرح اموات میں کمی ہو جاتی ہے، اور اس طرح عمر کے آخری مدارج میں فی ہزار مرد عورتوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

تقسیم آبادی بلحاظ شادیاں وغیرہ :- آبادی کی ایک اور تقسیم شادی بیاہ کے لحاظ سے

زرعی آبادی

کیجا سکتی ہے۔ ۱۱۵۴ افراد میں سے ۶۷۰ شادی شدہ، ۳۰۷ غیر شادی شدہ اور ۱۷۷ بیوہ اور بے زن ہیں۔ بالفاظ دیگر مجموعی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ۵۸ فیصد افراد شادی شدہ اور ۱۵ فیصد بیوہ و بے زن ہیں۔ ذیل میں شادی شدہ اور بیوہ و بے زن افراد کا تجزیہ بلحاظ تذکیر و تانیث دیا گیا ہے:-

	تعداد ذکور	فیصد	تعداد اناث	فیصد
۱۔ شادی شدہ	۳۴۰	۶۰،۰	۳۳۰	۵۶،۲
۲۔ غیر شادی شدہ	۱۶۰	۲۸،۲	۱۴۷	۲۵،۱
۳۔ بے زن و بیوہ	۶۷	۱۱،۸	۱۱۰	۱۸،۷
جملہ	۵۶۷	۱۰۰،۰	۵۸۷	۱۰۰،۰

ان اعداد سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ۵۶۷ ذکور میں سے ۳۴۰ یا ۶۰ فیصد اور ۵۸۷ اناث میں سے ۳۳۰ یا ۵۶،۲ فیصد شادی شدہ ہیں۔ بالفاظ دیگر فی ہزار ذکور تقریباً ۶۰۰ شادی شدہ ہیں اور فی ہزار اناث شادی شدہ نفوس کی تعداد تقریباً ۵۸۰ ہے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موضع زیر بحث میں شادی بیاہ کو کس قدر عمومیت حاصل ہے۔ ذیل میں شادی شدہ ذکور و اناث کا عمر وار تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مختلف مدارج عمر میں شادی شدہ افراد کی تعداد کیا ہے:-

عمر	شادی شدہ ذکور کی تعداد	فیصد	شادی شدہ اناث کی تعداد	فیصد
۰تا۵	۳		۲	۹
۵تا۱۰	۷	۹	۲۷	
۱۰تا۱۵	۲۱		۴۱	۱۲
۱۵تا۲۰	۴۱	۱۲	۴۱	
۲۰تا۲۵	۳۳	۳۰	۴۹	۴۹
۲۵تا۳۰	۷۲		۷۲	
۳۰تا۳۵	۳۹		۴۶	

آبادی

عمر	ذکور	فیصد	اناث	فیصد
۳۵ تا ۴۰	۳۹	۳۵	۲۳	۲۸
۴۰ تا ۴۵	۳۷		۲۲	
۴۵ تا ۵۰	۲۸	۱۴	۲	۲
۵۰ تا ۶۰	۱۲		۴	
۶۰ تا ۷۰	۸		۱	
جملہ	۳۴۰	۱۰۰	۲۳۰	۱۰۰

مندرجہ صدر اعداد سے واضح ہے کہ ۳۴۰ شادی شدہ ذکور میں سے ۹ فیصد افراد کی شادی ۱۵ سال سے کم عمر میں کی گئی ہے اسی طرح ۹ فیصد اناث کی شادیاں ۱۰ سال سے کم عمر میں کی گئی ہیں۔ بچپن اور کمسنی کی شادی سے اس میں شک نہیں کہ والدین کی آرزو پوری ہوتی ہے لیکن قرض کی بدولت ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ مزید برآں آغاز شباب کے ساتھ ہی زن وشوہر میں ازدواجی تعلقات قائم ہو جانے کی بدولت ہر دو میں وقت مقررہ سے قبل آثار اضمحلال پیدا ہو جاتے ہیں خصوصاً کمسنی کی زچگیوں کی بدولت اناث کی حالت سرعت کے ساتھ خراب ہونے لگتی ہے۔

تقسیم آبادی بلحاظ پیشہ :۔۔۔۔ آبادی کی ایک دوسری تقسیم پیشوں کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے پیشہ کے لحاظ سے موضع زیر بحث کے افراد کو دو طرح پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ غیر زراعت پیشہ۔ ۲۔ زراعت پیشہ۔ اولاً ہم غیر زراعت پیشہ افراد کی تشریح کرینگے :۔

تفصیل غیر زراعت پیشہ	خاندان	فیصد بلحاظ مجموعی خاندان	نفوس	فیصد بلحاظ مجموعی آبادی
۱۔ خالص دستکار	۱۰	۴٫۱	۴۵	۳٫۹
۲۔ خالص ملازم سرکار	۲	۰٫۸	۴	۰٫۳
۳۔ خالص تجار	۲	۰٫۸	۶	۰٫۵
۴۔ بھیک منگے[1]	۴	۱٫۶	۱۰	۰٫۹
جملہ	۱۸	۷٫۳	۶۵	۵٫۶

---

[1] بنظر سہولت بھیک منگے خاندانوں کو غیر زراعت پیشہ میں شامل کیا گیا ہے۔

سابقہ اعداد سے واضح ہے کہ غیر زراعت پیشہ افراد ۱۸ خاندانوں یا ۶۵ نفوس پر مشتمل ہیں مجموعی خاندانوں کا لحاظ کرتے زرعی آبادی ہوئے غیر زراعت پیشہ خاندان ۷٫۳ فیصد ہیں بلحاظ مجموعی آبادی ان افراد کا فیصد صرف ۵٫۶ ہے۔

جہانتک کہ زراعت پیشہ آبادی کا تعلق ہے مجموعی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا فیصد ۴۴٫۹ ہے۔
ذیل میں جملہ زراعت پیشہ خاندانوں کی تفصیل دیگئی ہے:۔

تفصیل زراعت پیشہ	خاندان	فیصد بلحاظ مجموعی خاندان	نفوس	فیصد بلحاظ مجموعی آبادی
۱۔ خالص زراعت پیشہ	۷۱	۲۸٫۹	۳۶۰	۳۱٫۲
۲۔ اصل پیشہ زراعت ذیلی طور پر دیگر پیشے	۷۲	۲۹٫۳	۳۷۵	۳۲٫۵
۳۔ اصلی طور پر دیگر پیشے ذیلی طور پر زراعت	۴۹	۱۹٫۹	۲۲۸	۱۹٫۸
۴۔ خالص زرعی مزدور	۳۶	۱۴٫۶	۱۲۶	۱۰٫۹
جملہ	۲۲۸	۹۲٫۷	۱۰۸۹	۹۴٫۴

کارگذار و غیر کارگذار آبادی:۔ بلحاظ پیشہ آبادی کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد اب ہم یہ دریافت کرینگے کہ موضع زیر بحث میں کارگذار[1] و غیر کارگذار افراد کی کیا تعداد ہے۔

کارگذار آبادی کو ہم دو طرح پر تقسیم کرینگے (الف) مذکر کارگذار آبادی (ب) مونث کارگذار آبادی۔

(الف) مذکر کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے لئے ہم نے ان تمام افراد خاندان کو جنکی عمر ۱۰ سال سے کم ہے غیر کارگذار قرار دیا ہے اس میں شک نہیں کہ بعض فرقوں میں اور خصوصاً اچھوت خاندانوں کی اکثریت میں مذکر افراد خاندان ۸ سال ہی کی عمر سے کچھ نہ کچھ کمانے لگتے ہیں لیکن ہم اس آمدنی کو نظر انداز کر دینگے اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ سب اچھوت خاندانوں کے لڑکے ۸ برس سے کمانے نہیں لگتے۔ دوسرے یہ کہ جن خاندانوں میں اس عمر کے لڑکے اگر ملازمت کرتے بھی ہیں تو ان کی ملازمت مستقل اور مسلسل نہیں ہوتی تیسرے یہ کہ اپنی محنت سے جو آمدنی کہ وہ حاصل کرتے ہیں بہت ہی قلیل ہوتی ہے جو حقیقتاً نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔

جہانتک دس اور پندرہ سال کے درمیانی عمر کے افراد کا تعلق ہے ہم نے انھیں نیم کارگذار قرار دیا ہے۔ ۱۰، ۱۱ اور ۱۰ برس کے بعد اس موضع میں شاید ہی کوئی ایسا لڑکا ہو جو اپنا پورا وقت کھیل کود میں گذارے اگر وہ نہیں تو مجبوراً والدین کے ڈر سے اپنے طفلانہ کھیلوں کو خیرباد کہہ کر کام کی طرف راغب ہونا پڑتا ہے۔ البتہ ۱۵ سال کے

---

[1] کسی کارگذار فرد سے ہماری مراد وہ فرد ہے جو کہ عمل پیدائش میں مشغول رہ کر کم از کم اتنی آمدنی حاصل کر سکتا ہو جو کہ اس کی بقا کے لئے عموماً کافی ہو سکے۔

زرعی آبادی　لڑکے عموماً جانور چراتے ہیں۔ جانور یا تو ذاتی ہوتے ہیں یا کسی مالک کے۔ جو لڑکے دوسروں کے ہاں ملازم ہوتے ہیں وہ بحیثیت مجموعی اتنی آمدنی حاصل کرتے ہیں کہ جس کے ذریعہ موجودہ معیار زندگی پر کم از کم نصف ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اس لئے ہم نے ان کو نیم کارگذار افراد میں شامل کیا ہے۔ جب کہ ان لڑکوں کو جو دوسروں کے ہاں ملازم ہیں نیم کارگذار قرار دیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں جوان ہی کے ہم عمر لڑکوں کو جو کہ ذاتی جانور چراتے ہیں اس زمرے میں شامل نہ کیا جائے۔

۱۵ تا ۵۰ سال کے درمیان جملہ افراد کو (بہ استثنائے معذورین وگداگران) کارگذار قرار دیا گیا ہے۔ پندرہ سال کے بعد لڑکے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسب معاش میں کُلّی طور پر بزرگ خاندان کا ہاتھ بٹائے۔ پچاس سال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ اس عمر تک قوائے جسمانی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جانداری باقی نہیں رہتی جو کہ ایک ۳۰ تا ۳۵ سالہ شخص میں پائی جاتی ہے۔

۱۵ تا ۵۰ سال کے درمیانی عمر والے افراد کو کارگذار قرار دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ افراد جنکی عمر ۵۰ سال سے تجاوز کر گئی ہے کارگذار نہیں ہیں۔ کارگذار ضرور کہلائے جا سکتے ہیں لیکن کُلّی معنی میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ۵۰ سال کے بعد اعضا سرعت کے ساتھ کمزور ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ ۷۰ سال بعد وہ بالکل ہی از کار رفتہ ہو جاتے ہیں اس لئے ہم نے ۵۰ اور ۶۰ سال کے درمیانی عمر والے افراد کو نیم کارگذار قرار دیا ہے۔

۶۰ اور ۶۰ سال سے زاید عمر والے افراد کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے، اس لئے کہ ۶۰ سال بعد قویٰ بہت ہی مضمحل ہو جاتے ہیں اور کام کرنے کی قوت بالعموم مطلق باقی نہیں رہتی۔

مندرجہ بالا مفروضات کے تحت موضع ہذا کی ذکور کارگذار، نیم کارگذار اور غیر کارگذار آبادی حسب ذیل ہے:-

	تعداد	فیصد
۱۔ ذکور کارگذار افراد	۳۲۹	۵۸
۲۔ ذکور نیم کارگذار افراد	۸۵	۱۵
۳۔ ذکور غیر کارگذار افراد	۱۵۳	۲۷
جملہ	۵۶۷	۱۰۰

(ب) مونث کارگذار آبادی:— مذکر کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے بعد اب ہم مونث کارگذار آبادی کی نوعیت دریافت کرینگے۔

مونث کارگذار آبادی کو معلوم کرنے کے لئے اُن تمام بچیوں اور لڑکیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے

زرعی آبادی

جنکی عمر ۱۳ سال سے کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ۸ سال سے کم عمر والی جتنی بچیاں ہیں عام طور پر اپنا پورا وقت کھیل کود میں گذارتی ہیں ۸ تا ۱۳ سال کی عمر والی لڑکیاں خانہ داری کا مفید کام ضرور انجام دیتی ہیں لیکن مقامی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ان کی محنت کا اندازہ زر کی شکل میں نہیں لگا سکتے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر اس کا اندازہ لگا بھی لیا جائے تو جو آمدنی کہ وہ اس عمر میں حاصل کر سکتی ہیں وہ بہت ہی قلیل ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی پرورش کلیتہً ماں باپ کی کمائی پر ہوتی ہے۔ لہٰذا تیرہ سال سے کم عمر والی تمام لڑکیوں اور بچیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

۱۳ تا ۴۵ سال کے درمیان تمام عورتوں کو (سوائے معذورین۔ فقرا اور خالص خانہ دار عورتوں کے) کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

۴۵ تا ۵۰ سال کی درمیانی عمر والی عورتیں نیم کارگذار قرار دی گئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ناکافی خوراک۔ غیر معمولی طریقہ رہائش کمسنی کی زچگیوں اور کثرت کار کی وجہ سے اس عمر تک ان کی قوت کارگذاری بہت کچھ کم ہو جاتی ہے۔

۵۰ سال کے بعد جملہ عورتوں کو غیر کارگذار تصور کیا گیا ہے جس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔

مذکورہ مفروضات کے تحت موضع ہذا کی کارگذار، نیم کارگذار اور غیر کارگذار مونث آبادی کا تجزیہ حسب ذیل ہے:-

	تعداد	فیصد
۱۔ مونث کارگذار آبادی	۲۳۵	۴۰
۲۔ مونث نیم کارگذار آبادی	۱۱	۲
۳۔ مونث غیر کارگذار آبادی	۳۴۱	۵۸
جملہ	۵۸۷	۱۰۰

اس سلسلہ میں مونث اور مذکر کارگذار آبادی کا مقابلہ بھی ضروری ہے چنانچہ مندرجہ ذیل اعداد کے ذریعہ یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر صنف آبادی میں کتنے کارگذار، کتنے نیم کارگذار اور کس قدر غیر کارگذار افراد ہیں:-

	مذکر	فیصد	مونث	فیصد
۱۔ کارگذار افراد	۳۲۹	۵۸	۲۳۵	۴۰
۲۔ نیم کارگذار افراد	۸۵	۱۵	۱۱	۲
۳۔ غیر کارگذار افراد	۱۵۳	۲۷	۳۴۱	۵۸
جملہ	۵۶۷	۱۰۰	۵۸۷	۱۰۰

مندرجہ بالا اعداد کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مونث کارگذار آبادی کے مقابل مذکر کارگذار آبادی زیادہ ہے۔ فیصد ۵۸ مذکر کارگذار ہیں تو مونث کارگذار افراد کی تعداد ۴۰ فیصد ہے۔ گویا مذکر کارگذار آبادی کے مقابل مونث کارگذار آبادی ۱۸ فیصد کم ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ موضع ہذا میں کوئی ۱۴ فیصد عورتیں صرف خانہ داری کا کام انجام دیتی ہیں اور انھیں غیر کارگذار مونث آبادی میں شامل کیا گیا ہے۔ دیگر عورتوں کی طرح

زرعی آبادی — اگر یہ عورتیں بھی خانہ داری کے علاوہ کھیتوں پر کام کریں تو مونث کارگذار آبادی کا فیصد ۴۸ سے بڑھ کر ۵۴ ہو جاتا۔
جہاں تک کہ نیم کارگذار مونث آبادی کا تعلق ہے وہ بھی مذکر نیم کارگذار آبادی کے مقابل کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تیرہ سال سے کم عمر والی تمام بچیوں اور لڑکیوں کو غیر کارگذار قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ دس سال کی عمر والے لڑکے نیم کارگذار تصور کئے گئے ہیں۔ مونث نیم کارگذار آبادی اس لئے بھی کم ہے کہ ۵۴ اور ۵۰ سال کے درمیانی عمر والی عورتوں کی تعداد کم ہے اور اسی عمر والی عورتوں کو نیم کارگذار قرار دیا گیا ہے۔

جب ہم غیر کارگذار آبادی کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس میں مونث غیر کارگذار آبادی زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ۱۳ سال سے کم عمر والی لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ تمام لڑکیاں غیر کارگذار قرار دی گئی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عمر کے آخری دو درجوں میں مذکر کے مقابل مونث زیادہ ہیں جو کہ ہمارے مفروضہ کے تحت غیر کارگذار آبادی میں شامل ہیں۔

اگر بلحاظ مجموعی موضع ہذا کی کارگذار، نیم کارگذار، اور غیر کارگذار آبادی کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ جملہ ۴۹ فیصد کارگذار، ۸ فیصد نیم کارگذار اور ۴۳ فیصد غیر کارگذار ہیں۔

اگر ہم دو نیم کارگذار افراد کو ایک کارگذار فرد کے مساوی تصور کرلیں تو موضع کی جملہ کارگذار آبادی ۵۳ فیصد اور غیر کارگذار آبادی ۴۷ فیصد ہو جاتی ہے۔

موضع زیر بحث میں کارگذار آبادی کا فیصد اس لئے زاید ہے کہ یہاں کے باشندوں کی قوت پیدا آوری بحیثیت مجموعی بہت محدود ہے۔ یہاں کا ایک کارگذار فرد زیادہ سے زیادہ اس قدر آمدنی حاصل کرسکتا ہے جو اس کی شدید ضروریات زندگی کے لئے مکتفی ہوسکے۔ قوت پیدا آوری کی تحدید افراد خاندان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ جہاں تک ہوسکے جلد کمانے کے قابل بنیں اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مدت تک کام کرتے رہیں۔

کارگذار آبادی کی اس زیادتی کی بناء پر اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی باشندوں کی قوت پیدا آوری محدود ہے تو دوسری طرف یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں کا معیار زندگی بحیثیت مجموعی پست ہے۔ کیوں کہ پست معیار زندگی کی ایک اہم نشانی یہ ہے کہ افراد خاندان بہت جلد کمانے کے قابل ہوتے ہیں اور اپنی کمائی سے نہایت ہی ادنیٰ معیار پر اپنا اور اپنے چند متعلقین کا پیٹ پال سکتے ہیں۔
معیار زندگی کا مسئلہ چونکہ بہت اہم ہے اس لئے اس کا مفصل حال دوسری فصل میں بیان کیا جائیگا۔

رفتارِ زمانہ

مشرقِ بعید

ایسے ملک جو اپنی توسیع کے خواہش مند ہیں چین کی سرزمین کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں خصوصاً جاپان کے آہنی ہاتھ اس کم زور ملک کو اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں۔ جاپان کی آبادی ہر سال دس لاکھ کے حساب سے بڑھ رہی ہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے نئے ملک اور زیادہ غذا کی ضرورت ہے۔ جاپان کے ارباب سیاست ملک کی توسیع کو ہی اپنے معاشی مسائل کا حل سمجھتے ہیں چنانچہ منچو کو پر قبضہ کے بعد بھی ان کی تشفی نہیں ہوئی اور ملک گیری کی ہوس میں وہ برابر آگے بڑھتے گئے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جاپان کے علاوہ تین ملکتیں اور ایسی ہیں جن کو چین کے معاملات سے راست تعلق ہے۔ چین کے جنوب میں برطانیہ ہانگ کانگ پر قابض ہے۔ ممالک متحدہ جزائر فلپائن پر اور روس منچو کو کی شمالی سرحد پر قدم جمائے ہوئے ہے۔ پھر ان ملکوں کا سرمایہ بھی چین میں لگا ہوا ہے اس طرح ظاہر ہے کہ چین میں دنیا کی تین اور طاقتوں کا مفاد ہے اگرچہ برطانیہ اور امریکہ چین کے قائد چیانگ کائی شک کی اخلاقی اور مالی مدد کرتے ہیں مگر وہ کھلم کھلا جاپان سے مخالفت مول لینا نہیں چاہتے۔ جو لوگ موجودہ صورت حال سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ روس، چین کی مدد کر رہا ہے اور لڑائی در اصل چین و جاپان کی نہیں بلکہ روس اور جاپان کے درمیان ہو رہی ہے۔ دوسری طرف امریکہ اور برطانیہ کے مسلک سے جاپانی ان کو ستا رہے ہیں خصوصاً انگریزوں کی تو بہت ہی بے عزتی ہو رہی ہے۔ اس کا جواب کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور روس چین کے دنگل میں کیوں کود پڑا ہے؟ پچھلے چند دنوں کے

واقعات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

کوئی تین سال پہلے چین میں دو علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں تھیں۔ ایک شمالی چین کی حکومت تھی جس کا صدر مقام نانکنگ تھا، اور دوسری جنوبی چین کی جو کانٹن کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھی جنوبی چین کی حکومت جاپان کی بہت دشمن تھی لیکن شمالی چین کے قائد چیانگ کائی شک کا اس زمانے میں خیال تھا کہ جاپان کی مخالفت مفید نہیں ہے۔ ان کو ڈر تھا کہ جاپان سے لڑائی مول لیں تو چینی ہار جائیں گے اس کی بجائے ان کا خیال تھا کہ جاپان کو مشرق بعید کا رہنما بنا لینے میں چین امن سے رہ سکے گا۔ چنانچہ چین میں شمال اور جنوب کے اسی اختلاف کی وجہ سے جون ۱۹۳۶ء میں کچھ خانہ جنگی ہو گئی تھی۔

جاپان اور چین کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ اس کی ابتدا ۹۵-۱۸۹۴ء سے ہوتی ہے جبکہ جاپانیوں نے دریائے یالو پر جو کوریا اور منچوریا کو جدا کرتا ہے۔ چینی بحریہ کو شکست دی تھی۔ اس کے بعد ۰۵-۱۹۰۴ء میں جاپانیوں نے روسیوں کو شکست دی اور منچوریا میں گھس آئے اور پھر ۱۹۱۰ء میں کوریا کا جاپان سے الحاق کر لیا۔ چین کی بدقسمتی سے ۱۹۱۱ء کے چینی انقلاب کے بعد لکھو کھا چینی منچوریا جانے لگے تھے۔ جاپان نے مناسب موقع دیکھ کر ۱۹۱۵ء میں چین کے سامنے (۲۱) مطالبات پیش کر دئے۔ جاپان کا بڑا مطالبہ یہ تھا کہ منچوریا بالکل اس کے حوالے کر دیا جائے اور منگولیا میں بھی اس کا عمل دخل ہو جائے۔

اس کے بعد ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء تک کا طویل زمانہ عجیب طرح کا تھا چینی تو اپنے پرانے ڈگر پر چل رہے تھے اور وہ ہنوز جاپان سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوئے تھے لیکن جاپانیوں نے وہ سب کچھ کیا جو اپنے مفاد کے لئے کر سکتے تھے انھوں نے منچوریا میں ریل بنائی۔ کوئی (۲۲) کروڑ پونڈ ملک میں صرف کئے۔ بالآخر منچوریا میں دو کروڑ ستر لاکھ چینیوں اور دس لاکھ کوریوں کے ساتھ جاپانیوں کی تعداد چونتیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ غرض ان واقعات کی وجہ بہت دنوں سے چینیوں کے جذبات بھڑک رہے تھے، اور وہ جاپانیوں سے نفرت کرنے لگے تھے لیکن ۱۹۳۱ء میں تین واقعات ایسے ہوئے جن کی وجہ جاپانی اور چینی دونوں بہت مشتعل ہو گئے۔ پہلا واقعہ تو یہ تھا کہ وان پاؤشن کے مقام پر چینیوں نے کوریوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کوریا کے بہت سے چینی تاجر کوریوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ دوسرے جاپانی فوج کا کپتان ناکامورا منچوریا کے چینی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اور اس سال کا تیسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ جاپانی فوج دریائے یالو کو عبور کر کے منچوریا پر چڑھ دوڑی۔

اس کے بعد چین کے حالات بہت دلچسپ صورت اختیار کرنے لگے چین نے مجلس اقوام میں شکایت کی تو

مجلس نے ایک طویل مدت کے بعد لارڈ لٹن کے تحت ایک استفساری کمیشن بھیجا استفسار میں منچوریا کے داخل کرلئے جانے کی جاپان نے شکایت کی ستمبر ۱۹۳۲ء تک کمیشن نے اپنی رپورٹ تیار کرلی اور وہ اکتوبر میں شائع ہوگئی۔ جاپانیوں نے گفت وشنید کے لئے ۱۴ر نومبر تک مہلت مانگی اور اس سے بہت پہلے ستمبر ہی میں انھوں نے منچوکو کی آزادی کا اعلان کردیا اس کا ردعمل شنگ ہائی میں ہوا چینی طالب علموں نے منچوریا کا بدلہ لینا چاہا اور انھوں نے جاپانی اشیاء کے خلاف بائی کاٹ شروع کردی۔ شنگ ہائی میں بودھ علاموں اور بندر لوگوں کے خلاف مظاہرے شروع ہوگئے اور جاپانی مدرسے کے بچوں اور بردھوں پر حملے ہونے لگے۔ بالآخر جاپانی باشندوں نے ٹوکیو سے شکایت کی اور ان کی مدد کے لئے بہت سے سپاہی آپہنچے۔ جاپانی جہازوں نے بہت پھرتی دکھلائی مگر ان کو ہار ماننی پڑی اس کے بعد انھوں نے چیپ (Chape) پر بمباری شروع کی غریب مزدوروں کے گھر ویران ہوگئے اور تجارتی مطلع تباہ کردیا گیا جس کی وجہ سے ہزاروں چینی مزدور بے روزگار ہوگئے لیکن جاپانیوں کے پیہم حملوں اور ان کی زبردستیوں سے اتنا فائدہ تو ہوا کہ چینی جن کے قائد آپس میں لڑنے جھگڑتے تھے، اب آہستہ آہستہ متحد ہونے لگے اور ادھر ۱۹۳۴ء میں جاپانیوں نے اپنے ایک آدمی کو منچوریا کا بادشاہ بنایا جو ان کے ہاتھ میں ایک کٹ پتلی تھا اس طرح منچوکو کی آزادی اور اس پر تسلط کے بعد جاپان نے دوسرا قدم اٹھایا چین کے شمالی صوبے میں ایک تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسے بھی آزادی مل جائے۔ ماہ جون ۱۹۳۶ء میں تانگھو اور ٹین ٹسین کے درمیان ریلوے پل پر بم برسائے اس کا اثر یہ ہوا کہ ہوپی کے مشرق میں رہنے والے چینی باشندے جاپان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ چینی فوج جمع ہونے لگی اور کوانگ تنگ اور کوانگ سی (جنوبی چین) کے فوجی افسروں نے کانٹون کی حکومت کا ساتھ دیا۔ جنرل چین چی ٹانگ اور جنرل لی چینگ پن، کوانگ سی کے کمان دار مقرر ہوئے اور ایک بڑی جنگ کا خطرہ محسوس ہونے لگا چنانچہ نان کنگ کوانگ سی کے صوبے نے ۹ر جون کو جاپان کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور اس کے دوسرے ہی دن جنوبی فوج ہنگ چو کی طرف روانہ ہوگئی۔ ۱۱ر جون کو کانٹون کی حکومت نے لی یانگ پر جو ہنگ چو کے جنوب میں ۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے قبضہ کرلیا اسی اثنا میں جنرل چیانگ کائی شک نے اپنی فوجوں کو ہونان کی طرف بھیج دیا تھا اور اس کی وجہ سے جنوبی چین کی یہ نقل و حرکت بند ہوگئی مگر اس کے چند دنوں بعد جنرل چیانگ کائی شک ہی جاپان کے دشمن ہوگئے اور منتشر چینیوں کو جمع کرکے ایک متحدہ محاذ بنانے لگے۔

۷ر جولائی ۱۹۳۷ء سے چین میں پھر گڑبڑ شروع ہوئی۔ کوپائی پنگ سے کوئی ۱۰ میل مغرب کی طرف ایک جاپانی اور ایک چینی فوج میں کچھ جھڑپ ہوگئی۔ جاپانی فوج کی تعداد بڑھنے لگی اور انھوں نے جنگ کا ایک مکمل نقشہ اپنے سامنے

دکھا اور باضابطگی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ یہ دست درازی یہاں تک بڑھی کہ چینی دار السلطنت ان کے قبضے میں آ گیا اور اب چین کے دوسرے دو سیاسی اور تہذیبی مرکز یعنے کان ٹون اور ہانکاؤ کی طرف بھی پیش قدمی ہونے لگی یہاں تک فتح تک جاپان کا مقصد یہ تھا کہ چین کے شمالی صوبے یعنے چاہار، سوئی یوآن، شانسی اور شانٹنگ اس کے قبضے میں آجائیں۔ ان صوبوں کے بعد شنگ ہائی کی مہم باقی تھی اور یہ پوری ہوئی تو نانکنگ کی طرف رخ کیا گیا۔ اب تک جنگ کے چار محاذ تھے لیکن چین کسی جگہ بھی جم کر مقابلہ نہ کرسکا مشکل یہ تھی کہ غریب چینیوں میں ہمت تو تھی مگر ان کے پاس ساز و سامان کی کمی تھی۔ شنگ ہائی اور نانکنگ کی فتح کے بعد جاپانی دریائے یانگ ٹسی کے ساتھ ساتھ ہانکاؤ کی طرف بڑھنے لگے اور کانٹونگ پر حملہ کردیا۔

یہ ایک باضابطہ جنگ تھی جو جولائی ۱۹۳۸ء تک مسلسل جاری رہی اس ایک سال کی مدت میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ ہوانگ ہو کا سیلاب جاپانیوں کے لئے ایک بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا اور اب تک نہیں تھما تھا اس کی وجہ سے جاپانیوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ چین کو باہر سے سامان جنگ پہنچ رہا تھا۔ چینیوں کے سب ٹوٹے پھوٹے ہوائی جہاز تو شنگ ہائی کو بچانے کی کوشش میں ختم ہوگئے اور ایک زمانہ تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صرف جاپان ہی ہوائی طاقت سے کام لے سکتا ہے اور چین اس معاملے میں بے بس ہے مگر اب دنیا کو معلوم ہوا کہ چینی بھی جاپانیوں سے ہوا میں لڑتے ہیں اور ان کے ہوائی مرکزوں پر دھاوے کرتے ہیں۔ جاپانی اس کی مزاحمت کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ انھوں نے چین کو سامان پہنچنے کے راستے بند کرنے چاہے لیکن مغربی منگولیا کا راستہ جہاں سے روسی سامان چین آتا تھا، ان کی زد سے باہر تھا، اور دوسری طرف ہانگ کانگ واقع تھا جس پر جاپانیوں کا قابو نہیں چلتا تھا۔ اس زمانے میں جاپانیوں نے ہانگ کانگ کی دو مشرقی بندرگاہوں یعنے اموئی اور سواتاؤ پر قبضہ کرلیا تھا، اور وہ اس سے آگے بڑھ کر غالباً جزیرۂ ہائی نان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن ہانگ کانگ پر جاپانیوں کا عمل دخل برطانیہ کو گوارا نہ تھا، اور پھر جزیرۂ ہائی نان بھی چینیوں کی مرضی سے فرانس کے زیر انتداب آ گیا تھا چنانچہ فرانس اور انگلستان نے مل کر جاپان کو دھمکی دی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس طرف رخ نہ کرسکا۔

ان حالات میں جاپانی سیاست بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ آگے بڑھ کر ہانکاؤ تک پہنچنے میں بہت سی دشواریاں تھیں۔ وہ نانکنگ سے آگے پیش قدمی نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ان کے سامنے پہاڑیوں میں مورچہ بندی کی گئی تھی کہ یہ آگے نہ بڑھیں۔ اور ان کی تمام تدبیریں بیکار معلوم ہوتی تھیں چونکہ

چینیوں کو روسی امداد ملتی تھی اس لئے ان کو مقابلے کی اور ہمت ہوگئی۔ روس کو چین سے زیادہ ہمدردی تو نہ تھی مگر وہ اب جاپان کو گھائل کرنے کے لئے چین کی سرپرستی کر رہا تھا۔ پھر اس زمانے میں اٹلی اور جرمنی خود اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور جاپان کی طرف ان کی توجہ زیادہ نہ تھی۔ یہ حالات جاپان کے لئے ہمت افزا تھے کیوں کہ جاپان کی سرگرمیاں اٹلی اور جرمنی کے بل بوتے پر ہوتی تھیں اور اب ان کو مسمار و کرنے پر جاپانی مجبور ہو رہے تھے۔

لیکن شاید جاپان کو اپنی بے عزتی گوارا نہ تھی اس نے چین کے میدان کو چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ جاپانی وزارت میں فوجی عنصر نے زور ڈال کر اپنا کام نکال ہی لیا۔ اب ان کو روس سے منچوکو کی سرحد پر مقابلہ کرنا تھا۔ چنگ کو فنگ اور شاٹ سو پنگ پر دونوں کے درمیان سخت معرکہ ہوگیا۔ روس کے بیس ہزار سپاہی ۰۰ا مخزن اور ۲۰۰ ہوائی جہاز اپنی قوت آزما رہے تھے اور بہت دنوں تک یہ جنگ زور وں پر چلتی رہی۔ بالآخر روس اور جاپان کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوگیا اور یہ لڑائی ختم ہوئی لیکن اب سرحد کا تصفیہ باقی تھا۔ چنانچہ دو روسی اور دو منچوکو کے جاپانی نمایندوں کی ایک کمیشن صورت حال پر غور کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔

اسی سال اگست کے دوسرے ہفتے میں جاپانیوں نے ہان کاؤ پر حملہ کیا تھا لیکن دریائے زرد کے سیلاب سے ان کو ہار ماننی پڑی۔ جاپانی فوج کو جو سیلابی خطے کے شمال میں پڑی ہوئی تھی چینیوں نے فزا فانہ جنگ سے بہت پریشان کر دیا۔ اب جاپانی فوج کی توجہ دو طرف بٹ گئی تھی۔ تھوڑی سی فوج تو یانگ ٹسی کے کنارے پڑی ہوئی تھی اور باقی فوج منچوکو کی سرحد پر روسیوں کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔ ان دو فوجوں کے درمیان ایک وسیع سرزمین تھی جس پر جاپان کا برائے نام قبضہ تھا۔ یہاں کم زور چینیوں کو اپنی قوت آزمانے کا موقع ملا۔ انھوں نے فزافانہ جنگ سے جاپانیوں کا قافیہ تنگ کر دیا اور جاپانی فوج کو جنوب سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اس طرح جاپان ہان کاؤ کی مہم پر مزید سپاہی بھیجنے کے قابل نہ تھا۔ پھر دوسری طرف چینی فوج یانگ ٹسی کے بائیں کنارے ڈٹی رہی اور شمال سے آنے والی جاپانی فوج کی روک تھام کرتی رہی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہان کاؤ کی نواح میں سخت معرکہ ہوا اور فریقین کو بہت نقصان پہنچا۔

اوائل اکتوبر میں جاپانی وزیر خارجہ جنرل اوگاکی نے استعفیٰ دے دیا اور اب جاپان نے برطانوی دوستی کے مسلک کو چھوڑ دیا۔ اس کی مصلحت یہ تھی کہ ٹوکیو، روم، برلن محور کو مضبوط کر لے۔ اس سے جاپانیوں کی نقل و حرکت میں ایک نئی جنبش پیدا ہوگئی۔ یعنے جاپانی فوجوں نے یانگ ٹسی کو عبور کیا اور جدا گیا ان پر تو یان کاؤ اور

کان ٹون سے (۷۰) میل جنوب مشرق میں واقع ہے، قبضہ کر لیا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ ۷ اکتوبر کو ان لوگوں نے پی ینگ ہان کاؤ ریل کاٹ دی۔ یہ ریل ہان کاؤ سے (۱۰۰) میل شمال پر تھی اور اب جاپانی ہان کاؤ کی طرف برابر بڑھتے جا رہے تھے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر کو خبر آئی کہ جنوبی چین پر انھوں نے قبضہ کر لیا۔ اور ادھر سے چینیوں کی رسد بند کر دی۔ اس کے دوسرے ہی دن جاپانی ہوائی جہاز وائی چاؤ اور دوسرے اہم شہروں پر دل کھول کر بم برسائے یہاں تک کہ کان ٹون خطرے میں آ گیا۔ پھر یورپ کی فضا کو موافق دیکھ کر ان کے حوصلے اور بڑھتے گئے۔ میونخ کی مصالحت کے بعد جاپانیوں کو اور گھمنڈ ہو گیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب برطانیہ نہیں لڑے گا اس لئے وہ پوری قوت کے ساتھ کان ٹون کی طرف بڑھتے گئے۔ ۱۵ اکتوبر کو تو انھوں نے اعلان بھی کر دیا کہ ہم نے وائی چاؤ کو فتح کر لیا ہے۔ پھر ہانکاؤ کی جانب شمال اور جنوب، دونوں طرف سے جاپانی فوجیں بڑھتی گئیں اور ان کو توقع تھی کہ کان ٹون پہنچنے تک ان کی زیادہ مزاحمت نہ ہو گی۔ بالآخر ۲۱ اکتوبر کو کان ٹون بھی فتح ہو گیا اور اس کے چھ دن بعد جاپان نے ہان کاؤ پر بھی قبضہ کر لیا۔

واخر نومبر میں جاپانیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یہ اب تک تو صرف چینیوں پر ہاتھ صاف کرتے تھے لیکن اب باہر کی قوموں سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ہانگ کانگ کے قریب انھوں نے چند ناکوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر ۳ دسمبر کو ہانگ کانگ ڈلٹا پر قابض ہو گئے۔ یہاں سے وہ مغرب کی طرف بڑھنے لگے اور چینیوں کو اس طرف سے جو اسلحہ پہنچتے تھے ان کو روک دیا۔ ۱۵ دسمبر کو ہان کاؤ کے فرانسیسی مراعاتی علاقے میں ایک نیا گل کھلا۔ یعنی جاپانیوں نے ان کے غلہ اور پانی کی رسد بند کر دی۔

یہ تھی چین اور جاپان کی خونیں داستان۔ اس جھگڑے کو شروع ہوئے ۷ جولائی ۱۹۳۹ء تک پورے دو سال ہو گئے مگر نہ چینی ہار مانتے ہیں اور نہ جاپانی تھکتے ہیں۔ اس دوران میں جاپان نے چین کے پانچ بڑے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سات نہایت اہم شہر بھی ہیں۔ شمال سے جنوب کی طرف آئیں تو جاپان کے مفتوحہ صوبے اور شہر یہ ہیں :- ہوپی (پی پنگ، تین تسن)، کیانگ سو (شنگ ہائی، نان کنگ)، ہوپے (ہان کاؤ) کوان تنگ (کان ٹون) اور شیج وان۔ شیج وان کے صوبے میں چین کا نیا صدر مقام چنگ کنگ بھی واقع تھا مگر جب صوبے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو چنگ کنگ اس سے الگ ہو گیا اور وہ اب تک چینیوں کے قبضے میں ہے۔ ان تمام صوبوں میں کوئلہ پایا جاتا ہے۔ چین میں تیل کا سب سے بڑا مخزن ہوپی ہے اور ہوپی اور آن ہوئی میں لوہا موجود ہے۔ شمالی چین خصوصاً شان تنگ، ہوپی اور شانسی میں روئی خوب پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب جاپانیوں کے قبضے میں

آگئے ہیں۔ ہانگ کانگ کو چھوڑ کر چین کی تمام بندرگاہیں اور اہم صنعتی مرکز سب جاپانیوں کے قبضے میں ہیں اس لئے چین کی بیرونی ملکوں سے تجارت بھی ختم ہوگئی ہے۔

اس دار و گیر کے باوجود جنگ اب تک جاری ہے! اس طویل جنگ و جدل کے باوجود اب تک جاپان نے چین میں اپنے قدم نہیں جمائے ہیں جنگ تو اس یقین کے ساتھ شروع کی گئی تھی کہ چینیوں میں مقابلے کا دم خم نہیں ہے بلکہ جاپانی یہ سمجھتے تھے کہ وہاں چینی ان کا خیر مقدم کریں گے اور بعض جگہ زبردستی اور کہیں اتحاد عمل سے ان کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی لیکن ان توقعات کے برخلاف "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا" یوں تو جاپانیوں نے ہر مورچہ فتح کر لیا اور چینی حکومت جنوب مغرب کے پہاڑوں میں بند ہو گئی ہے مگر متواتر شکستوں کے باوجود چینیوں نے قزاقانہ جنگ سے جاپانیوں کو اتنا دق کیا ہے کہ وہ مفتوحہ چینی علاقوں کو ابھی اپنا نہیں کہہ سکتے۔ اب اگرچہ چینی اپنی شکست سے انکار نہیں کر سکتے لیکن ان میں قومیت کا جذبہ بہت کچھ موجزن ہو گیا ہے اور ان کے دلوں سے جاپانی ناسور چنگا نہیں ہوگا۔ اگر موجودہ چینی سلطنت کا خاتمہ بھی ہو جائے تو جاپانیوں کو پورے ملک میں فوج رکھنا اور اس پر کافی روپیہ خرچ کرنا ہوگا ظاہر ہے کہ ان حالات میں جاپانی ضرور تشویش میں ہیں پھر چینی سلطنت بھی کچھ ایسی سخت جان ہے کہ اس کا جلد خاتمہ نہیں ہوتا! ادھر روس مجبور ہے کہ چین کی مدد کرے اور روس سے آخر کب تک جاپان لڑتا رہیگا!

جاپان کی اندرونی حالت دیکھئے تو وہ بھی ان کے لئے پریشانی سے خالی نہیں ۱۹۲۶ء کے زلزلہ کے بعد سے جاپان میں برابر انتشار ہے اس میں شک نہیں کہ جاپان کی ایک سخت جان قوم ہے ان لوگوں میں وطنی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے لیکن چین کی جنگ میں جاپانیوں پر بھی کچھ کم آفتیں نہیں آئیں۔ جنگ کے اخراجات کے لئے حکومت کو مجبوراً قومی قرضے کی مد کھولنی پڑی سونے اور چاندی کے محفوظات بھی اب ختم ہو رہے ہیں ملک کی اندرونی معاشی حالت برابر خراب ہوتی جارہی ہے شہزادہ کونائے جو صدر اعظم تھے مستعفی ہو گئے اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل ہوئی جس کے وزیر اعظم بیرن ہیرانما ہیں اس نئی کابینہ میں مسٹر ارتیٹا وزیر خارجہ، مسٹر اٹاگاکی وزیر جنگ اڈمیرل یونیا وزیر بحریہ، مارکوئس کائڈو وزیر داخلہ اور مسٹر اشیواتاری وزیر مالیہ ہیں۔ جاپانی کابینہ میں فوجی عنصر ابتک غالب ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کے اندرونی اختلافات مٹ گئے۔ اگر چین کی جنگ زیادہ عرصے تک جاری رہی اور جاپانی مالیہ پر برابر بار پڑتا رہا تو بہت ممکن ہے کہ خود جاپان میں ایک نیا فتنہ جاگ اٹھے۔

ابھی حال میں روسی وزیر خارجہ مولوتاف نے روس کے مسلک کو واضح کیا ہے۔ بیرونی منگولیا کو جاپان نے جو دھمکیاں دی ہیں اس کی وہ مذمت کرتے ہیں انھوں نے اعلان کیا ہے کہ "اس بدتمیزی کی کوئی حد ہونی چاہئے اب وقت آگیا ہے کہ جاپان اپنی بیہودگیاں ختم کر دے"۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ہم بیرونی منگولیا کی سرحد کی پوری طرح مدافعت کریں گے"۔ اس کے بعد انھوں نے اسٹالن کے اعلان کا تذکرہ کیا کہ روس آزادی کی حفاظت کے لئے ہر قوم کی مدد کرنے تیار ہے اور صاف صاف بتا دیا کہ روسی حکومت اب چین کی عملی طور پر مدد کر رہی ہے۔

آج کل یورپ کے تمام اعضائے سیاسی ڈانزگ کے مسئلے پر نگاہ لگائے ہوئے ہیں اور دنیا حیران ہے کہ ہٹلر ڈانزگ کو بغیر لڑے کس طرح ہضم کرے گا۔ ابھی حال کا واقعہ ہے کہ پولستان کے ایک افسر کو سرحد پر مار دیا گیا اور پچھلے چند دنوں سے تو عجیب طرح کی خبریں آرہی ہیں۔ پولستانی سرحد کے عہدہ داروں کو کھانے پینے کی چیزیں وقت سے مل رہی ہیں اور وہ مختلف طریقوں سے ستائے جارہے ہیں پھر اطالوی اور جرمنی منادرسے بھی خطرے سے خالی نہیں۔ پولستانی سرحد پر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ جرمن فوج جمع ہوگئی ہے۔ ان حالات میں ڈانزگ اور پولستان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن عملی طور پر فرانس اور برطانیہ نے پولستان کی حمایت میں اب تک کچھ نہیں کیا۔ پولستانی فوج کے انسپکٹر مارشل اسمگلی رٹز نے ۶ راگست ۳۹ء کو ایک تقریر کی تھی اور پولستان کا مسلک واضح کیا تھا کہ وہ ڈانزگ کے لئے لڑنے پر بھی آمادہ ہے۔ اس جرادت پر فرانس اور برطانیہ نے اظہار خوشنودی تو کیا ہے لیکن ابھی وہ روس کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف ہیں جس کا نتیجہ آج تک نہیں نکلا۔ چوں کہ انگریز روسی گفت وشنید میں الجھے ہوئے ہیں اس لئے جاپانیوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ وہ انگریزوں کو تین سٹسن میں بہت ستارہے ہیں۔ اگرچہ مسٹر ارتیٹا اور رابرٹ کریجی اس معاملے میں بات چیت کر رہے ہیں لیکن اب تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا۔ ابھی چند روز پہلے مسٹر چمبرلین نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ :- "ممکن ہے کوئی بحری بیڑہ مشرق بعید کی طرف بھجوانا پڑے۔" اس کو جاپانی دھمکی سمجھ رہے ہیں اور تین سٹسن کے انگریزوں کی مصیبتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جاپانیوں کے اس غصے کا ٹوکیو کی گفت وشنید پر بھی اثر پڑے اور گفتگو کا کوئی خوش گوار نتیجہ نہ نکلے۔ شاید جاپانی یہ سمجھتے ہیں کہ انگریز مشرق بعید کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرنے کے قابل نہیں ہیں! اس لئے وہ جتنا ہوسکے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ رہا امریکہ سو وہ اس بات کا تصفیہ نہیں کرسکا کہ آیا اس کو غیر جانبداری کے مسلک پر قائم رہنا ہوگا یا باہر کے معاملات میں الجھنا پڑے گا۔ اگرچہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے جاپان کے تجارتی معاہدے کو آئندہ کے لئے ختم کر دیا ہے اور امریکہ کے تجارتی نمائندے مسٹر ارنلڈ نے جو ابھی ایک سال کے بعد چین واپس آئے ہیں، چینیوں کو یقین دلایا ہے کہ امریکہ کو چین کے ساتھ بہت ہمدردی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر روزویلٹ کی کوششوں کے باوجود امریکہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوگا کہ باہر کے معاملات میں حصہ لے۔ امریکہ اور برطانیہ تو دنیا کی دوسری طرف ہیں لیکن اب جاپانیوں کا صرف روس سے مقابلہ ہے۔ آئندہ واقعات کی رفتار سے معلوم ہوسکے گا کہ ان دونوں فریقوں میں جیت کس کی ہوگی۔

یورپ

یورپ کی تمام سیاسی بے چینی جو اس وقت یورپ اور ایشیا کو ڈرا رہی ہے، جنگ عظیم کا نتیجہ ہے۔ یہ جنگ جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک رہی اپنے پیچھے بہت سی یادگاریں چھوڑ گئی ہے ظاہر ہے کہ جنگ میں ہر فریق کا نقصان ہوتا ہے لیکن جو طاقتیں اس جنگ میں مغلوب ہوئی تھیں ان کا تو بیحد نقصان ہوا۔ جانی اور مالی نقصان کے علاوہ ان پر اور بھی بہت سی مصیبتیں آئیں چنانچہ ان مفتوح قوموں پر بڑی بڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ان کے ملکوں کے حصے بخرے کئے گئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان پر تاوانِ جنگ بھی اس طرح سے عائد کر دیا گیا کہ وہ سر نہ اُٹھا سکیں۔ غرض ان قوموں نے جن کی جنگ میں جیت رہی خوب فاتحانہ شان دکھلائی اور ہر طرح مفتوح قوموں سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ان فاتحوں کا جن میں انگریز اور فرانسیسی زیادہ نمایاں ہیں، اصلی منشا یہ تھا کہ شکست خوردہ قوموں کو اس طرح کچل کر رکھ دیں کہ وہ دوبارہ اُبھر نہ سکیں چنانچہ ترکی کو جس سے ان کی دیرینہ مخاصمت تھی ایسا کچل دیا کہ بظاہر وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ جرمنی کی حالت دوسرے درجہ پر تھی صلحنامہ ورسائے کے ذریعہ جو ۱۹۱۹ء میں طے پایا تھا، اس کو سخت مجبور کر دیا گیا! اس ورسائے کے صلح نامہ کو جنگ عظیم کی سب سے بڑی یادگار سمجھنا چاہیئے کیونکہ یورپ کی موجودہ سیاسی بے چینی کا ذمہ دار بڑی حد تک یہی صلح نامہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سیاست اور اخلاق دو جداگانہ چیزیں ہیں لیکن کسی ہارے ہوئے فریق پر اتنا بوجھ ڈالنا کہ وہ سر نہ اُٹھا سکے یقیناً زیادتی ہے۔ یوں تو جنگ عظیم میں ہر فریق نے برابر کا حصہ لیا تھا اور اس کے نتائج کے دونوں ذمہ دار تھے لیکن ورسائے میں فاتح فریق نے سارا الزام ہزیمت خوردہ فریق کے سر تھوپا اور اس سے جتنا ہو سکا بدلہ لے لیا چنانچہ ورسائے کے صلح نامے میں جو امن کی شرطیں طے کی گئی تھیں، ان کی رو سے جرمنوں نے اپنے ملک کے بہت سے علاقے کھو دیئے۔ الساک اور لورین، فرانس نے چھین لئے، سرحد کے بہت سے اضلاع بلجیم کے حصے میں آئے، کچھ علاقہ ڈنمارک کو دیا گیا، سیلیشیا کا جنوبی حصہ پولستان کو ملا اور ضلع میمل لتھونیا کو دیا گیا۔ رہائن کے ساحلوں سے جرمن فوجیں ہٹا دی گئیں۔ جرمنی کا علاقہ سار ایک بین قومی کمیشن کے تحت کر دیا گیا۔ پھر اتحادیوں نے جرمنوں سے ان کی تمام نوآبادیاں بھی چھین لیں اور جرمنی کو تحدید اسلحہ کے لئے مجبور کیا۔ جرمنی کے

بحری اور بری راستے بھی چھین لئے گئے اور اس پر غیر معمولی قرضہ عائد کیا گیا۔ ترکی کو بھی جو جنگ میں جرمنی کا ساتھی تھا اس سے زیادہ نقصان پہنچا چنانچہ ۱۹۲۰ء میں سیورے کا جو معاہدہ طے پایا اس کی رو سے ترکوں کے تمام علاقے چھین لئے جانے کے بعد ترکی کی سلطنت سمٹ سمٹا کر صرف ایشیائے کوچک میں محصور ہوگئی۔ ان تمام زیادتیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور ترکی کو جو اس طرح جنگ کے شکار ہوئے تھے ایسے افلاس سے دوچار ہونا پڑا کہ اگر غیر معمولی حالات نہیں پیدا ہوتے تو ان کا پھر دنیا میں ابھرنا ناممکن تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ زیادتیاں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں چنانچہ ہزیمت خوردہ قومیں فاتحوں کی اور دشمن ہوگئیں اور یورپ میں مطمئن اور غیر مطمئن قوموں کے دو فریق بن گئے۔ غیر مطمئن مملکتیں یعنے وہ جنھیں صلح نامہ ورسائے وغیرہ سے سخت نقصان اٹھانا پڑا مطمئن مملکتوں کی مخالفت پر آمادہ ہوگئیں۔ ایسے ملک جو جنگ میں ہار گئے تھے یعنے ترکی، جرمنی، وہ تو غیر مطمئن تھے ہی لیکن بعد کو ان کے گروہ میں اٹلی اور روس کے جیسے ممالک بھی شامل ہو گئے جو اگرچہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ تھے لیکن جنگ کے بعد کے صلح ناموں سے ان کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا غیر مطمئن گروہ انگلستان اور فرانس کی راست مخالفت کرنے لگا اس طرح یورپ میں مطمئن اور غیر مطمئن مملکتوں کے دو فریق بن گئے جو برابر ایک دوسرے کے دشمن رہے۔

جنگ کی ایک اور یادگار یہ تھی کہ ساری دنیا کو جنگ کے بعد ایک بڑی معاشی پستی سے دوچار ہونا پڑا۔ جنگ کے مصائب اور معاشی پستی کے اثرات سرمایہ داروں کے مقابلے میں اوسط اور ادنی طبقے پر زیادہ پڑے تھے اسی لئے ان طبقوں میں معاشی اور سیاسی بیداری پیدا ہوگئی چنانچہ یہ طبقے سرمایہ داری کے خلاف سرکف ہو گئے اور انھوں نے شاہی، شہنشاہیت اور سرمایہ داری کو ختم کر دینا چاہا۔ یورپ کی شاہیاں سب سے پہلے ان کا نشانہ بنیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے سرمایہ دار طبقے کمزور پڑ گئے۔ شخصی حکومتیں بالکل ختم کردی گئیں۔ کہیں جمہوریت کو جگہ ملی اور کہیں اشتراکیت کا تخیل پیدا ہوا۔ اشتراکی انقلاب کا بڑا مخزن روس تھا۔ روس میں سرمایہ داری کو ختم کرکے حکومت کا ایک نیا تجربہ کیا گیا یعنے طبقہ ارزل ہی کو حکومت میں شامل کیا گیا۔ اس نئی تحریک کا اثر دوسرے ملکوں پر بھی پڑنے لگا اور سرمایہ داری کے مخالف زور پکڑنے لگے۔ چنانچہ خود انگلستان میں ۱۹۲۴ء میں لیبر جماعت کی حکومت قائم ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں میں جہاں اشتمالیت کی تحریک کا اثر پڑا تھا، سرمایہ دار اور اشتمالی دو فرقے پیدا ہوگئے تھے۔ یورپ میں سرمایہ دار اور اشتمالی نکتہ خیال کے دو مختلف گروہ بن گئے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں تصادم لازمی تھا چنانچہ پچھلے چند سال میں دونوں

فرقوں نے یورپ کی سیاست میں ایک ہنگامہ برپا کیا تھا جسے اب وسطی یورپ کے آمروں نے کچھ کم کردیا ہے۔
جنگ کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ اس طوفان میں پارلیمنٹی حکومتیں بے دست و پا ہوگئیں۔ اس کا علاج آمریت تھا کیونکہ جب ملک میں عمومیت ناکام ہو جائے ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علحدہ بنانے لگے اور سیاسی فرقے آپس میں لڑنے لگیں تو اس موقعہ پر کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو ایک ڈنڈے کے ذریعہ تمام افراد مملکت کو ایک کردے۔ چنانچہ اطالیہ میں یہی ہوا۔ ملک کے حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اگر مسولینی کی فاشسٹ جماعت حکومت پر قبضہ نہ کرتی تو اطالیہ کہیں کا نہ رہتا۔ مسولینی نے تمام افراد مملکت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا اور ان کو ایک متحد قوم بنا دیا۔ فاسیت کا اثر جرمنی پر بھی پڑا اور وہاں ہٹلر برسر اقتدار آگیا۔ فاسیت اور اس کا مستخرج نازیت کا فلسفہ اشتمالیت کے بین الاقوامی اور عالمگیر تخیل کے برخلاف بہت زیادہ قومی ہے۔ اس طرح فاسیت اور نازیت کے حامی ایک ہی برادری میں آگئے اور اطالیہ اور جرمنی دونوں متحد ہوگئے۔ چونکہ اشتمالیت اور فاسیت کے عقیدے میں بنیادی فرق ہے اس لئے یہ دونوں ازل سے ایک دوسرے کے دشمن رہے۔ پھر فاسیت کا فرقہ انگلستان اور فرانس کا بھی بہت دشمن ہے کیونکہ اس کو معاہدہ ورسائی کے ذریعہ نقصان پہنچایا گیا تھا۔ چنانچہ انگلستان اور فرانس سے اطالیہ اور جرمنی کی موجودہ پرخاش اسی دشمنی کا نتیجہ ہے اور گذشتہ جنگ ہی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔

اس طرح یورپ میں سیاسی نظریوں کے لحاظ سے تین فریق ہوئے یعنے روس کا اشتمالی فریق، اطالیہ اور جرمنی کا فاشسٹ فریق، اور تیسرا انگلستان، فرانس اور بلجیم کا فریق جو جمہوریت کا علمبردار ہے۔ نازیت اور فاسیت کے حامی ان دونوں فرقوں یعنے اشتمالی اور جمہوری ملکوں سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اشتمالی گروہ سے اس لئے کہ اس کے بنیادی عقائد سے ان کو اختلاف ہے اور جمہوریت کے فریق سے اس لئے کہ گذشتہ جنگ کی زبردستیوں کا اس سے بدلہ لینا ہے۔ اشتمالی فریق فاسیت کا تو مخالف ہی ہے لیکن اسے جمہوری مملکتوں سے بھی کد ہے کیونکہ وہ سرمایہ داری کی علمبردار ہیں۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اشتمالی فریق فاسیت کی مخالفت میں فاشسٹ فریق کو کچلنے کے لئے جمہوریت کا ساتھ بھی دے دے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یورپی قوموں کی یہ فرقہ بندی محض نظریوں کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ملک گیری کی ہوس اور اپنے منفعت کے لئے دوسری قوموں کا گلا کاٹنے کی خواہش ہر فریق میں موجود ہے اور اپنے حصول مقصد کے لئے کسی فریق کو اچھی اور بری بات کی تمیز نہیں ہوتی۔ اپنے مقصد کے لئے وہ کبھی تنہا کوشش کرتا ہے کبھی کسی فریق کی قوت کو

زیادہ دیکھ کر اس سے دب جاتا ہے اور کبھی تیسرے فریق کو ملا کر اپنے حریف کی جڑیں کاٹنی چاہتا ہے۔ بہر حال یورپی سیاست کی موجودہ رفتار کو سمجھنے کے لئے ان تین فریقوں اور ان کی حکمت عملی کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے۔

روس

اشتمالی انقلاب سے جو ۱۹۱۷ء میں ہوا روس کی تاریخ بالکل بدل گئی جس کو ازمنہ ماضی سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ اشتمالیت کا ایک معاشی نظام ہے جس کی داغ بیل جرمنی کے مشہور مفکر کارل مارکس نے ڈالی تھی۔ اس کا منشا سرمایہ داری کو ختم کرکے جو مختلف اخلاقی اور سیاسی بے اطمینانیوں کا باعث ہوتی ہے ملک میں دولت کی ہموار تقسیم کرنا ہے۔ سرمایہ داری کا بھوت ملک کے ذیلی طبقوں کو جن کی تعداد بہت ہوتی ہے خوش حال نہیں بنا سکتا۔ ایک طرف سرمایہ داروں کا ظلم اور زبردستی اور دوسری طرف ذیلی طبقوں کی بے بسی ایک کشاکش پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ چنانچہ روس میں یہی ہوا یعنے یہ طبقہ واری کشمکش ایک بڑے انقلاب کی صورت میں رونما ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے تمام ملک اشتمالی ہوگیا۔ روس کی اس اشتمالی تحریک کو ایک بڑے معاشرتی اور معاشی نظام کا تجربہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں مشرقی اور مغربی دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں اس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں کسی سیاسی عقیدے کو عملیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کامیاب ہوسکے گی۔ پرانے نظام معاشرت اور روایات کو توڑنا آسان نہیں ہے کیونکہ جب زندگی ایک مرتبہ اپنی پرانی روش چھوڑ دیتی ہے تو پھر کسی ڈھرے پر لگتے لگتے بہت سے پلٹے کھاتی ہے۔ روس کی کشتی ابھی بھنور سے نکلی نہ تھی کہ اس کے ناخدا بیرونی معاملات میں الجھ گئے اور ظاہر ہے کہ اس طرح روس کی اندرونی گتھیاں ابھی اچھی طرح نہیں سلجھیں۔

اس جدید نظام معاشرت و سیاست کا مختصر خاکہ یہ ہے۔ یعنے روس میں اب بوڑھے آدمی باقی نہیں رہے کیونکہ جو قدامت پرست تھے وہ ملک سے خارج کر دیئے گئے اور جو بچے کچھے تھے وہ پچھلے بیس بائیس برس کی مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ روسیوں کے پاس مذہب کوئی چیز نہیں۔ اشتمالیت ہی ان کا مذہب ہے۔ اور ایک زمانے میں تو لینن ان کا خدا تھا اور اب اسٹالن ان کا رب ہے۔ ان کے پاس مملکت یا اسٹیٹ کا بھی کوئی تخیل نہیں۔ یہ لوگ تمام بین مملکتی تعلقات ایک انسانی اخوت کے رشتے میں

منسلک کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے سامنے قومی اور جغرافی بندھنیں ٹوٹ جائیں۔ اگر روسی اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوں تو ان کے خیال میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں دولت کی تقسیم ضرورت اور حق کے لحاظ سے مناسب طور پر ہوسکے گی۔ مزدور سرمایہ داری کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے اور جب سرمایہ داربانی نہ رہیں گے تو جنگ و جدل کا نام ہی دنیا سے مٹ جائے گا۔ روس میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں رکھا گیا اس لئے لوگ یہاں صاحب جائداد نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہاں جنس اور طبقے کا امتیاز بھی مفقود ہے۔ یعنے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا اور ملک کے تمام افراد "مزدور" ہیں اور ان کو مزدور بننا پڑتا ہے۔ کیونکہ قانون کی رو سے ہر شخص کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ روس کی اسّی فی صد آبادی لکھنا پڑھنا جانتی ہے اور وہاں بے روزگاری بھی نہیں ہے۔ بیمار مزدوروں کے ساتھ بہت رعایت کی جاتی ہے اور بیماری کے زمانے میں انھیں پوری مزدوری ملتی ہے اور ہر شخص کو پوری تنخواہ پر سال میں تین چار ہفتے کی چھٹی دی جاتی ہے۔ بڑوں کی سکونت کے لئے اچھے کیمپ اور بچوں کے لئے پرورش گاہیں اور کھیل کود کے میدان مہیا ہیں۔ جہاں تک جرائم کا تعلق ہے روسی چوری اور قتل کو ایسے جرم نہیں سمجھتے جو مجرم کے لئے باعث شرم ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ چوری اور قتل اس وقت سرزد ہوتے ہیں جبکہ نظام معاشرت اور تربیت خراب ہو۔ اس کے برخلاف روسیوں کے ہاں سب سے بڑی برائی سیاسی جرم یا غداری ہے۔

لینن نے جو اشتمالی اصول قرار دیئے تھے وہ پہلے بہت خوشگوار معلوم ہوتے تھے لیکن عملی طور پر یہ خشک اصول مفید مطلب ثابت نہیں ہوئے کیونکہ ملکیت کو غائب کرنے سے پیدائش دولت کا محرک ہی فنا ہوگیا۔ جب مزدوروں اور دوسرے حکومت کے عمال کی ضرورتیں سرکار سے پوری ہو جاتی ہیں تو ان کو زیادہ جفاکشی اور انہماک کی ضرورت باقی نہیں رہتی یہ قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص اپنی چیز کا خود مالک ہو تو اس کو ترقی دیتا ہے۔ اس لئے پچھلے اصولوں میں بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں چنانچہ ان خشک اصولوں کی نظر ثانی کرکے اب حکومت نے اجتماعی کاشت میں انفرادی حق بھی داخل کر دیا ہے۔ جدید قواعد کی رو سے کھیتوں کے انتظام میں کسان کو زیادہ آزادی اور شخصی ملکیت کا حق عطا کیا گیا ہے پھر ہر شخص کی آمدنی اس کی ملکیت قرار دی گئی ہے جو قانوناً محفوظ اور موروثی مانی گئی ہے اس نئے مسلک سے اب لوگوں کو اپنی ملک پیدا کرنے کی تحریکیں ہونے لگی اور وہ پورے شوق کے ساتھ کام کی طرف مائل ہو گئے۔ تعلیمی اور معاشی سلک میں بھی بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ ماں باپ کو اپنے بچوں پر بہت کچھ اختیارات دیئے گئے۔ نئے دستور میں قومی نمائندگی کا اصول بھی جاری کیا گیا ہے جس میں مرد اور عورتیں غیر مشروط

طور پر رائے دے سکتے ہیں اور ملک کی نمائندہ جماعت حکومت کرتی ہے۔ نئے دستور میں اشخاص کی آزادی کا خاص خیال رکھا گیا ہے چنانچہ کوئی روسی بلاحکم عدالت گرفتار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی تلاشی لی جا سکتی ہے۔

شروع سے اشتمالیت کو ایک عالمگیر تحریک بنانے کی کوشش کی گئی کیونکہ جب تک یہ عالگیر نہ ہو یعنے آس پاس کی مملکتیں بھی اشتمالی نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ نظام معاشی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے لئے مزدوروں کو متحد کرکے ان کو سرمایہ دار اور امتیازی طبقوں کے خلاف برسر پیکار کرنا ضروری ہے۔ لہذا یہ طبقہ واری کشمکش ہر جگہ شروع ہو گئی اور روسیوں نے ایک عالمگیر انقلاب کی کمیٹی بھی بنالی تاکہ کسی باضابطہ نظام العمل کے تحت انقلابی کارروائی کی جا سکے لیکن اشتمالیت کا بین الاقوامی تخیل صرف اصول کی حد تک رہا عملی لحاظ سے خود روس ہی میں قومیت کی تنگ نظری موجود ہے اور اس کی برائیاں ملک میں سرایت کر رہی ہیں۔

اگر روس میں جو اشتمالیت کا گہوارہ ہے اس کے نظریوں کو پوری عملیت حاصل نہ ہو تو ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں پر اشتمالیت کا اثر دیرپا نہیں ہو سکتا چنانچہ جہاں کہیں اشتمالیت پسند طبقے حکومت پر حاوی ہوئے، ان کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوا بلکہ ان کو ہمیشہ اپنے مخالفوں سے مرعوب ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے وہ قوم کی اصلاح اور ترقی کا کوئی تیاراستہ دریافت نہ کر سکے چنانچہ جرمنی میں یہی ہوا جنگ عظیم کے بعد وہاں مزدوروں کی کوشش سے ایک نیم اشتراکی حکومت قائم ہوئی تھی مگر چار سال بعد خود اسی حکومت نے ہنڈن برگ کو جو قیصر کی فوج کا سپہ سالار اور ایک بڑا زمین دار تھا، مملکت کا صدر منتخب ہونے دیا۔ انگلستان کی لیبر جماعت کے رہبر بھی ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد قدامت پسند فرقوں کے سامنے جھک گئے۔ باہر کے ان نیم اشتراکی فرقوں کی کمزوری کے علاوہ ان کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ روسی ان سے خوش نہ تھے چنانچہ انہی وجوہات سے اشتمالیت کی تحریک آگے نہ بڑھ سکی اور انگلستان میں لیبر جماعت کی پہلی حکومت اور جرمنی میں انتہا پسند اشتراکیوں کی زندگی اسی بنا پر ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ یورپ کے موجودہ صنعتی نظام نے بھی کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ مزدور طبقے کی قدر و منزلت گھٹتی جا رہی ہے۔ تقریباً ہر ملک میں متوسط طبقے کی قوت بڑھ گئی ہے اور وہ سرمایہ داروں سے مل کر مزدوروں کی طاقت توڑ رہے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اب مزدور سرمایہ داروں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے۔

جب اسٹالن نے ملک کے تعمیری کاموں کی طرف اپنی توجہ وقف کر دی، روس کے عالمگیر انقلاب کی کمیٹی کے معاملات پیچھے پڑ گئے۔ چنانچہ کئی سال تک اس کا اجلاس نہیں ہوا لیکن ٹراٹسکی کے اخراج کے بعد

اس کمیٹی نے دوبارہ حرکت کی۔ مگر اس نے یورپ کی بجائے ایشیا پر زیادہ توجہ کی۔ چونکہ اب چین میں روس کا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے اور پھر جاپانی منچوکو کی سرحد روس سے ملتی ہے اس لئے چین اور جاپان کی جنگ میں روسی الجھ گئے ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ چین پر جاپان کا اثر بڑھتا جائے۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ روسیوں کو چین سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ وہ سب کچھ اپنے مفاد کی خاطر کر رہے ہیں۔ چونکہ جاپانی بیرونی منگولیا کو دھمکیاں بھی دے رہے ہیں اس لئے روسیوں کا فرض ہے کہ وہ منگولیا کی سرحد کی مدافعت کریں۔ چین اور جاپان کی لڑائی، جولائی ۱۹۳۷ء سے شروع ہوئی تھی جو اب تک جاری ہے۔ چونکہ اب یہ لڑائی چین اور جاپان کے درمیان نہیں بلکہ روس اور جاپان کے درمیان ہو رہی ہے، اس لئے نتیجے کی جلد توقع بھی نہیں ہو سکتی۔ اس بات کا تصفیہ کہ ان دونوں فریقوں میں جیت کس کی رہے گی آئندہ واقعات ہی کریں گے۔

ابھی مشرق بعید کے قضیے سے روس کو چھٹکارا نہ ہوا تھا کہ اسے وسطی یورپ کے سیاسی طوفان کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ ہٹلر اور مسولینی ملک گیری کی ہوس میں برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جرمن ڈانزگ کو بغیر لڑائی کے ہضم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خطرہ روس کے لئے بھی تشویش سے خالی نہیں۔ پھر انگلستان اور فرانس اپنی "امن پسند برادری" میں روس کی شرکت ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عرصے سے ان جمہوری مملکتوں کے نمائندے روس کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہیں لیکن بدقسمتی سے اب تک کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا۔ ترکوں اور انگریزوں کے میثاق سے جو ابھی مئی میں ہوا، انگریز بہت خوش ہو گئے تھے کیونکہ یہ خیال تھا کہ روس بھی ان کے ساتھ اشتراک عمل کرے گا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ روسیوں کے ترکوں سے خوشگوار تعلقات ہیں، روسی اب تک اس اشتراک عمل کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتراک عمل کی اس گفت و شنید میں بحر بالٹک کا مسئلہ سنگ راہ ہے۔ روس یہ چاہتا ہے کہ اس اشتراک عمل میں اس کی تمام مغربی سرحدیں بھی شامل رہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ انگلستان، فرانس اور روس تینوں مل کر بالٹک کی ریاستوں یعنی فن لینڈ، استھونیا اور لٹویا کی بقا کا ذمہ لیں۔ ۱۹۱۸ء میں ان ریاستوں کی تشکیل ہوئی تھی اور اس کے لئے جرمنی اور روس کے بہت سے حصے لئے گئے تھے۔ اب یہ تینوں ریاستیں آزادی کا دم بھرتی ہیں اور جغرافی و تجارتی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ان ریاستوں سے روس اور جرمنی دونوں کا لین دین ہے لیکن روس کے نزدیک ان کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ وہ موسم سرما میں انہی بندرگاہوں سے کام لیتا ہے کیونکہ صرف یہی ایسی بندرگاہیں ہیں جو برف سے خالی رہتی ہیں۔ بالٹک کے مسئلے کے علاوہ

ایک یہ بات بھی ہے کہ ہر فریق متضاد سیاسی نظریوں کا علمبردار ہے۔ یعنے انگریز اور فرانسیسی سرمایہ داری کے حامل ہیں تو روسی اشتمالیت کے قائل ہیں چنانچہ اسی وجہ سے یہ سلطنتیں پچھلے کئی سال سے متحد نہیں ہوئیں اور وہ ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اب موجودہ رفتار واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسوں کو روسی اشتراک عمل کی توقع ہے۔ اگر روس نے "امن پسند برادری" کے ساتھ واقعی اشتراک عمل کر لیا تو اسے لازمی طور پر وسطی یورپ کی سیاست میں حصہ لینا پڑے گا۔ اور چین کے میدان کے علاوہ روس کو یورپ کے نئے محاذ جنگ کے لئے بھی تیاری کرنی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر روس انگلستان اور فرانس کے ساتھ معاہدہ نہ کرے تو قرائن یہ ہیں کہ شاید ہٹلر سے لڑائی نہ ہو اور ڈانزگ چپ چاپ جرمنوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

فرانس

فرانس یورپ کا ایک جمہوری ملک ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک یہاں ایک شاہی تھی جو انقلاب فرانس کے بعد ختم ہوگئی۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرانس کی سیاسی تاریخ اٹھارھویں صدی سے تلاطم خیز رہی ہے۔ یہاں ایک نہیں کئی انقلاب ہوئے اور حکومت کے بے شمار تجربے کئے گئے چنانچہ انقلاب فرانس کے بعد ۱۷۹۳ء میں جمہوریت قائم کی گئی لیکن چند ہی روز میں نپولین نے اپنی شہنشاہت قائم کر دی نپولین کے بعد اس کے جانشین بھی خود سرانہ حکومت کرتے رہے مگر ۱۸۴۸ء میں اس شخصی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا اور دوبارہ جمہوریت قائم کی گئی لیکن یہ جمہوریت بھی کچھ عرصے کے لئے معطل رہی اور شہنشاہ نپولین سوم نے ۱۸۷۰ء تک عنان حکومت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ بالآخر ۱۸۷۱ء میں تیسری مرتبہ جمہوریت قائم ہوئی جو تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔

انقلاب کی نوعیت اور اس کے نتائج اہل انقلاب کے مزاج اور سیاسی شعور پر منحصر ہوتے ہیں۔ فرانسیسی بہت جذباتی ہیں اسی لئے اس قوم نے بہت انقلاب کئے اور ان میں کئی سیاسی فرقے پائے جاتے ہیں۔ گو فرانس کا سیاسی دستور بڑی حد تک انگلستان کے دستور کی نقل ہے یعنے وہ ایک پارلیمنٹی نظام ہے لیکن متلاطم طبیعتوں کی وجہ سے فرانس میں اتنے سیاسی فرقے بن گئے ہیں کہ پارلیمنٹی نظام میں سنجیدہ اختلاف کے

خوشگوار نتائج جو انگلستان میں دیکھے جاتے ہیں، فرانس میں نہیں ہیں۔ اس فرقہ بندی میں کابینہ کی تشکیل بہت مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ کئی فرقوں کو یکجا کر کے کثرت بنانی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کثرت زیادہ دن تک باقی نہیں رہ سکتی کیونکہ جب کسی فرقے کو وزارت سے اختلاف ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وزارت ٹوٹتی ہے اور دوسری وزارت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے فرانس میں کوئی دو درجن سے زیادہ وزارتیں بدل چکی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں انتہا پسندوں کا زور تھا اور اشتراکی برسر اقتدار تھے لیکن حکومت پر رفتہ رفتہ اعتدال پسندی کا رنگ چڑھتا گیا۔ چنانچہ جب کبھی وزارتیں ٹوٹیں اور ان کی جگہ نئی وزارتیں مرتب ہوئیں، ان میں اعتدال پسندوں کا عنصر بھاری ہو گیا۔ پھر بعد میں اشتراکی اور اشتمالی خیال کے آدمی وزارت سے بالکل خارج کر دئیے گئے۔ اشتراکی جماعت کی حکومت اس لئے ناکام رہی تھی کہ سرکاری بنک نے ان کی مخالفت کی اور بعد کو جب اعتدال پسند وزارتیں مرتب ہوئیں تو ان کے لئے یہ دقت تھی کہ مزدور ان کی مخالفت کرتے رہے۔ فرانس کی یہ اندرونی بے چینی اس وقت بھی کم نہ ہوئی جبکہ دشمن کے حملے کا خطرہ سر پر آ گیا۔ فرانس کی خارجی سیاست پر اس کا اثر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ جرمنی اور آسٹریا کے "اتحاد" اور چیکوسلوواکیا کی تقسیم کے موقعوں پر فرانس کو برطانیہ کی خوشامد کرنے اور ہٹلر کو خوش رکھنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

گو سولھویں اور سترھویں صدی میں فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے رقیب تھے لیکن بعد کو ان دونوں میں ایسی گہری دوستی ہوئی کہ فرانس ہر بات میں برطانیہ کا دم بھرنے لگا۔ جنگ عظیم میں فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور جنگ کے بعد مفتوح قوموں کو دونوں نے مل کر لوٹا۔ جنگ میں جو ملک ہار گئے تھے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان دونوں نے آپس میں بانٹ لئے اور دوسروں کی نوآبادیاں بھی چھین لی تھیں۔ چنانچہ معاہدہ ورسائے سے برطانیہ اور فرانس دونوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مطمئن گروہ "جسے معاہدہ ورسائے سے نقصان پہنچا تھا برطانیہ کے ساتھ فرانس کا بھی دشمن ہو گیا۔ اور اب فرانس کو پچھلے کرتوت کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اندرونی بے چینیاں تو ایک طرف رہیں، اب فرانس کو ان تمام مسائل کا مقابلہ کرنا ہے جو برطانیہ کو بھی پریشان کئے ہوئے ہیں۔ مشرق بعید میں جاپان ایک قوی دشمن ہے۔ پھر فرانس کے پڑوسی یعنے جرمنی اور اٹلی اسے چین لینے نہیں دیتے۔ مغرب میں اسپین کی ایک نئی طاقت

کھڑی ہوگئی جو فاسیت کے اثر میں ہے اور یہ یقیناً فرانس کی دشمن ہے! ان حالات میں فرانس کو برطانیہ کی قیادت قبول کرنی پڑتی ہے۔ فرانس اور برطانیہ دونوں نے مل کر پولستان اور دوسری ریاستوں کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لیا ہے لیکن یہ ضمانت اس وقت تک بے معنے ہے جب تک کہ روس ان کے ساتھ اشتراکِ عمل نہ کرے۔ ابھی حال میں فرانس نے ترکوں سے دوستی کرلی ہے اور اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکندرونہ ترکوں کو واپس مل گیا لیکن اس واقعہ سے اٹلی اور جرمنی فرانس کے زیادہ مخالف ہوگئے۔ اسکندرونہ کی تحویل کو وہ بُرا سمجھ رہے ہیں۔ شمالی افریقہ اور شام کی عرب آبادیاں علٰحدہ فرانس کے حق میں وبالِ جان ہیں۔ یہ ہیں فرانس کی سیاسی گتھیاں جو انگریزوں کی امداد کے بغیر سلجھ نہیں سکتیں اور نیز اس کا حل روس کے اعتماد پر منحصر ہے جس کے لئے گفت و شنید ہو رہی ہے۔

برطانیہ

برطانیہ عمومیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ یہ مملکت جو دُنیا کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے، تقریباً ہر براعظم میں اپنا عمل دخل رکھتی ہے۔ اس کا نظامِ حکومت پارلیمنٹی ہے اور وہ انگریزوں کی طبیعت کے لحاظ سے کچھ ایسا موزوں اور کامیاب ثابت ہوا ہے کہ دُنیا کی دوسری قومیں بھی اس کی نقل کرنا چاہتی ہیں۔ نازک سے نازک موقعوں پر بھی برطانوی وزراء نے اپنی سیاست کی کشتی اس کامیابی کے ساتھ بھنور سے صحیح سالم نکال لی کہ اس کی تعریف کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر یہی حالات کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوتے تو ایک بڑا انقلاب ہو جاتا لیکن انگلستان میں پارلیمنٹی حکومت کی کامیابی اس چیز میں مضمر ہے کہ انگریز صلاحیت پسند اور ٹھنڈے دل سے معاملات پر غور کرنے کے عادی ہیں! اس نظامِ حکومت کے ساتھ حالات اور وقت نے بھی انگریزوں کا بہت ساتھ دیا چنانچہ ان موقعوں سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے خوب جولانیاں دکھائیں اور دُنیا کی سب سے بڑی قوم بن گئے اور اپنی تجارت کے ذریعہ ساری دُنیا کے بازاروں پر حاوی ہوگئے۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ انگریزوں میں برتری کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ وہ ساری دُنیا کی قیادت کے دعویدار ہو گئے۔

لیکن اسے اتفاق ہی سمجھنا چاہیئے کہ پچھلے چند سال سے برطانوی مدبروں کو چاروں طرف سے

پر بیتا نیوں کا سامنا ہے جن قوموں کو انگریزوں نے مغلوب کرکے اپنی شہنشاہت میں داخل کیا تھا وہ ان کی دشمن ہوگئیں اور ہر قدم پر ان کی مخالفت کرنے لگیں۔ چنانچہ جنگ عظیم سے نجات حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کے لئے ایک نیا شاخسانہ پیدا ہوگیا اس کے علاوہ جنگ عظیم اور صلح نامہ ورسائے میں انگریزوں نے کمزور رقیبوں پر جو جنگ میں شکست کھا گئے تھے، بیجا سختیاں کرکے ان کو علیحدہ دشمن بنا لیا چنانچہ جرمن اور ترک، انگریزوں کے سخت دشمن ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر حصے سے نگریزوں کی مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں اور برطانیہ بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ آج برطانیہ کا سلک یہ ہے کہ وہ دنیا کے امن اور سلامتی کی کوشش میں سب سے پیش پیش ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برطانوی سامراج پھیلا ہوا ہے اور اس کی حفاظت آسان ہیں ہے۔ چنانچہ اس امن پسندی کے مسلک کے لئے انگلستان کو اپنا سیاسی وقار بھی کھونا پڑا۔ دنیا کہتی ہے کہ پچھلے چند دنوں سے انگلستان نے غیروں سے دب کر اپنی آبرو کھوئی حبش اور البانیہ کے معاملے میں وہ اطالیہ سے دب گیا۔ جرمنی نے صلح نامہ ورسائے کی علانیہ خلاف ورزیاں کیں اور آسٹریا، چکوسلواکیا غیرہ ہضم کرلیا تو اس سے برطانیہ نے چشم پوشی کی مشرق بعید میں جاپانیوں نے طرح طرح کی بے عزتی کی تو س کو گوارا کرلیا لیکن بات یہ ہے کہ سب کچھ محض امن پسندی کی خاطر نہیں بلکہ اس بات کی احتیاط بھی ہے کہ اگر جنگ سر پر آپڑے تو اس کا کامیاب مقابلہ بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء سے انگلستان نے پنی جنگی قوت کو بڑھانا شروع کیا ہے۔ بحر روم اور سنگاپور میں بحری مرکز قائم کرلئے۔ ہندوستان، آسٹریلیا، یوزیلینڈ، جنوبی افریقہ اور کناڈا میں اپنے کاروبار کو وسعت دی۔ مصر کو آزادی کی ہوا دکھلا کر اور ہندوستان کو نئے دستور میں الجھا کر مشرق سے اطمینان حاصل کرلیا ہے۔ اسے گھر میں بھی اطمینان ہے۔ تمام سیاسی فرقے ملک کی مدافعت کے لئے متحد ہیں۔ مزدور طبقوں کو مطمئن کر دیا گیا ہے اور آئرستانی شورہ پشت کارکنوں کو خارج کرکے نگلستان نے اس فتنے سے بھی نجات حاصل کرلی ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود برطانیہ کو لڑائی سے صرف نقصان ہی کا اندیشہ ہے اس لئے انگریز ارباب سیاست جنگ کی مصیبت سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس وقت دشواری یہ ہے کہ برطانیہ کے سرکاری ملازم بے پروا، ٹھیکے دار، بد دیانت اور کارخانے سست ہیں۔ اسی وجہ سے لک میں ضرورت کے مطابق اسلحہ اور طیارے تیار نہیں ہوسکتے چنانچہ پچھلی مرتبہ امریکہ کو طیاروں کا ٹھیکہ دینا پڑا تھا۔ انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین کی کبرسنی بھی سیاسی راستے میں حائل ہے ان کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو

راز بنا کر رکھتے ہیں۔ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہے۔ شاید انہی اسباب کی بنا پر دُنیا یہ سمجھتی رہی ہے کہ انگریز لڑنا نہیں چاہتے اور ان میں لڑائی کا دم خم بھی نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مسٹر چیمبرلین بھی یہ چاہتے ہیں کہ بغیر لڑائی کے یہ مشکلات حل ہو جائیں، یعنے روٹھی ہوئی قومیں مطمئن ہو جائیں اس کمزور مسلک کا ایک حالیہ نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی کو مارچ ۱۹۳۸ء میں آسٹریلیا اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سڈٹین علاقے دلوا دیئے گئے اور اپریل میں اٹلی سے سمجھوتا کرلیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے ستمبر میں مسٹر چیمبرلین نے یورپ کو ایک جنگ عظیم کے خطرے سے بچالیا، مگر اس کے ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے ہٹلر اور مسولینی کی رفتار ترقی کے لئے تمام راستے کھول دیئے کیونکہ ہٹلر اور مسولینی کی ہوس کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ وہ دوسرے کمزور ملکوں پر قابو پانے کے بعد بحر روم اور فرانس کی افریقی نو آبادیوں پر بھی چھاپہ ماریں گے اس کے علاوہ ان آمروں کا ایک بہت بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلقانی ریاستوں کو ضم کرکے ایشیا میں بھی پیش قدمی کریں اور اپنی ایک عالمگیر طاقت بنالیں اور ظاہر ہے کہ ان کی روک تھام آسان نہیں ہے۔ غالباً انگلستان کے ارباب سیاست یہ سمجھتے ہیں کہ اب امن پسند برادری کو قوی بنانے سے ان کی روک تھام ہو جائے گی۔ چنانچہ ترکی سے معاہدہ کرکے اسے اسکندرونہ دلایا گیا اور بحر روم کی طرف سے کسی قدر اطمینان حاصل کرلیا گیا ہے۔ لیکن مسٹر چیمبرلین کی یہ کوشش کہ روس بھی "امن پسند برادری" میں شامل ہو جائے، اب تک بار آور نہیں ہوئی۔ اس کی کوشش جاری ہے۔ اگر روس انگریزوں کے ساتھ معاہدے میں شریک ہو جائے تو شاید انگلستان کے لئے ایک نئی راہ کھل جائے۔

وسطی یورپ کے طوفان کے علاوہ برطانیہ کے لئے ایشیائی الجھنیں بھی ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ اب تک حل نہیں ہوا ہے۔ فلسطینی عربوں کا مسئلہ ایک دُنیائے اسلام کا مسئلہ ہے۔ اگر انگلستان عربوں کے خلاف فیصلہ کرے تو عجب نہیں کہ وہ ساری دُنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً عربی دُنیا کو اپنا سخت دشمن بنالے اور پھر ترک بھی عربوں کے خلاف فیصلے کو گوارا نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف انگریزوں کے لئے ایک اور الجھن یہ ہے کہ وہ یہودیوں کو بھی منانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اب برطانیہ کو یہودیوں سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں اور وہ اس طرح یہودی سرمایہ داروں کے دباؤ میں نہیں ہے لیکن ان کو شاید پچھلے وعدوں کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ پھر مشرق بعید میں جاپانیوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آئے دن انگریزوں کی بے عزتی ہو رہی ہے اور وہ ہر طرح ستائے جا رہے ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے رابرٹ کریگی ایک عرصے سے ٹوکیو میں جاپانی ارباب سیاست سے گفتگو کر رہے ہیں لیکن اب تک کوئی

باعزت سمجھوتہ نہیں ہوا۔ گو برطانیہ کے سامنے امریکہ کی مثال ہے کہ اس نے جاپان کے تجارتی معاہدے کو ختم کردیا اور جاپان کے خلاف سخت کارروائی کی۔ لیکن ابھی چند روز ہوئے مسٹر چیمبرلین نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ وہ امریکہ کی مثال پر نہیں چل سکتے کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کے حالات جداگانہ ہیں۔ نیز مشرقِ بعید میں اتنا طاقتور جنگی بیڑہ بھی نہیں ہے جو جاپانیوں کا مقابلہ کرسکے۔ اگر ٹوکیو کی گفت وشنید سے کوئی خوشگوار نتیجہ نہ نکل سکے تو یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مشرقِ بعید میں جاپانیوں کے مقابلے کے لئے برطانیہ سے تازہ دم بحری بیڑے اور جنگی جہاز روانہ کئے جائیں گے یا یہ سامان پولستان کی سرحد پر جمع رہے گا۔ اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ انگریز مشرقِ بعید میں اپنی عزت بچانے کی کوشش کریں گے یا پولستان کی حفاظت کریں گے جس کی ضمانت دی گئی ہے۔ غالباً ٹوکیو کی بات چیت اور روس سے معاہدے کے بعد برطانیہ کے صحیح مسلک کا اندازہ ہوسکے گا۔

اطالیہ

جب یورپ پر جنگ عظیم کی گھٹائیں چھاگئیں تو اطالیہ میں چند ایسے افراد کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا جو اس وقت کے حالات سے مطمئن نہ تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی تحریک کے علمبردار تھے جو ۱۹۱۹ء میں سیاسی اور سماجی شکل میں شروع ہوئی اور فاسیت کہلانے لگی۔ فاسیت کی تحریک بالکل فوجی بنیاد پر قائم تھی اور یہ فرقہ ابتدا میں صرف ایسے افراد پر مشتمل تھا جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا لیکن بعد میں اس تحریک کے بہت سے حامی پیدا ہوگئے اور فاشسٹ گروہ بہت طاقتور ہوگیا۔ ابتدا میں فاسیت کا رجحان اشتراکی جمہوریت کی طرف تھا مگر جب فاشسٹ تحریک کے روحِ رواں مسولینی نے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں اطالیہ کی حکومت پر قبضہ کرلیا تو اس نے آمری شکل اختیار کرلی اگرچہ یہ آمریت ذمہ دار دستوری حکومت کے منافی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسولینی کی قیادت میں ملک نے ایک بلند اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کرلیا۔ اطالیہ کی فاشسٹ تحریک کا اثر جرمنی پر بھی پڑا اور ان دونوں ملکوں کا مسلک بالآخر ایک ہوگیا۔ اطالیہ اور جرمنی کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی فاسیت نے اپنے لئے جگہ پیدا کرلی چنانچہ ہنگری، اسپین، پرتگال اور بیشتر بلقانی ریاستوں پر بھی اس تحریک کا اثر ہے۔ اگر غور سے

دیکھا جائے تو خود انگلستان میں بھی برطانوی فاشسٹوں کی ایک انجمن قائم ہے ۔

اطالیہ کی جغرافی حیثیت اور اس کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ مسولینی اپنے خارجی مسلک کو بہت دنوں تک معین کرنے کے قابل نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک مسولینی کا دماغ دو مرکزوں کے درمیان گھومتا رہا کبھی تو وہ خیال کرتا تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ دوستی کرنی ضروری ہے اور کبھی وہ سوچتا تھا کہ جرمنی کے ساتھ رشتہ جوڑا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی ۱۹۲۲ء میں جرمنی کا مخالف تھا، مگر چند دنوں بعد جب حالات بدل گئے تو مسولینی کی روش بھی بدل گئی اور اس نے جرمنی سے اتحاد کر لیا۔ اور جب جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آگیا تو اس نے بھی مسولینی کی دوستی غنیمت سمجھی اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ جرمنی کی طرف سے مسولینی کو اطمینان دلایا گیا کہ جنوبی ٹیرال پر جو اطالوی عملداری میں ہے جرمنی کوئی دست درازی نہیں کرے گا۔ ہٹلر نے ۳۰ رجنوری ۳۴ء کو جو رائشٹاغ میں تقریر کی تو اس بات کا اظہار کیا کہ اس سال اطالیہ سے جرمنی کے تعلقات بہت اچھے رہے اور ہم کو اطمینان ہے لیکن یہ دوستی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی، کیونکہ جب آسٹریا کا سوال پیدا ہوا اور جرمنوں نے آسٹریا کو ہضم کرنا چاہا تو مسولینی نے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ جب جرمن بیش قدمیوں سے خائف ہو کر ڈاکٹر ڈالفس نے اطالیہ سے معاہدہ کر لیا تو اب مسولینی آسٹریا کا محافظ بن کر میدان میں آگیا، اور جب ۲۵ رجولائی ۳۴ء کو آسٹریا کا بدقسمت چانسلر قتل ہو گیا اور اس سازش میں ہٹلر کا ہاتھ نظر آیا تو مسولینی نے اعلان کر دیا کہ:۔ "اگر نازیوں کی نقل و حرکت ایسی صورت اختیار کرے جس سے آسٹریا کا وجود خطرے میں پڑ جائے تو اطالوی فوجیں آسٹریا میں داخل ہو جائیں گی اور پھر میونچ کا رخ کریں گی"۔ اس دھمکی نے اس وقت آسٹریا کو بچا لیا کیونکہ جرمنی ابھی اس قابل نہ تھا کہ اطالیہ سے جھگڑا مول لے لیکن اس کے بعد سے دونوں آمروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ وسطی یورپ میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر مسولینی کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ حبش کی جنگ تک اطالیہ اور جرمنی کے تعلقات میں برابر کشیدگی رہی ۔

مارچ ۳۵ء میں جب ہٹلر نے معاہدہ ورسائے کو توڑا اور جو فوجی پابندیاں جرمنی پر عائد کی گئی تھیں ان کی خلاف ورزی کی تو برطانیہ اور فرانس نے مسولینی کو فراہم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسٹریسا میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں فرانس، برطانیہ اور اطالیہ نے آپس میں اتحاد کیا اور اس طرح جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرے کے خلاف ایک محاذ قائم کیا گیا۔ لیکن اسٹریسا کانفرنس کے بعد جو مرکزی بیانات

شائع ہوئے اس سے مسولینی کی تشفی نہیں ہوئی کیونکہ وہ اس کی توقعات کے خلاف تھے۔ چند مہینوں کے بعد مسولینی نے حبش پر حملہ کر دیا اور اس طرح بین قومی قوانین کی خلاف ورزی کی اور دنیا کی باون قوموں کے خلاف سر بکف ہو گیا لیکن وہ دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ جب مجلس اقوام نے اس کو علٰحدہ کیا تو ان حالات میں مسولینی کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ یعنے وہ جرمنی سے دوستی کرنے پر مجبور ہو گیا اور دونوں میں دوستی کے پیام سلام شروع ہو گئے۔ اب چونکہ مسولینی حبش کی لڑائی میں الجھ گیا تھا اس لئے ہٹلر نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو اس نے ۷ مارچ ۳۶ء کو وادی رہائن میں فوجیں بھیج دیں اور پھر ۱۱ جولائی ۳۶ء کو آسٹریا کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کے متعلق مسولینی کو مجبوراً اپنی رضامندی ظاہر کرنی پڑی۔ گو حبشہ کے ساتھ دوسری طاقتوں کی ہمدردیاں صرف زبانی تھیں اور کسی نے اس کا عملی طور سے ساتھ نہیں دیا تھا، تاہم اخلاقی حد تک سب لوگ حبش کے ہمدرد تھے اور اطالیہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ یہ ایسے حالات تھے کہ مسولینی جرمنی سے بگاڑ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے مجبوراً آسٹریا سے چشم پوشی کر لی اور ہٹلر کے ساتھ رہا۔ اکتوبر ۳۶ء میں کونٹ چیانو میونچ اور برلن بھیجا گیا اور اس نے بیرن نیوراتھ سے گفتگو کی۔ اس بات چیت کے بعد جرمنی اور اطالیہ بالکل متحد ہو گئے اور دونوں نے ایک مسلک پر چلنا شروع کیا۔ پہلی چیز یہ طے پائی کہ اسپین میں اطالیہ اور جرمنی دونوں مل کر کام کریں۔ دوسری چیز یہ تھی کہ جب تک حبش پر اطالیہ کا قبضہ تسلیم نہ کر لیا جائے جرمنی اور اطالیہ مجلس اقوام میں دوبارہ شریک نہیں ہوں گے۔ تیسری چیز یہ تھی کہ رہائن لینڈ سے متعلق اطالیہ جرمنی کی حمایت کرے گا اور اگر ضرورت پڑے تو اس سلسلے میں فرانس اور اس کے ساتھیوں کے خلاف متحدہ طور پر مقابلہ بھی کرے گا۔ اس متحدہ مسلک کے چند روز بعد یعنے نومبر ۳۶ء کو مسولینی نے ملان میں ایک تقریر کی جس میں روم برلن محور کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ مسولینی نے اپنے خارجی مسلک کا تعین کر لیا ہے اور وہ ہمیشہ جرمنی کا ساتھ دے گا۔ اس کے بعد مسولینی نے ہٹلر کو اور خوش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ہٹلر کے مستعمراتی مطالبہ کی بھی تائید کی نیز روس کے خلاف ہٹلر کو آمادہ مخالفت کر دیا۔ جرمنی کی حمایت میں آسٹریا اور زیکوسلواکیا سے دست برداری کا اعلان کیا لیکن ان مراعات کا معاوضہ بھی کم نہیں تھا، یعنے مسولینی نے یہ خواہش کی کہ ہٹلر اسپین میں اطالوی حقوق تسلیم کرے اور بحر روم میں اس کو وسیع اقتدار مل جائے۔

اسپین کا قضیہ ۱۷ جولائی ۳۶ء سے شروع ہوا۔ دیکھنے کو تو یہ اندرونی خانہ جنگی تھی لیکن حقیقت میں یہ ایک بین قومی جنگ ہوئی کیونکہ حکومت کی طرف سے روس اور فرانکو کی طرف سے اطالیہ و جرمنی میدان جنگ میں حصہ

ے رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی "امن پسند مملکتیں" یعنے انگلستان، فرانس وغیرہ "عدم مداخلت" کے مضحکہ خیز مسئلے میں الجھی ہوئی تھیں جب اسپین کے حالات بہت پیچیدہ ہو گئے تو فرانس اور برطانیہ کو بھی ڈر ہوا کیونکہ اس سے ان کی تجارت اور بحر متوسط کا مسئلہ نازک ہوجاتا تھا چنانچہ انھوں نے نیون میں ایک کانفرنس کی جس میں بلغاریہ، یونان، رومانیہ، ترکی، یوگوسلاویہ، روس، مصر، اطالیہ اور جرمنی کو شرکت کی دعوت دی۔ مگر اطالیہ اور جرمنی نے اس میں شرکت سے انکار کردیا اس کے باوجود برطانیہ اور فرانس نے مشرقی اٹلانٹک اور بحر روم کی مختلف گذرگاہوں کو اپنے اور دوسری مملکتوں کے درمیان تقسیم کرلئے اطالیہ اس فیصلے سے ناخوش تھا کیونکہ اس کو وہ حیثیت نہیں دی گئی تھی جو وہ چاہتا تھا۔ اطالیہ کی ناراضی تکلیف دہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس نے بالآخر بحر روم کے بہت سے حقوق اطالیہ کو دے دیئے۔ مگر برطانیہ اور فرانس اپنی اس کوشش کے باوجود مسولینی کو فراہم نہ کرسکے۔ وہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد بدستور جرمنی سے ملا رہا۔

روم برلن محور کے ذمہ دار عدم مداخلت کے مسائل اور اطالیہ و جرمنی کے مشترک مفادات ہیں اور یہ محور سیاست یورپ کا ایک نیا کرشمہ ہے۔ یہ دراصل ان آمروں کے منصوبے ہیں جو محور کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور آج ان پر یورپ کی تمام سیاست گھومتی ہے۔ یورپی سیاست پچھلے تین سال سے اس کے گرد چکر لگاتی رہی اور اب کئی نشیب و فراز کے بعد اس کو مستقل بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ دونوں آمر یعنے ہٹلر اور مسولینی ہم آواز اور ہم زبان ہیں۔ لیکن یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیئے کہ ہٹلر کا اقتدار اس قدر بڑھتا جارہا ہے کہ شاید آئندہ مسولینی کسی معاملے میں ہٹلر سے اختلاف نہ کرسکے۔ تاہم دوسری مملکتوں کے مخالفانہ طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اطالیہ جرمنی کا ہمنوا رہے گا۔ گو البانیہ پر قبضہ جمانے کے بعد اطالیہ نے کوئی نیا قدم نہیں اٹھایا مگر اب اس کا مسلک یہ ہے کہ ڈانزگ کے مسئلے میں ہٹلر کا ساتھ دے۔ چنانچہ پولستان کی سرحد پر جرمن فوجوں کے ساتھ اطالوی فوجوں کی مشقیں بھی ہوئیں۔ کونٹ چیانو، برشٹس گاڈن میں ہٹلر سے گفتگو کرکے اب روم واپس آگئے ہیں اور ابھی ۱۵ راگست ۳۹ء کو اطالیہ نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اطالیہ اور جرمنی کا مفاد ایک ہے۔ غرض آجکل ان دونوں آمروں کی توجہ ڈانزگ کی طرف مبذول ہے۔ اس کے حصول کے لئے ہٹلر کو جو قدم بھی اٹھانا پڑے مسولینی اس کے ساتھ رہے گا۔ ڈانزگ کے قبضے کے بعد ممکن ہے کہ مسولینی کسی نئے شکار کی تلاش میں نکلے اور جرمنی اس کی مدد کرے۔

جرمنی

جنگ عظیم کے فاتحوں نے صلح نامہ ورسائے کے ذریعہ جن طاقتوں کو نقصان پہنچایا ان میں جرمنی بھی ہے لیکن یہ زبردستیاں خالی جانے والی نہ تھیں۔ ان زبردستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحوں نے شکست خوردہ جرمنی کو پھر اپنا دشمن بنالیا۔ اور وہی معاہدہ ورسائے جس کو فاتح خوانِ یغما سمجھتے تھے اب ان کے لئے زہر ہلاہل ہوگیا۔ جو ملک اس معاہدے کے ذریعے پامال کئے گئے وہ پھر قیامت بن کر اُٹھ گئے۔ معاہدہ ورسائے کو ٹھکرانے لگے اور فاتحوں سے دوبارہ لڑنے کے لئے زندہ ہوگئے۔

ہٹلر ۱۹۳۳ء میں جرمنی کا چانسلر ہوا تھا۔ اسی تاریخ سے اس کی آمریت شروع ہوتی ہے۔ اس کے اسباب جرمنی کے سیاسی اور معاشی حالات میں تلاش کرنے چاہئیں۔ ملک کی معاشی حالت بہت ابتر تھی۔ کئی سال سے معاشی حالات کی خرابی اور جرمن سیاست کی بے بسی نے جرمنی میں تمام پرانی جماعتوں کی طرف سے مایوسی پیدا کردی تھی اور عوام کو پرانی تدبیروں پر اعتماد نہ تھا۔ اس مایوسی میں ہٹلر نے ملک کو امید کی جھلک دکھلائی اور دعویٰ کیا کہ وہ جرمنوں کے ہر دکھ کی دوا مہیا کرسکتا ہے۔ اس آواز کا اثر یہ ہوا کہ ملک کے اکثر طبقے جو موجودہ حالات سے مایوس ہوچکے تھے ہٹلر کے ساتھ ہوگئے اور اس طرح ہٹلر نے اپنی ایک قوت پیدا کرلی۔ مگر جب ہٹلر برسر اقتدار ہوگیا تو بہ اختلافات اُبھر گئے۔ معاشی الجھنوں کے علاوہ ہٹلر کو بہت سی مخالف قوتوں کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔ ابتدائی مرحلے تو ہٹلر نے یوں طے کئے کہ پہلے یہودیوں کو حکومت سے بے دخل کیا اور پھر اشتمالیوں کا قلع قمع کردیا۔ مگر خود اس کی جماعت کے اندر اختلافات تھے۔ قومی اشتراکی جماعت جس نے اپنی قوت سے ہٹلر کو اتنا بڑھایا تھا اب ہٹلر کی مخالف ہوگئی تھی۔ اس جماعت میں ایک نیم فوجی تنظیم تھی اور اس "بھوری فوج" کا افسر اعلیٰ روہیم تھا جو اشتراکی نظام کا بڑا حامی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مہاجنوں اور سرمایہ داروں کی ملک ضبط کرلی جائے اور ملک کی اہم صنعتوں کو قومی تصرف میں لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہٹلر کے حامی جو سرمایہ دار اور زمین دار طبقے تھے اس اشتمالی تخیل کے قائل نہ تھے اور ہٹلر کا تمام سہارا انہی پر تھا۔ "بھوری فوج" اپنا اثر بڑھا رہی تھی اور یہ سرمایہ دار طبقے کو گوارا نہ تھا۔ دوسری طرف سرکاری فوج تھی جس کے تجربہ کار قائد اس ہیجانی عنصر کو اپنے میں ضم نہیں کرسکتے تھے۔ غرض اس طرح جرمن سیاست میں دو فریق پیدا ہوگئے تھے۔ ایک طرف روہیم اور اس کے

اشتراکیت پسند ساتھی تھے اور دوسری طرف ہٹلر گوئیرنگ اور گوئبلز کا اتحاد ثلاثہ تھا جس کی حمایت میں سرکاری فوج اور سرمایہ داروں کا روپیہ تھا ہٹلر کے لئے "بھوری فوج" کا خاتمہ ضروری تھا چنانچہ ۱۹۳۴ء میں رویم اور اس کے ساتھی گولی کا نشانہ بنے لیکن ان کے ساتھ ہٹلر نے قدامت پسند حلقوں کے بعض لوگوں کو بھی سازش کے بہانے سے کچل دیا اور اس طرح اپنے راستے سے تمام مزاحمتیں دور کردیں اس کے بعد ہٹلر کا اقتدار زیادہ مضبوط ہوگیا چنانچہ اس کی قوت کا ظہور اس وقت ہوا جب ہنڈنبرگ کے مرنے کے بعد ہٹلر نے اساسی دستور کے بالکل برخلاف صدارت اور وزارت عظمٰی کے عہدوں کو ملاکر دونوں کام اپنے ہاتھ میں جمع کرلئے اب وہ جرمنی کا مطلق العنان آمر ہے۔

جب ہٹلر نے جرمنی کی مطلق العنان آمریت اپنے ہاتھ میں لے لی تو اس نے جرمنی کے سدھار کی طرف توجہ کی اور اپنا خارجی مسلک بھی معین کرلیا۔ اصل میں ہٹلر کا مطمح نظر ان قوموں سے بدلہ لینا تھا جنھوں نے معاہدہ ورسائے کے ذریعہ جرمنی کی کھال کھینچی تھی۔ پہلے جرمنی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی یعنے جرمنی نے بہت بڑے پیمانہ پر تجدید اسلحہ کا کام شروع کردیا۔ ملک کی فوجی قوت بڑھانے کے مختلف طریقے اختیار کئے اور چند ہی روز میں اتنی طاقت حاصل کرلی کہ بڑی سے بڑی سلطنتیں اس سے گھبرانے لگیں ہٹلر نے جرمنی کی جو خدمتیں انجام دیں ان کی تفصیل تو بہت ہے مگر پچھلے چند سال کے کارنامے مختصر طور پر یہ ہیں: سب سے پہلے اس نے معاہدہ ورسائے کو ٹھکرادیا اور اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ ڈالفس کے قتل کے بعد اس نے آسٹریا میں اپنی سیاست کا جال پھیلادیا۔ پھر رہائن لینڈ پر قبضہ، اور سار کا استصواب ہوا۔ روم برلن محور کی تشکیل ہوئی، اشتمالیت کے خلاف اطالیہ، جرمنی اور جاپان کا اتحاد عمل میں آیا۔ آسٹریا، چکوسلواکیا اور میمل پر قبضہ اور یہودیوں کا جرمنی سے اخراج ہوا۔ یہ سب ہٹلر کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جرمنی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

معاشیات کے ماہر یہ ثابت کرتے ہیں کہ جرمنی کا آسٹریا اور سڈٹین علاقوں پر قبضہ ہوجانے سے جرمنی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا بلکہ جرمنی کے معاشی مسائل اور زیادہ پیچیدہ ہوگئے! ان کا خیال ہے کہ بلقان سے جرمنی کو پیداوار خام بھی خاطر خواہ نہیں مہیا ہوسکتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بلقان کی ریاستوں سے جرمنی کا تجارتی تعلق زیادہ مضبوط ہورہا ہے! اب تو صورت حال یہ ہے کہ اگر بلقان والے چاہیں بھی تو جرمنی سے تجارتی رشتہ نہیں توڑ سکتے۔ دریائے ڈینیوب کی آمد ورفت پر جرمنی کو پورا اختیار ہے اور پھر مغرب میں ٹریسٹ کی بندرگاہ اور بحر اڈریاٹک کے ذریعہ اسے بحر روم پہنچنے کا ایسا راستہ مل گیا ہے جو اس کے تجارتی تسلط کو بہت پائدار کررہا ہے! اب بلقانی تجارت کا

معاملہ ڈاکٹر شاخت کے حوالے بھی کیا گیا ہے۔ ان مشاہدوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلقان پر جرمنی کا کم از کم معاشی تسلط تو ہوگیا ہے۔

ان مسلسل کامیابیوں سے ہٹلر کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ اب وہ اپنے قدم اور آگے بڑھاتا جا رہا ہے اور یکے بعد دیگرے ان تمام مطالبات کی تکمیل میں لگا ہوا ہے جو اس نے اپنی کتاب "میری کشمکش" میں بیان کئے ہیں۔ نئے علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کرکے اس نے بڑی حد تک اپنی قوم کی ایک پرانی خواہش پوری کردی، یعنے خواہش یہ تھی کہ جرمن نسل اور جرمن زبان بولنے والے افراد سب ایک ہی سیاسی دائرے میں آجائیں۔ مگر ابھی مشرقی فرانس، جنوبی ڈنمارک، شمالی اور مغربی پولستان، ہنگری، سوئٹسان اور شمالی اطالیہ میں جرمن زبان بولنے والے موجود ہیں جنھیں جرمنی قوم میں شامل کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے نازی سیاست کوشش کر رہی ہے۔ میمل تو جرمنی سے ملحق ہوگیا ڈنمارک میں سازشیں ہو رہی ہیں، ہنگری کے جرمن نازی اصولوں کے جال میں آگئے ہیں اور پولستان سے جارحانہ چھیڑ چھاڑ بھی شروع کردی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ ٹیرال کے جرمن باشندے جو ابھی اطالوی حکومت کی طرف سے خارج کر دیئے گئے ہیں، جرمنی میں ضم کرلئے جائیں۔ ٹیرال کا مسئلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہٹلر کے منصوبوں کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس وقت پولستان کا مسئلہ ساری دنیا کے لئے جاذب نظر ہے اور جرمن سیاست نے بھی اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کردی ہے۔

پچھلے چند دنوں سے ہٹلر نے پولستان کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ ہٹلر کے آئندہ ارادوں کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ چند سال پہلے جرمنی نے پولستان کے ساتھ صلح و آشتی کا معاہدہ کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف دھوکے کی ٹٹی تھی۔ بات یہ ہے کہ ہٹلر اب تک مشرقی، مغربی، جنوبی مخمصوں میں پھنسا ہوا تھا۔ جب ان سے فراغت ہوگئی تو پھر اس نے پولستان کی طرف توجہ کی چنانچہ گزشتہ مئی میں ہٹلر نے جو تقریر کی اس میں یہ کھلے مطالبے تھے کہ ڈانزگ واپس ہونا چاہیئے۔ اور "گذرگاہ" میں سے جرمنی کے لئے راستہ ملنا چاہیئے۔ پھر جب سانحہ میونچ کے بعد انگلستان اور فرانس نے پولستان کو اس کی حفاظت کی ضمانت دی تو ہٹلر کو ایک بہانہ مل گیا اور اس نے فوراً صلح و آشتی کے پچھلے دہ سالہ معاہدے کو منسوخ کردیا۔ اور یہ اس بات کی آزمائش تھی کہ صلح پسند اور امن کے حامی کتنے پانی میں ہیں۔

پولستان کی جنگ عظیم کے زمانے میں تشکیل ہوئی تھی چونکہ اس نئی مملکت کی سمندر تک رسائی نہ تھی اس لئے اتحادیوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ ایک Corridor یعنے ایک "گذرگاہ" پولستان کے حوالہ کیا تاکہ

بحر بالٹک تک اس کو راستہ مل جائے۔ بعد پولستان کے لئے بندرگاہ کا انتظام بھی کیا گیا یعنے مجلس اقوام کی نگرانی میں ڈانزگ کا ایک "آزاد شہر" قائم کیا گیا! اس "آزاد شہر" کی نوعیت اور صورت حال کے متعلق مختلف رائیں ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ نہ تو جرمنی کا کوئی حصہ ہے اور نہ پولستان کی سرحد میں داخل ہے البتہ اس آزاد شہر کا پولستان سے اتنا تعلق ضرور ہے کہ معاہدہ ورسائے کی روسے پولستان کو ڈانزگ کی بندرگاہ استعمال کرنے کا حق دیا گیا اور نیز اس شہر کے خارجی تعلقات کے متعلق پولستان کو اختیارات دیئے گئے چونکہ ڈانزگ میں جرمنوں کی کثرت ہے، اس لئے وہ بالکل پولستان کے حوالے نہیں کیا گیا۔ ڈانزگ میں مجلس اقوام کی طرف سے ایک نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا جو ہائی کمشنر کہلاتا تھا! اس انتظام سے بہت سے جھگڑے پیدا ہو گئے اور بالآخر جولائی ۳۹ء میں مجلس نے اپنی ضمانت ختم کر دی اور ڈانزگ کے معاملات سے دست برداری حاصل کر لی چونکہ یہاں ۸۵ فی صد باشندے جرمن ہیں، اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ڈانزگ جرمنی میں شامل ہو جائے! اس مقصد کے لئے وہاں پروپگنڈا ہوتا رہا! اس کے علاوہ ڈانزگ کے شہری فوجی تعلیم کے لئے جرمنی جاتے تھے اور جو تعلیم خود ڈانزگ میں ہوتی تھی اس پر نازی رنگ چڑھا ہوا تھا! اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ آزاد شہر بالکل نازی ہو گیا۔

بعض ماہرین سیاسیات کا خیال ہے کہ ڈانزگ کو پولستان کی ضرورت ہے۔ ڈانزگ سینیٹ کے سابق صدر ڈاکٹر راؤش ننگ کا بھی یہی خیال تھا اور ان کو ۱۹۳۵ء میں اسی خیال کے باعث اپنے عہدے کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسری طرف پولستان کے مدبروں کا یہ ایقان ہے کہ پولستان کو ڈانزگ کی ضرورت ہے چنانچہ پولستان کے ایک مشہور مدبر ڈاکٹر ہنرک اشٹراس برگر اپنی کتاب "مسئلہ ڈانزگ" میں لکھتے ہیں:۔ "یہ ہمارا ایقان ہے کہ اگر ڈانزگ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو نہ صرف پولستانی "گذرگاہ" کا اہم ترین علاقہ پومورز چلا جائے گا بلکہ خود ڈانزگ کی آزادی بھی ختم ہو جائے گی"! ابھی مئی ۳۹ء میں پولستان کے وزیر خارجہ کرنل بک نے وارسا میں ایک تقریر کی انھوں نے ہٹلر کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ:۔ "اگرچہ ڈانزگ میں جرمنوں کی کثرت ہے لیکن اس کی بقا اور ترقی کا دارومدار پولستان پر ہے بیرونی تجارت اور جہاز رانی کے حقوق جو ڈانزگ میں پولستان کو حاصل ہیں ان کی ہم پوری حفاظت کریں گے"۔ مگر اس قضیے کا حل بہت مشکل ہے کہ ڈانزگ کو پولستان کی ضرورت ہے یا پولستان کو ڈانزگ کی! ادھر پولستان نے احتیاط کے مدنظر ایک نئی بندرگاہ گڈینیا بنائی ہے جو اس کے کامل اقتدار میں ہے تاکہ اگر خدانخواستہ ڈانزگ ہاتھوں سے نکل جائے تو اس نئی بندرگاہ سے بحری ضروریات پوری کی جا سکیں اور ادھر ڈانزگ کے نازی یہ کہتے ہیں کہ ان کو پولستان کی ضرورت نہیں بلکہ جرمنی کی ضرورت ہے آئندہ واقعات ہی اس کا فیصلہ کر سکیں گے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جرمنی کی طرف سے مسلح آدمی اور اسلحہ ڈانزگ کی طرف بہے آرہے ہیں۔ اطالوی اور جرمن فوجوں کی منتقلیں ہو رہی ہیں اور اس بہانے سے پولستان کی سرحد پر جرمن فوجیں جمع کردی گئی ہیں۔ ابھی ڈانزگ کی نازی جماعت کے رہنما ہر فورسٹر ہٹلر سے مل کر واپس آئے اور ڈانزگ میں تعصب انگیز تقریریں کر رہے ہیں۔ انھوں نے صاف صاف بتا دیا کہ ڈانزگ جرمنی میں ضم ہو جائے گا۔ ابھی ۱۹ اگست کی خبر ہے کہ ڈانزگ میں نازی فوج مظاہرے کر رہی ہے۔ دو مہینے پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ ڈانزگ میں کسی قسم کی فوجی تیاریاں نہیں ہو رہی ہیں۔ مگر اب علی الاعلان ہر فورسٹر کہہ رہے ہیں کہ: ”ہماری فوج کافی طاقتور ہے۔ چونکہ ہم کو پولستان سے خطرہ ہے اس لئے ضرورت کے وقت جرمنی کی فوجیں بھی ہماری مدد کریں گی۔“ ممکن ہے کہ یہ سب حرکات دفعہ (۵) دستور ڈانزگ کی رو سے غیر قانونی بھی جائیں مگر مجلس اقوام کا وجود باقی نہیں ہے اس لئے ان کارروائیوں کو خلاف قانون کہنے کی کون جرات کرتا۔ یہ دیکھ کر انگریز چاروں طرف سے پریشان ہیں، غالباً ہٹلر اس کو ایک سنہری موقعہ سمجھتا ہے اور اس کا یہ ارادہ ہے کہ بغیر جنگ کے ڈانزگ کو ہضم کرجائے لیکن اگر پولستان اس خطرے کو محسوس نہ کرے تو اس کو بدقسمتی ہی سمجھنا چاہیئے۔ اطالیہ کا یہ اعلان بھی معنے خیز ہے کہ ڈانزگ کا مسئلہ خود اطالیہ کا مسئلہ ہے اور جرمنی اور اطالیہ دونوں اس معاملے میں متحد ہیں۔ ادھر برطانیہ کی ٹوکیو اور ماسکو سے گفت وشنید ہو رہی ہے اب تک ان کا کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا اگر یہی صورت رہی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چکوسلواکیا کی طرح ڈانزگ بھی چپکے سے رائش میں ضم کرلیا جائے گا کیونکہ انگریزوں کو مشرق بعید میں بھی اپنے وقار کا تحفظ کرنا ہے اور اگر ماسکو کی بات چیت سے کوئی معاہدہ طے نہ پاسکے تو قرائن یہ ہیں کہ انگریز پولستان کی خاطر اپنے وجود کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ اور اگر ماسکو میں انگریزوں کو کامیابی ہوگئی اور ان طاقتوں نے یورپ کے بڑھتے ہوئے خطرے کو روکنا چاہا تو پھر مشرقی خطرہ تو جوں کا توں رہا۔ بہرحال یہ ایسی نازک صورت حال ہے کہ برطانیہ کے آئندہ مسلک کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اس موقعہ پر یہ سوال تو قبل از وقت ہے کہ ڈانزگ کے بعد جرمنی کا دوسرا اقدام کیا ہوگا؟ البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ڈانزگ کے ساتھ پولستان اور رومانیہ کا وجود بھی خطرے میں ہے۔ مگر اس وقت ڈانزگ پر ہی یورپ کی ساری سیاست کا دارومدار ہے۔ ایک زمانے میں بسمارک نے کہا تھا کہ: ”بوہیمیا پر جس طاقت کا قبضہ ہوگا وہی سارے یورپ کی حاکم ہوگی۔“ اس قول کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ہمیں آئندہ حالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

تاثیر صحبت

از

جناب سید علی نواز رضوی صاحب امانت خانی تصوّر

صلاحِ نیک دے صحبت ہو ایسی
ادب آموز ہو ایسا ہو ہمدم
نہ اپنے واسطے وہ ڈھونڈھ ساتھی
جو کر دے خلق کا شیرازہ برہم
کہ کہتے ہیں جنابِ شیخ سعدیؒ
ہے تمثیل ایک یہ اُن سے منظم
"گلے خوشبوئے در حمام روزی
رسید از دستِ محبوبی بدستم"
جو تھی سرتا بپا تصویرِ صحبت

تعالی اللہ اُس کی عطر بیزی
معطر تھا مشامِ جانِ عالم
ہوئی تھی واگرہ غنچے کے دل کی
یہ عقدہ باغِ ہستی میں تھا مبہم
ہوا میں نکہتِ گل یا اُڑی تھی
کھلی تھی یا کہ زلفِ عنبریں دم
"بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوی دلاویزِ تو مستم"
ہے تجھ میں کس کی یہ تاثیرِ صحبت

کہا یہ پند سن رہ شاد و خرم
جو غمگیں کے قریں بیٹھے ہو پرغم
دنی کی ہمنشینی کا نہ بھر دم
سخی کی ہمدمی کرتی ہے حاتم
شمولِ نیم سے ہو خود انگبیں سم
شکر ہو شیر گر دونوں ہوں باہم
"بگفتا من گلِ ناچیز ہستم
و لیکن مدتے با گل نشستم"
میں ہوں اک پرتوِ تنویرِ صحبت

اگر اعلیٰ گھرانے کا ہے تو فرد
بڑوں میں بیٹھ کر کیا ہو معظم
اثرِ خوئے نیکاں کا جو ہے مرد
کہیں انساں تجھے نا ابنِ آدم
زمیں کی ہوں وہی بیقدر ہیں گرد
ولے کسبِ خصالِ نیک کردم
"جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم"
تصوّر ہے یہی تفسیرِ صحبت

تنقید و تبصرہ

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیانِ ریاست
قیمت (عمائی) دو روپیے۔

یہ علی محسن صاحب ام۔ اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ کا امتحانی مقالہ ہے جو موصوف نے اپنے امتحان ام۔ اے کے لیے پیش کیا تھا، اور اب یہ کتاب کی شکل میں پیش ہے۔ بڑی تختی اور دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو انجمن طیلسانئین کا بڑا قابل قدر کام سمجھنا چاہیئے جو ایسے علمی مقالوں کو روشنی میں لا رہی ہے۔ اس میں مولف اور ناظرین دونوں کا فائدہ ہے۔ لائق مولف نے اس میں بڑی محنت کی ہے اور اس دور کو جو بظاہر بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل بہت پیچیدہ ہے بڑی قابلیت سے واضح کیا ہے اور اصل ماخذوں سے تمام مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ علی عادل شاہ اول کے عہد میں دکن کے حالات بہت پیچیدہ تھے، کیونکہ اس فرمانروا نے اپنے حرص و آز سے دکن میں ایک سیاسی تلاطم برپا کر دیا تھا۔ دوسری سلطنتوں کو اس کا مقابلہ اور اپنی مدافعت کرنی پڑتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب تک علی عادل شاہ زندہ تھا دکن میں بین المملکتی لڑائیوں کا تانتا بندھا رہا۔ اس میں دکن کی اسلامی سلطنتوں کے ساتھ جنوب سلطنت وجیانگر کو بھی دعوت دی جاتی تھی اور اس سے دکن کی یکجہتی کو بہت نقصان پہنچا تھا چنانچہ یہ آگ علی کے انتقال کے بعد بھی سلگتی رہی جو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں بڑی مشکل سے فرو ہوئی۔ اس کے فرو کرنے میں دکن کے حکمرانوں کے ساتھ بیجاپور کے متولیان ریاست کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس زمانے کی تمام سیاسی الجھنوں کو روشنی میں لانا آسان نہیں ہے۔ خود بیجاپور کی اندرونی سیاست بھی بہت پیچیدہ تھی۔ لائق مولف نے بڑی خوبی سے ان کو واضح کیا ہے۔ اگرچہ تاریخ بیجاپور سے متعلق یہ اردو میں پہلا کام نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اردو تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ بہت عرصہ ہوا کہ مولوی بشیر الدین احمد اور مولوی غلام صمدانی خاں گوہر نے عادل شاہی خاندان کی تاریخیں لکھی ہیں۔ بشیر الدین صاحب کی تاریخ تو تین ضخیم جلدوں میں ہے لیکن ان تالیفوں میں

مضمون کی ترتیب اور اسلوب بیان بہت پرانا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نئے اسلوب پر عادل شاہی خاندان کی ایک مبسوط تاریخ لکھی جائے۔ کتاب زیر نظر ایک حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہے اور آیندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک اچھا نمونہ ہے۔

لیکن اس تالیف میں دو ایک چیزوں کی کمی ضرور ہے۔ اول تو اس کا نام موضوع کے مطابق نہیں ہے، اس نام سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد ابراہیم کے منولیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے ابراہیم کے ابتدائی عہد میں ملک کی سیاسی رہنمائی کی تھی حالانکہ یہ ابراہیم کے ابتدائی عہد کی تاریخ ہے۔ اس کا نام "ابراہیم عادل شاہ ثانی کا ابتدائی عہد" زیادہ مناسب ہوتا۔ جس تمہید سے اس کی ابتدا ہوئی ہے وہ بہت تشنہ معلوم ہوتی ہے کہ گویا وہ ایک غیر متعلق عبارت ہے۔ تمہید سے ناظرین کو موضوع کتاب سے روشناس کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہاں یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اگر ابتدائی سطروں میں عادل شاہی سلطنت کا ضروری رنگ روپ بتایا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ ابواب کی بڑی تقسیم شخصیتوں سے ہوئی ہے حالانکہ تاریخ کی رفتار واقعات شخصیتوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ایک زمانے پر ختم ہوتی ہے۔ نیز ابواب میں جزئی [illegible] مثلاً "اخلاص خان کا قتل کیا جانا" اور "ابو الحسن کا قید کیا جانا" وغیرہ بے محل معلوم ہوتی ہیں اور یہ بہت پرانا طریقہ ہے۔ بڑے بڑے موضوع قائم کرکے ان کی ذیلی سرخیاں قرار دینی چاہئیں۔

سلطان احمد شاہ بہمنی۔ یہ بھی مولوی ظہیر الدین صاحب ایم اے کا امتحانی مقالہ ہے جو موصوف نے اپنے امتحان ایم اے کے لئے پیش کیا تھا اگرچہ اس سے بہت پہلے مولوی غلام صمدانی خاں گوہر اور عبدالجبار خاں آصفی نے سلاطین بہمنی کی تاریخ لکھی تھی۔ آخر الذکر نے اس موضوع پر محبوب الوطن کے نام سے ایک مستقل تالیف لکھی تھی جس میں تمام سلاطین بہمنی کے حالات درج ہیں لیکن ان تالیفوں میں مضمون کی ترتیب اور اسلوب بیان اس قدر پرانا ہے کہ وہ موجودہ ضرورتیں پوری نہیں کرتا یعنے یہ فارسی تاریخوں کی ایک نقل ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں چند سرسری حالات کے سوا سیاست و معاشرت کی کوئی وضاحت نہیں ہے لیکن کتاب زیر نظر جدید اسلوب سے لکھی گئی ہے اس میں نہ صرف سیاسی واقعات ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس عہد کے دستور، معاشرت اور سیاست پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد تمدنی ترقیوں کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت بہمنی کسی عہد اور دور پر روشنی ڈالنا آسان کام نہیں ہے کیونکہ اس سلطنت کی معاصر تاریخیں جو سلاطین بہمنی کی سرپرستی میں تالیف ہوئی ہیں اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ عیون التاریخ، سراج التاریخ اور تحفۃ السلاطین اور بہمن نامہ کے صرف نام رہ گئے ہیں۔ خود احمد شاہ بہمنی نے شیخ آذری سے بہمن نامہ لکھوایا تھا جس کا اب کہیں پتہ نہیں۔ اس لئے

سلاطین بہمن پر قلم اُٹھانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور متناقض ماخذوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طریقے سے کوئی چیز وثوق سے نہیں کہی جاسکتی، اور بعض متناقض ماخذ بھی ایسے تھے جو آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے مثلاً برہان مآثر جو اس مقالے کی تالیف کے وقت بہت کمیاب تھی مولوی ظہیر الدین صاحب نے ان تمام دشواریوں کو عبور کر کے بڑی محنت سے یہ کتاب تالیف کی ہے اس طرح یہ بڑا قابل قدر کام ہے۔ مضمون کی ترتیب بہت اچھی اور زبان بہت شستہ ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک عہد کی تاریخ ہے تاہم اس کو بہمنی دَور کا سب سے پہلا کام سمجھنا چاہیئے اور آیندہ کام کرنے والوں کے لیے ایک اچھا نمونہ ہے۔

اس سلسلے میں دو ایک چیزوں کا ذکر ضروری ہے، یعنے یہ زیادہ اچھا ہوتا کہ پہلے باب کو جس میں احمد شاہ سے پہلے کا دَور دکھایا گیا ہے مقدمہ بنایا جاتا، اور اس میں ذرا اختصار سے کام لیا جاتا کیونکہ اس کا مقصد صرف ناظرین کو مضمون سے روشناس کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اصل موضوع سمجھنے کے لیے پس منظر سے واقف ہوں اس میں غالباً زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے چوتھے باب میں جو "احمد شاہ کے انتظامات سلطنت" کی سرخی سے لکھا گیا ہے بے جوڑ مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی ضرورت تھی کہ نظام حکومت کو "دستور" کی سرخی سے ایک جگہ جمع کیا جاتا، اور تعلیم اور علمی سرپرستی وغیرہ کے مسائل تمدنی کارناموں کی سرخی سے علحدہ رکھے جاتے۔ نیز پانچواں باب جس میں احمد شاہ کی فتوحات بیان کی گئی ہیں وہ چھٹے باب کے تابع ہے۔ کیونکہ خارجی حکمت عملی اور اس کی تشکیل ہمسایہ طاقتوں کے ساتھ پرخاش کا باعث ہوئی اس لیے اس باب کو فتوحات سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک مرید اپنے مرشد کا تذکرہ لکھ رہا ہے۔ حالانکہ تاریخ کا اسلوب بیان اس سے مختلف ہوتا ہے۔ احمد شاہ کے ولی ہونے میں کسی کو شبہہ نہیں ہے لیکن جہاں اس کو بہ حیثیت ایک فرمانروائے مُلک اور سیاس کے پیش کیا گیا ہے۔ وہاں مریدانہ انداز بیان مناسب نہیں معلوم ہوتا برخلاف اس کے اگر احمد شاہ کی ولایت کا تذکرہ کیا جائے تو غالباً یہ انداز زیادہ موزوں ہوگا۔

ع۔م۔س

مندرجۂ بالا دونوں کتابیں دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ حیدرآباد دکن

سے

دستیاب ہوسکتی ہیں۔

مسیح الملک:۔ ماہوار رسالہ (اگست ۱۹۲۹ء) ڈمی سائز۔ چندہ سالانہ ایک روپیہ ۸ اعلیٰ ایڈیشن عہ/۸۔

پتہ:۔ قرول باغ دہلی۔

مسیح الملک ماہوار طبی رسالہ ہے جو جامعہ طبیہ دہلی کے ترجمان کی حیثیت سے زیر ادارت حکیم مظہر الدین صاحب اجملی سابق ہاؤس فزیشین جامعہ طبیہ شائع ہو رہا ہے حکیم محمد طاہر صاحب تسلیم حیدرآبادی اس کے نائب مدیر ہیں۔ زیر نظر رسالہ پہلی جلد کا پانچواں نمبر ہے۔ اس رسالہ کے اجرا کا مقصد جیسا کہ اغراض و مقاصد میں بتایا گیا ہے یہ ہے کہ:۔ "اطباء میں عروج و ارتقا کا جذبہ ملی پیدا کیا جائے اور ان کے سکون و جمود کو اضطراب و بیقراری سے تبدیل کر دیا جائے۔" اس میں جدید و قدیم طب کے مختلف فیہ مسائل پر نتیجہ خیز مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ اس میں اطباء کے لئے امراض کی تحقیقات اور ان کے معالجات وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کی دلچسپی کے لئے سہل اور عام فہم طبی مسائل کے علاوہ حفظان صحت کے متعلق جدید اور اہم امور کے بیان کئے جانے کا بھی اہتمام ہے اس لئے یہ رسالہ اطباء اور عوام دونوں کے لئے مفید ہے۔ کتابت طباعت بھی اچھی ہوتی ہے اور ان خوبیوں کے مقابلہ میں چندہ نہایت قلیل ہے۔

ع ۔ ر

رسید کتب

۱۔ **رسول پاک**: عبد الواحد صاحب سندھی ۸/

۲۔ **دنیا کی کہانی**: پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن عہ/

۳۔ **تاریخ ہند کی تمہید**: " " (قیمت ۶)

۴۔ **ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر** غلام یزدانی صاحب (قیمت ۶)

۵۔ **مضامین محمد علی**: مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب عہ/

۶۔ **گئودان**: ناول، منشی پریم چند [illegible] ۸/

۷۔ **قتیل اور غالب**: سید اسد علی انوری فرید آبادی ۸/

۸۔ **[illegible]**: ترجمہ معین الدین صاحب انصاری عہ/

۹۔ **سیاسیات کی پہلی کتاب**: پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے ۱۲/

۱۰۔ **اجتماعی زندگی کی ابتدا** " " " " ۸/

۱۱۔ **روح تمدن**: ترجمہ ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب قادری زور عہ/

۱۲۔ **تاریخ گولکنڈہ**: پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی عہ/

(نوٹ: نمبر ۱ تا ۱۰ مکتبہ جامعہ دہلی سے نمبر ۱۱، ۱۲ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں)

بزم طیلسانین

اراکین انجمن سے

چونکہ ارکان انجمن کے ذمہ چندہ رکنیت کا بقایا ہوگیا ہے اور اس کی ادائی میں دقت پیش آتی ہے اس لئے انجمن کے جلسہ عام کاروباری منعقدہ ۲۵ خورداد ۱۳۴۱ف نے طے کیا ہے کہ ارکان انجمن اپنے ذمہ کا بقایا بسہولت ادا فرماسکتے ہیں۔ اس سال وہ جو چندہ ادا فرمائینگے اولاً سال حال کی بابت جمع کرلیا جائیگا۔ سال ہائے گذشتہ کی بابت بقایا آہستہ آہستہ ادا فرمایا جاسکتا ہے۔ سال حال کا چندہ جمع ہو جائے تو بقایا کی وجہ کوئی رکن رائے دہی اور انجمن کے دوسرے کاروبار میں حصہ لینے سے محروم نہ کردیا جائیگا۔

انجمن کے اسی جلسہ نے یہ بھی طے پایا ہے کہ ارکان انجمن کے چندہ میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ عمل میں لایا جائے اور "مجلہ" ان کی خدمت میں بلا کسی مزید چندہ کے روانہ کیا جائے۔ "مجلہ" کی حیثیت انجمن کے آرگن کی ہے اس کو مستحکم بنیاد پر قائم کیا جائے تو انجمن کا اثر مزید وسعت حاصل کرسکیگا۔

مکتبۂ طیلسانین کے قیام کی ضرورت

فرزندان جامعہ عثمانیہ کی علمی و ادبی فتوحات، کی انجمن طیلسانین عثمانیہ کی ہر سالانہ کانفرنس کے موقع پر نمائش کی گئی جس سے ملک کے نونہالوں کا ایک خوش آیند اثر مترتب ہوا علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں عثمانیین کی جماعت نے اپنی ذہنی کاوش سے اضافہ نہ کیا ہو جو کتابیں طبع ہوچکی ہیں ان کی نکاسی کی اب تک صرف انفرادی کوششیں کی گئی ہیں جن سے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ اور بہت سے علمی کارنامے اس وجہ سے کہ خود مصنفین مولفین اور مترجمین وغیرہ کے لئے ایسے ذرائع حاصل نہیں ہیں کہ اپنی تصنیفات اور تالیفات و تراجم کو منظر عام پر لاسکیں، ابھی زیور طبع سے آراستہ ہی نہیں ہوئے ہیں۔

ایک طرف تو شایع شدہ کتابوں کی نکاسی کی صورتیں پیدا کرنے اور دوسری طرف مسودات وغیرہ کو شایع کرکے ان کو منظر عام پر لانے کے لیے محسوس کیا جاتا ہے کہ ایک باقاعدہ تنظیم کی شدید ضرورت ہے، بلکہ ممکن ہے کہ "مکتبۂ طیلسانئین" کے نام سے ایک ادارہ کے قیام سے پوری ہوسکے جو مجلۂ طیلسانئین کے تحت قائم کیا جائے اور جو مذکورۂ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرزندان جامعہ عثمانیہ کے علمی کارناموں کی اشاعت کا کام انجام دے۔

ہم بہت ممنون ہوں گے اگر برادران طیلسانئین اس بارے میں اپنی قیمتی رائے سے جلد از جلد مہتمم مجلہ کو مطلع فرماویں تاکہ اس سلسلہ میں ضروری امور پر غور کیا جاسکے۔

مترجمین کی ضرورت

سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی میں جملہ مضامین مثلاً تاریخ (ہند، انگلستان، یورپ، یونان، روما، اسلام)، جغرافیہ، سیاسیات، دستور انگلستان، معاشیات، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات، منطق، مابعد الطبیعات، اخلاقیات، قانون، ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، نباتیات، حیوانیات، طب اور انجینیری وغیرہ کے متعلق مستند مترجمین کی فہرستیں مرتب اور موجود ہیں تاکہ جب ضرورت پیش آئے ان سے بطریق اجرت کام کا مناسب انتظام ہو۔ مترجمین کی علمی اسناد کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے انتخاب میں سابقہ کام یا نمونہ کا کام جو پیش ہے وہ بھی ملحوظ رہتا ہے۔

جو طیلسانئین اس قسم کا کام کرنے آمادہ ہوں ان کے نام مع پتے اور ضروری صراحت علمی قابلیت وغیرہ کے دفتر انجمن طیلسانئین عثمانیہ پر روانہ فرمائے جائیں تاکہ ان کی نسبت سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں سفارش کی جاسکے۔

محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) رکن انجمن کا مقالہ موضوع "دیہلی کی معاشی تحقیق" جو مادر جامعہ کی ایم اے کی ڈگری کے لیے پیش ہو کر منظور ہوا ہے، اس شمارہ سے بالاقساط شایع کیا جا رہا ہے موصوف جامعہ عثمانیہ کے ممتاز اور قابل ترین سپوتوں میں سے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے ہر امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی بسلسلہ ۱۳۴۴ف میں موضوع "پٹنہ کی معاشی تحقیق" پر آپ کو جامعہ کی جانب سے میکنزی پرائز عطا ہوا تھا۔

آپ کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں جائیداد لکچرار معاشیات پر عمل میں آیا ہے۔ ہم موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی ۲۶ سال قبل بنیاد رکھی گئی اور دنیا کے دوسرے بڑے کاموں کی طرح اس کا آغاز بھی عجز و انکسار کے ساتھ شروع ہوا تھا لیکن اخلاص اور مسلسل کوشش ہی کی بدولت کانفرنس نے حقیقی خدمت ملک کے ایسے روایات قائم کردئے جو کسی نہ کسی امتیاز کے موجب ہوسکتے ہیں۔ کانفرنس کو ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے خدمت کا عام احساس پیدا کرنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اس نے ایک طرف تعلیمی معاملات میں بلند نظری کے ساتھ رائے عامہ پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف (۵۰۰) مستحق اور ہونہار طلبہ کی امداد و اعانت میں (۸۰) ہزار روپیے صرف کئے جس کی بدولت غیر معمولی ذہین مگر تہیدست نوجوان میدان علم میں بلندی پر پہنچ سکے۔ ملک بھر میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کو یہ عزت نصیب ہوئی ہے کہ اس کی مالی اعانت سے ملک میں اس قدر کم مدت میں ایسے قابل اور صاحب کمال افراد پیدا ہوسکے ہوں اس وقت ماہانہ دو سو روپیے اس کام میں صرف ہو رہے ہیں۔

اب اس امر کا عام طور سے احساس بڑھتا جارہا ہے کہ کانفرنس رائے عامہ کی صحیح تشکیل اور اعانت طلبہ کے علاوہ دوسرے ضروری امور کو بھی اپنے دائرہ عمل میں شامل کرے مثلاً تعلیم بالغان اور اضلاع و تعلقات میں مطالعہ گھر اور کتب خانوں کے قیام کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

کانفرنس کا موجودہ سرمایہ کام کو پھیلانے میں مانع ہے۔ کانفرنس کی یہ خواہش ضرور ہے کہ دولتمند ارباب خیر کا دست کرم کافی عطیوں کے ساتھ آگے بڑھے لیکن ساتھ ہی اگر کانفرنس کی رکنیت بڑھتی جائے تو اس کی فائدہ رسانی کو کافی طور سے وسعت حاصل ہوگی۔

کانفرنس کی رکنیت کا سالانہ چندہ اس قدر قلیل ہے کہ اس کو ادا کرکے ہر شخص ملک کی تعلیمی خدمت کے فرض سے ایک گونہ سبکدوش ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص صرف تین روپیے سالانہ سے کوئی ایسا

کام نہیں انجام دے سکتا جو نمایاں ہو سکے۔ برخلاف اس کے اگر ایک ہزار اصحاب سال بسال یہ چندہ ادا فرمائیں تو کانفرنس کے کاروبار میں بہت وسعت حاصل کرینگے بلکہ ان میں کافی استحکام پیدا ہو جائیگا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کا بارھواں سالانہ اجلاس بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں بتواریخ ۲۱ و ۲۲ آبان ۱۳۴۹ف مطابق ۱۳ و ۱۴ شعبان ۱۳۵۹ھ روز چہارشنبہ و پنجشنبہ تعطیلات انت چتور دشی اور شب برات میں بہ صدارت جناب ڈاکٹر نواب ناظر یار جنگ بہادر ایم۔ اے۔ ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لا منعقد ہوگا۔

کانفرنس کو حسب قانون کمپنی ہائے سرمایہ مشترکہ سرکار عالی رجسٹر کرا دیا گیا ہے۔

اس غرض سے قدیم ضابطۂ کانفرنس کو از سر نو ڈھالا گیا ہے۔ جدید ضابطہ کی رو سے آیندہ ارکان کانفرنس کو معاملات کانفرنس میں زیادہ اثر حاصل ہوگا۔

کانفرنس کا چندہ رکنیت یا تو دوامی ایک سو روپیہ ہے یا صرف تین روپیہ سالانہ

امید ہے کہ علم دوست حضرات کانفرنس کی رکنیت قبول فرما کر ممنون اور اپنے حلقۂ اثر میں بھی توسیع ارکان کے لئے کافی کوشش فرما کر مزید ممنونیت کا موقع مرحمت فرمائینگے۔

دنیا کے ہر حصہ میں بہبودی کے لئے اس وقت عظیم ہلچل اور کشمکش جاری ہے۔ عہد حاضر میں انفرادی کوششوں سے بڑھ کر اجتماعی سعی و کوشش کو کامیابی کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر سچا حیدرآبادی محب وطن منظم اور پر خلوص کوششوں میں اپنی اعانت و امداد کا پورا حق ادا کرے۔

کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اضلاع و تعلقات سے شریک ہونے والے اصحاب کے لئے نظام ریلوے نے کرایہ ریل میں رعایت کافی منظور کی ہے۔ درجہ اول و دوم میں سفر کرنے کے لئے صرف ایک طرفہ کرایہ ادا کرنا پڑے گا اور درجہ سوم میں $\frac{1}{2}$ کرایہ بشرطیکہ پورے کرایہ کی مقدار دو روپیہ بارہ آنے ہو۔ اس کے علاوہ سرکار عالی نے اس امر کی منظوری صادر فرمائی ہے کہ ملازمین سرکار اگر اضلاع سے شریک کانفرنس ہونے کے لئے بلدہ آئیں تو زاید از حساب دو روز کی رخصت اتفاقی دی جائے۔ تفصیلات معتمد سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

سکرٹری محمد مظہر

صنعتی و تجارتی ڈائرکٹری

دوسری صنعتی نمائش

معاشی کمیٹی انجمن طیلسانیین عثمانیہ حیدرآباد جس نے ماہ آذر ۱۳۴۸ف میں مصنوعات ملکی کی شاندار نمائش کا انعقاد کرکے ملک میں کافی تعارف حاصل کرلیا ہے ایک نہایت جامع اور مفید صنعتی اور تجارتی ڈائرکٹری شایع کررہی ہے۔ یہ ڈائرکٹری صرف نمائش کی حد تک محدود نہ ہوگی بلکہ اس میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی قدیم وجدید گھریلو اور اعلیٰ پیمانہ کی صنعتوں کی کیفیت پیش کیجائیگی اور ان صنعتوں کو اہل ملک اور دیگر ممالک کے افراد سے روشناس کیا جائیگا اور حیدرآباد کی عام صنعتی ترقی کے امکانات اور ان کے ممکنہ وسائل پر فنی لحاظ سے بحث کیجائیگی۔

ڈائرکٹری کے خاص ابواب پارچہ بافی۔ فلزاتی و چوبی صنعتیں۔ انجنیرنگ۔ ہینڈ و الکٹرک۔ ذرائع نقل و حمل۔ شکر۔ سیمنٹ۔ کوئلہ۔ طلا۔ لوہا و فولاد۔ کاغذ۔ چمڑا۔ سلکریٹ۔ دیاسلائی۔ روغنیات۔ کیمیکلز اور دیگر گھریلو صنعتوں پر مشتمل ہوں گے۔ عام صنعتی واقفیت کے لئے سرکاری محکمہ جات یعنی محکمہ صنعت و حرفت، ریلوے روڈ ٹرانسپورٹ، محکمہ زراعت، محکمہ تعمیرات، محکمہ معدنیات، محکمہ دیہی ترقیات، محکمہ امداد باہمی، محکمہ صنعتی تعلیم، محکمہ اعداد و شمار و محکمہ کروڑگیری وغیرہ کے نظم و نسق اور کارگذاری کی مفصل بیانات کیجائیگی اور ان محکمہ جات سے متعلق احکام و قوانین کے ضروری اقتباسات بطور ضمیمہ شامل کئے جائیںگے۔

شہر حیدرآباد و سکندرآباد اور اضلاع سرکار عالی کے ایسے اہل حرفہ، دستکار، صناع، گماشتہ دار، تاجر، معمار، نقاش و مصور وغیرہ کے نام و پتے ترتیب وار درج کئے جائیںگے جو باداء فیس مندرجہ نرخ نامہ ضروری ہدایات کی تکمیل کریں۔

دوسری صنعتی نمائش جو ماہ بہمن ۱۳۴۹ف مطابق ماہ ڈسمبر ۱۹۳۹ء میں حیدرآباد میں

منعقد ہونے والی ہے اس کے متعلق بھی ضروری معلومات اس ڈائرکٹری میں شریک کئے جائیں گے۔

ڈائرکٹری مذکور کے مضامین و تصاویر وغیرہ کی ایک تفصیلی فہرست علحدہ طور پر شایع کی گئی ہے جس کے ملاحظہ سے چھ سو صفحے کی اس کتاب کی وسعت اور جامعیت کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا۔

پراسپکٹس

مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی حیدرآباد امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

مجوزہ سرمایہ (۲۵۰۰۰) پچیس ہزار روپیے سکہ عثمانیہ، جو دس روپیے کے (۲۵۰۰) حصص پر مشتمل ہوگا۔ حصص کی ادائی حسب ذیل طریقہ پر ہوگی :-

(۱) درخواست کے ساتھ مبلغ دو روپیے آٹھ آنہ فی حصہ۔

(۲) درخواست منظور ہونے پر " " " " "

(۳) پہلا مطالبہ " " " " "

(۴) دوسرا مطالبہ " " " " "

مجلس نظماء

(۱) مولوی محمد فاروق صاحب بی اے ۔ ایچ سی ایس ۔ مددگار ربلدیہ ۔ میر مجلس

(۲) پنڈت پریم جی لال جی صاحب . . . . نائب میر مجلس

(۳) مولوی محمد علی صاحب بی ایس سی ۔ ایم اے (عثمانیہ) . . . . . معتمد

(۴) مولوی محمد علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) نائب معتمد

(۵) مولوی تجمل حسین صاحب ایم ایس سی رکن

(۶) مولوی محمد یعقوب صاحب مالک روز بسکٹ فیکٹری "

(۷) نواب میر اکبر علی خاں صاحب بی اے ال ال بی بیرسٹر ایٹ لا "

(۸) مولوی میر محمود علی صاحب ایم اے لکچرار نظام کالج و صدر معاشی کمیٹی رکن (بحیثیت عہدہ)

(۹) مولوی شرف الدین صاحب بی اے (عثمانیہ) معتمد معاشی کمیٹی رکن (" ")

(۱۰) مولوی مشتاق احمد خاں صاحب مددگار محکمہ ریلوے رکن

(۱۱) ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی ایم اے پروفیسر جامعہ عثمانیہ رکن

بنکرس

(۱) مملکتی بنک امداد باہمی محدود حیدرآباد (۲) سنٹرل بنک آف انڈیا حیدرآباد

مشیر قانونی: مولوی سید محمد احسن صاحب بی اے ال ال بی وکیل ہائیکورٹ

رجسٹری شدہ پتہ:- عابد روڈ حیدرآباد دکن

وجوہ قیام

کسی ملک کی حقیقی ترقی اور خوش حالی اس کے معاشی استحکام پر منحصر ہے اور ملک کی معاشی بہتری اس کی صنعتی ترقی پر اس لئے صنعتی ترقی کے حصول کے ذرائع اور مسائل پر غور کرنا اور انھیں بروئے عمل لانا ملک کے ہر فرد اور ہر جماعت کا فرض اولین ہے۔ یہ واضح رہے کہ ملکی صنعتوں کو ترقی دینے سے اولاً ملک کی دولت ملک ہی میں رہیگی ثانیاً ملک کے افراد کے لئے روزگار مہیا ہو جائیگا، اور ثالثاً مال برآمد کرنے کی صورت میں ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ ہوگا۔

انجمن طیلسانئین عثمانیہ نے ملک کی اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معاشی کمیٹی حیدرآباد کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام مصنوعات ملکی کی ایک عظیم الشان نمائش باغ عامہ میں منعقد کیگئی تھی جس کی یاد ہنوز اہل وطن کے دلوں میں تازہ ہے۔ اس نمائش کے انعقاد کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ملک میں کئی مفید چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ایسی ہیں جن سے اہل ملک ناواقف ہیں۔ نیز ملک میں معدنی ذخائر

اور خام پیداوار کی کثرت ہونے کے باوجود یہاں اکثر صنعتوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ موجودہ مصنوعات کی ترقی اور جدید صنعتوں کو قائم کرنے میں چند رکاوٹیں ہیں مثلاً فن تشہیر اور اس کے فوائد سے ناواقفیت، نکاسی کے ذرائع کی عدم موجودگی، سرمایہ وغیرہ اور ملکی احساس کی کمی۔

چنانچہ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاشی کمیٹی حیدرآباد نے امداد باہمی کے اصول پر ایک ادارہ "مرکز مصنوعات ملکی معاشی کمیٹی امداد باہمی محدود" کے نام سے قائم کیا ہے جس کی جسٹری محکمہ نشان (۱۰۷۳۹) امداد باہمی سرکار عالی عمل میں آچکی ہے اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:-

(۱) ملکی مصنوعات کی ترقی اور اس کے استعمال کے انفرادی اور اجتماعی فوائد کا پرچار کرنا۔

(۲) ملکی مصنوعات کو مقبول بنانے کے لئے مرکزی طور پر تشہیر کے لئے جدوجہد کرنا

(۳) ملکی مصنوعات کی فروخت کے لئے ایک دوکان کا قیام عمل میں لانا اور مقرر کرنے والے فروخت کنندوں کا تقرر کرنا۔

(۴) مصنوعات کی نمائش کے لئے مستقل نمائش گاہ کا قیام عمل میں لانا

(۵) قابل امداد صناعوں کو سرمایہ فراہم کرنا

پراسپکٹس اور درخواست کے نمونے ذیل کے مقامات سے حاصل کئے جاسکتے اور تفصیلاً معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ مرکز مصنوعات ملکی معظم جاہی مارکٹ (۱) حیدرآباد دکن

۲۔ دفتر معاشی کمیٹی (انجمن طیلسانئین عثمانیہ) مصطفےٰ بازار عابد روڈ، حیدرآباد دکن

مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ